

مجلس مشاورت

★ زر سالانہ ہندوپاک سے آٹھ روپے خاص نمبر سمیت
★ ششماہی چار روپے
★ پتہ ترسیل زر:- عابد علی خاں روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن

جلد ۲ شمارہ ۲ تا ۴
فروری تا اپریل سنہ ۱۹۵۶ء خاص نمبر
قیمت:- دو روپے

صبا

منظورہ محکمہ تعلیمات حکومت حیدرآباد دکن
فون نمبر [illegible]
پرنٹر و پبلشر:- سلیمان اریب۔ رفیق مشین پریس [illegible] حیدرآباد دکن

اس شمارے میں

کہانیاں

منظومات

ڈرامہ

مزاح

خطوط

پہلی بات

ہمیں شرمندگی ہے کہ صبا کے خاص نمبر کے لیے ہمارے پڑھنے والوں کو بہت دنوں تک انتظار کرنا پڑا۔ اتنی تاخیر اکثر ادبی رسالوں کے لیے کوئی انوکھی بات نہیں، بظاہر یہ ایک گناہ نہیں جو اس شہر میں کسی اور نے نہ کیا ہو لیکن اس کے باوجود ہم شرمسار ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ ہمارا پہلا اور آخری گناہ ہوگا۔ ہم نے ان دشواریوں کے باوجود یہ کوشش کی ہے کہ خاص نمبر کو جاذب نظر بنائیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ذوق کی تسکین کا سامان بہم کریں۔ ہم پہلے ہی آپ کو بتانا نہیں چاہتے لیکن اتنا ضرور عرض کرنا ہے کہ حیدرآباد کا ایک ادبی رسالہ اس سے بہتر خاص نمبر پیش نہیں کر سکتا تھا

خاص نمبر کے لیے چونکہ ہمیں بہت سے مضامین نظم و نثر موصول ہوئے تھے لیکن ظاہر ہے کہ ہم ان سب چیزوں کو اس خاص نمبر میں نہیں دے سکتے تھے کچھ تو تاخیر سے موصول ہونے کی وجہ سے اور کچھ عدم گنجائش کی وجہ سے لہٰذا ادارۂ صبا نے یہ طے کیا، آئندہ نمبر بھی اتنا ہی یا اس سے کچھ کم صفحات کو محیط نکالا جائے۔ آئندہ نمبر کے لکھنے والوں کے نام اندر کہیں آپ کی نظر سے گزریں گے

پچھلے چند دن ہندوستان کی تاریخ کے اہم دن تھے۔ ہمارے ملک کی تہذیبی زندگی میں نئی اور خوش آئند تبدیلیاں عمل میں آئیں، لسانی ریاستوں کے دیرینہ مطالبہ کی تکمیل ہو رہی ہے اور چند ہی مہینوں میں ہندوستان کا نقشہ بالکل بدل جائے گا۔ نئی ریاستیں بنیں گی اور بہت سے پرانے نام ماضی کی یادگار بن جائیں گے، ہر دیس میں اس دیس کی زبان کا سکہ چلے گا اور لوگ اپنی زبانوں میں اپنی تعلیم و تہذیب کے کاروبار انجام دیں گے۔ تو اس تبدیلی کا ایک خوشگوار پہلو ہے لیکن اردو بولنے اور اردو سے محبت کرنے والوں کے لیے نئے مسائل اور نئے سوالات ابھر رہے ہیں۔ ہر زبان کی ایک ریاست رہے گی لیکن اردو جو ہندوستان میں تقریباً ہر جگہ سمجھی اور بولی جاتی ہے اور کئی کروڑ لوگوں کی مادری زبان ہے آج ایک سوالیہ نشان بن کر ابھر رہی ہے۔ اس کی آوارگی ختم ہو اس کی زندگی کا اور اس کی بقا کا سامان بن جائے یہ بھی ممکن ہے ——— قیس کا گھر کہاں، پورا نجد اس کا مکان ہے لیکن اہل دیرستوں کی اس محفل میں جہاں ہر بات کے لیے دستور کی ایک دفعہ کا حوالہ ضروری ہے کچھ دن تو اس جنوں زدہ پھرتے گزریں گے اور ایک مدت کے لیے ——— ہو سکتا ہے کہ یہ مدت مختصر ہی ہو یہ زبان اپنے ہی دیس میں اجنبی نظر آئے۔ کہیں وہ دشواری تو نہ پیدا ہو جائے جس کا درد ایک تحریر میں غالب کو ہوا تھا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

بہرحال ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ مایوسی گناہ ہے اور یاس موت۔ لیکن صرف مطمئن ہو جانے سے اور مستقبل پر بھرپور اعتماد سے اس زبان کی زندگی اور بقا کا مسئلہ حل نہیں ہوگا ——— برے دن ہمیشہ نہیں رہیں گے، سیاہ بادل چھٹیں گے، سورج پھر چمکے گا یہ سب صحیح اور برحق، لیکن اس کا بھی تو امکان ہے کہ اندھیرے کی عمر طویل ہو جائے اور بادل کے چھٹنے سے پہلے رات آجائے اور صبح دیر سے طلوع ہو ——— ان خطرناک امکانات کا ذکر کرنے سے ہمارا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ مایوسی کو عام کریں، ہم صرف اردو سے محبت کرنے والوں سے یہ بات عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس اندھیرے کو دور کرنا ہے تو انہیں پہلے سے زیادہ مستعد اور پرجوش ہو کر عمل کے لیے تیار ہونا ہے۔ اس یاس اور مایوسی کی فضا میں اردو کے بہی خواہوں کی کوششیں امید کی کرن بن کر چمک

جاتی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ یہی کرن ایک دن آفتاب بن جائے گی۔ حیدرآباد نے ہمیشہ اردو کی حفاظت کی ہے۔ کبھی صحیح طریقہ سے اور کبھی غلط طریقہ سے۔ لیکن ۱۹۴۸ء کے بعد یہاں کے اردو بولنے والوں نے بدلے ہوئے حالات کا صحیح اندازہ کرلیا اور جمہوری طریقے اور جمہوری انداز سے اردو کی حفاظت کے ذرائع سوچنے لگے۔ آج سے دو سال پہلے ہمارے شہر میں ایک بڑی اردو کانفرنس ہوئی تھی اور اب پھر ایک بار اردو کے اس پرانے شہر میں اردو کانفرنس ہو رہی ہے اور ہمیں توقع ہے کہ یہ کانفرنس اردو کے مسائل پر سنجیدہ اور معقول طریقے سے غور کرے گی اور ایک ایسے راستہ کی نشاندہی کرے گی جس پر چل کر ہم اردو کے مستقبل کی ضمانت حاصل کرسکیں گے

اس ضمن میں اردو کے ادیبوں اور لکھنے والوں پر بھی بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ یہ بات بڑی المناک ہے کہ اس نازک زمانہ میں اردو کے ادیبوں کی کوئی موثر اور کل ہند تنظیم نہیں ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین ایک عرصہ سے غیر فعال ہے۔ اس انجمن نے پچھلے بیس سال کے دوران میں ادیبوں کو بیدار کرنے میں اور انھیں سماج اور زندگی کے ہر لحظہ بدلنے والوں تقاضوں سے آگاہی عطا کرنے میں بڑا اہم کام انجام دیا لیکن جب اس کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے، یہ انجمن آرام کر رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس انجمن نے بڑی بڑی غلطیاں کی ہوں۔ اور راہبری کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی گمراہ بھی کیا ہو۔ اس صداقت کے اعتراف کے ساتھ ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ غلطی وہی لوگ کرتے ہیں جو مسلسل کام کرتے ہیں۔ اس کی پچھلی غلطیاں اس کے عمل کا نتیجہ تھیں اور آج اس انجمن کی سب سے بڑی غلطی اور سب سے بڑا جرم اس کی بے عملی ہے۔ زبان کے سب سے بڑے محافظ اس کے ادیب اور لکھنے والے ہوتے ہیں یہ دوستانی نہیں بلکہ ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ہر شخص زبان کی حفاظت کے لیے پریشان ہے لیکن زبان کی ترقی کا اصل کام رکا رکا سا نظر آتا ہے۔ اس موقع پر باشعور ادیبوں اور لکھنے والوں کو آگے آنا چاہئے اور اپنی تنظیم کے ذریعہ زبان و ادب کی حفاظت کے سوالات کو حقیقی انداز میں حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ صرف ادیب اور لکھنے والے ہی حقیقی طریقہ سے ان مسائل پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ ہمارے ادیبوں اور نقادوں نے بارہا اعلان کیا کہ ادب کا کام زندگی کی عکاسی ہی نہیں بلکہ زندگی کی رہنمائی بھی کرنا ہے۔ لیکن آج جب رہنمائی کا وقت آرہا ہے تو صورت حال یہ ہے کہ ناخدا سو رہے ہیں

ہماری تجویز یہ ہے کہ جلد از جلد اردو کے تمام لکھنے والوں کا جنھیں زبان و ادب کے مسائل سے دلچسپی ہے ایک اجتماع طلب کیا جائے اور ادیبوں کی ایک مرکزی تنظیم کے بارے میں غور و فکر کیا جائے۔ ہماری یہ رائے ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کو جس کا ایک شاندار ماضی رہا ہے اور جس کے ساتھ جدوجہد عمل اور تخلیق کی روایات وابستہ رہی ہیں، پھر سے زندہ اور متحرک کیا جائے ہمارے بعض ایسے دوست بھی ہوسکتے ہیں جنھیں اس رائے سے اختلاف ہو، لیکن اس مسئلے کے بارے میں سوچنے کے لیے اس سے زیادہ موزوں وقت نہیں مل سکتا۔ ابھی بہت وقت گذر چکا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم، محو بانگ جرس کارواں ہی رہیں اور منزل بہت آگے نکل جائے

خاص نمبر کے خوبصورت ٹائٹل کے لیے ہم اپنے نوجوان آرٹسٹ دوست مسٹر اسماعیل کے ممنون ہیں

کیسی بہار ہم سے اسیروں کو منع ہے
چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا

(میرؔ)

دو چراغ اور بجھے ......

صبا کے گزشتہ اور موجودہ شمارے کی اشاعت کے درمیان قاضی عبد الغفار اور میرزا یاس یگانہ بچھڑ گئے۔ اردو ادب کے قافلہ کے دو ممتاز مسافر دو قافلہ سالار ان دونوں حضرات کا چونکہ حیدرآباد سے [illegible] تعلق رہا ہے اس لیئے اہل حیدرآباد کے لیئے ان کی جدائی غیر معمولی طور پر تکلیف دہ ہے۔ اور ہم اپنے تمام ملک کے ادبی نقصان کے ساتھ ساتھ "اپنا" بڑا نقصان بھی محسوس کر رہے ہیں۔

قاضی عبد الغفار

قاضی عبد الغفار کی زندگی واقعی قابل رشک اور حیرت انگیز تھی۔ سیاست، صحافت، ادب اور تہذیب و تمدن کا وہ مثالی پیکر تھے۔ اتنی چیزیں اتنی بہات اتنے سلیقے اور اتنی شگفتگی کے ساتھ بہت کم کسی ایک شخصیت میں جمع ہوئی ہیں۔ خلافت کی تحریک میں انہوں نے حصہ لیا۔ مولانا محمد علی کے وہ اولیں صحافتی معاون تھے اور پھر پیام کے ذریعہ حیدرآباد میں ان صحافتی روایات کی بنا ڈالی جو کم از کم حیدرآباد کے لئے نئی تھیں۔ علمی، ادبی اور تحقیقاتی طور پر ان کی تصانیف جن میں سفرنامہ یورپ، لیلیٰ کے خطوط، مجنوں کی ڈائری، حیات اجمل، آثار ابو الکلام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اردو کا بہترین سرمایہ ہیں۔

آخر عمر میں قاضی صاحب نے انجمن ترقی اردو کے کام کو سنبھال کر اردو کے تحفظ اور اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کی روک تھام کے لیئے علالت اور کمزوری کے باوجود جو جد و جہد کی وہ قابل قدر ہی نہیں بلکہ قابل فخر اور قابل تقلید بھی ہے اور پرستاران اردو اس کو ہمیشہ احترام کے ساتھ یاد رکھیں گے۔

قاضی صاحب اگرچہ قدیم ادب کے ماحول میں پلے بڑھے تھے اور اسی کے علمبردار بھی تھے لیکن اپنی دور بینی اور روشن خیالی کے سبب وہ نئے ادب سے بھی بے حد قریب آگئے تھے وہ قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک مضبوط رشتہ اتصال تھے۔ اسی لیئے ان کی موت کو سب ادیبوں نے محسوس کیا۔

میرزا یاس یگانہ

میرزا یاس یگانہ اردو زبان کے ان چند ذہین شاعروں میں ایک تھے جن کے لیے ذہانت ایک "مسئلہ" بن جاتی ہے وہ اپنی روشنی طبع کے ہاتھوں تباہ ہوئے۔ ان کی عالم شکنی اسی روشنی کا ایک غلط استعمال تھی۔ ان کی غلطیاں ان کی معصومیت کا نتیجہ تھیں اور ان کی اصول پرستی بھی ان کی اسی شاعرانہ معصومیت کا ایک دلچسپ مظہر۔ وہ غزل کے استاد تھے اور اپنا منفرد مقام رکھتے تھے۔ ان کے ایسے شعر ہمیشہ زندہ رہیں گے ؎

صد رنگ و صد بہار پر شکستہ و دل تنگ ؛ داد رائمی رسد بال دیر بحق تنہا

مجنوں گورکھپوری

نیاز فتحپوری

ہندوستان کی پہلی پرخلوص مگر بدانجام سعیِ آزادی جس کو آج تک انگریزوں کے دیے ہوئے نام سے یاد کیا جاتا ہے یعنی جس کے لیے "غدر" یا "بدعملی" کے شرمناک لفظ کے سوا ہمارے بزعمِ خود آزاد ملک کے ذہن میں کوئی دوسری اصطلاح ابھی تک نہیں آئی۔ ایک ایسا تاریخی تجربہ تھا جس نے کئی اعتبار سے اور کئی سمتوں میں ہماری آنکھیں کھول دیں۔ اور ہم کو یہ احساس دلا دیا کہ ہم کس قابل ہیں اور دراصل کسی قابل ہونے کے لیے ابھی ہم کو کیا کرنا ہے اور کن آزمائشوں سے گزرنا ہے۔ ہم کو اپنی اصلی حالت کا اندازہ ہو گیا اور اپنی توانائیوں کی نارسائی اور اپنی طاقتوں کی بے اثری کو ہم نے ایک شدید کسک کے ساتھ محسوس کرنا شروع کیا اور یہ احساس روز بروز زندگی کے ہر شعبہ میں جڑ پکڑتا گیا۔ ہر طرف ہم کو انتہائی ترمیم اور اصلاح کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ ہم کو یقین ہو گیا کہ جب تک ہمارا پرانا نظامِ معاشرت اپنے تمام شعبوں اور اداروں کے ساتھ نئے زمانہ کے مطابق بدل نہیں جائے گا اس وقت تک آزادی اور ترقی کی ساری جدوجہد ایک خوابِ بے تعبیر سے زیادہ وقیع نہ ہو گی۔

یہ حق ناشناسی ہوگی اگر ہم یہ سمجھیں کہ ہمارے اندر یہ نیا شعور جگانے میں ہمارے برطانوی آقاؤں کا کوئی حصہ نہ تھا جنھوں نے ہم کو غلام بنائے رہنے کے لیے یہ بھی ضروری سمجھا کہ ہمیں انگریزی زبان سے بخوبی واقف کریں اور اس زبان کے ذریعہ تمام مغربی افکار و آرا سے خبردار رکھیں۔ ہمارا یہ نیا شعور جس کو بیک وقت غلامی اور آزادی کا شعور کہنا چاہیے بہت تیز اور بلا کی شدت کے ساتھ ہمارے اندر کام کرنے لگا اور اس کا اثر ہر سمت اور ہر ادارے میں سرعت کے ساتھ سرایت کرنے لگا۔

سوامی دیانند اور سرسید کی اصلاحی تحریکیں اسی نئے شعور کی نمائش تھیں۔ اور ان میں سے ایک تحریک بھی ایسی نہیں تھی جو یہ دعویٰ کر سکے کہ برطانوی تمدن کے ہاتھ بڑھا کر دی ہوئی برکتوں سے بے نیاز رہی ہو۔

جہاں تک اردو زبان اور ادب کی اصلاح اور ترقی کا تعلق ہے یہ سب جانتے ہیں اور ہم کو ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعتراف کرنا ہے کہ اس کا واسطہ براہِ راست تحریکِ سرسید سے تھا۔ جس کا دوسرا نام تحریکِ علی گڑھ ہے۔

سرسید تک آتے آتے اردو زبان و ادب کو ایک نیا موڑ لینا تھا اور ایک نئی روش اختیار کرنی تھی۔ بہر حال اردو زبان اور اردو شعر و نثر کا نشاۃ الثانیہ سرسید کی معاشرتی تحریک کا ایک جزو لاینفک ہے۔ اس تحریک سے ایک نہایت مختصر مدت کے اندر اردو نثر اور شاعری میں نئے عنوان اور نئے اسلوب کے اتنے کثیر نمونے وجود میں آ گئے کہ ہم حیرت کے ساتھ یہ سوچنے لگے کہ ابھی کل تک ہماری زبان کس قدر تنگ دامن اور کم مایہ تھی اور آج اس کا دامن کتنا وسیع نظر آ رہا ہے جو طرح طرح کے نئے اچھے جواہر پاروں سے بھرا ہوا ہے۔ ہم کو امید بندھ گئی کہ ہماری زبان کا مستقبل بہت درخشاں ہے اور اس کے لیے نئی نئی ترقیوں کے امکانات لامحدود ہیں۔ اور ہماری یہ امید بہت جلد پوری ہوگی۔

سرسید سے لے کر شبلی تک کوئی بڑی مدت نہیں ہے لیکن اس عرصے کے اندر نظم و نثر کے کتنے جیسے نئے ذخیرے [illegible] خصوصیت کے ساتھ نثر کے شعبہ میں مختلف موضوعات و مسائل پر نئے اصول اور نئے اسالیب کے ساتھ جتنی کتابیں حالی، [illegible] آزاد، شبلی اور سرسید کے دوسرے رفقا نے تصنیف کیں وہ ہم کو حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔ ہم [illegible]

... وہ عناصر ہیں جن کو جدید اردو نثر کا پیش رو سمجھنا چاہیے۔

یہ اردو ادب کا افادی دور تھا یعنی اس زمانے میں جو کچھ لکھا گیا وہ زندگی کے معاشرتی اور اخلاقی مفاد اور فلاح کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ دور اردو میں اسی طرح عقلیت اور نثر کا دور تھا جس طرح انگریزی زبان کی تاریخ میں اٹھارہویں صدی۔ اس عہد میں اردو زبان کی اصلاح اور اس کی توسیع و ترقی کے لیے ویسی ہی کوشش ہوئیں جیسی کہ انگریزی زبان کی اصلاح و ترمیم کے لیے اٹھارھویں صدی میں ہوئیں۔

سرسید کا یہ عہد اردو نثر کا سب سے عظیم الشان دور ہے اس دور کے سب سے زیادہ اور گرانقدر لکھنے والے خود سرسید اور ان کے رفقاء حالی۔ آزاد۔ مولوی نذیر احمد۔ مولوی ذکاء اللہ۔ مولوی چراغ علی۔ مولانا شبلی اور شرر ہیں وان میں سے ہر ایک نے کسی ایک دو اصناف نثر کو اپنا میدان بنایا اور ان اصناف میں بہترین کارنامے پیش کئے۔

ابھی سرسید کا گروہ اپنا کام کر رہا تھا کہ مغرب سے نئے ادبی تاثرات و تصورات اور روایات و اسالیب کی نئی لہریں ہندوستان میں پہنچیں اور ہمارے دل و دماغ ہمارے فکر و احساس اور ہمارے اسلوب بیان اور انداز اظہار کو اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ تحریک سرسید کے نمائندے ابھی اپنا کام کر رہے تھے کہ اردو ادب میں وہ نیا میلان شروع ہوا جس کو مجمل طور پر ہم رومانیت کہیں گے۔ اس میلان سے جدید اردو نثر اور نظم کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے لیکن پہلے دور اور دوسرے دور کے درمیان نہ تو کوئی خلا ہے اور نہ کوئی بے ربطی۔ دونوں ادوار باہم مسلسل ہیں اور ابوالکلام آزاد اس سلسلے کی درمیانی کڑی ہیں۔ اگر ایک طرف سرسید حالی اور شبلی کے اسالیب کو مدنظر رکھا جائے اور دوسری طرف ابوالکلام آزاد کی طرز تحریر اور اسلوب پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ محمد حسین آزاد کے سوا پہلے دور میں کسی انشا پرداز کے یہاں رنگینی یا انشائی دلکشی نہیں پائی جاتی۔ ابوالکلام آزاد بیک وقت دونوں ادوار کے ممتاز عناصر کا امتزاج ہیں۔ ایک طرف تو موضوع اور مواد کے اعتبار سے ان کی بیشتر تحریریں اور تقریریں افادی انداز رکھتی ہیں دوسری طرف ان کے اسلوب نگارش اور انداز تقریر دونوں میں کچھ ایسی معنوی ہوتی رومانیت یا شعریت محسوس ہوتی ہے جو ان سے پہلے کے اساتذہ کے اسلوب میں نہیں پائی جاتی اور جو صاف اور نمایاں طور پر نیا عنصر معلوم ہوتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک کہ اسلوب اور طرز بیان کا تعلق ہے ابوالکلام آزاد سے اردو نثر میں وہ دور شروع ہوتا ہے جس کو ہم رومانی دور کہیں گے۔

ابوالکلام آزاد کی امامت میں دیکھتے دیکھتے ایسے نوجوانوں کی ایک جماعت تیار ہو گئی جو موضوع اور اسلوب دونوں کے لحاظ سے رومانیت پسند تھے۔ ابوالکلام آزاد سے لے کر نیاز تک ایک مکمل دور ہے جس کا اردو ادب کی تاریخ میں وہی مقام ہے جو کہ انگریزی ادب کی تاریخ میں انیسویں صدی کا ہے۔ اس دور کی ابتداء تو ابوالکلام آزاد سے ہوئی لیکن اس کے اصلی علمبردار نیاز فتحپوری ہیں۔ ابوالکلام آزاد ادیب اور انشا پرداز سے زیادہ ماہر سیاسیات اور خطیب تھے اور وہ بہت جلد دوسری سمت میں نکل گئے اور ایسا مشغول ہوئے کہ ادبی تخلیق کی فرصت ہی نہ ملی خالص ادب کے میدان میں نیاز ہی تھے جو استقلال اور استقامت کے ساتھ اردو نظم و نثر کے نئے دور کی رہنمائی کرتے رہے۔

اس سلسلے میں ایک شخص کا ذکر نہ کرنا بڑی بے انصافی ہوگی ہماری مراد مہدی حسن افادی الاقتصادی سے ہے یہ وہ انشا پرداز ہے جس نے واقعی اپنے زمانے کے نوجوان نثر نگاروں کو ایک خاص جمالیاتی اسلوب تحریر دیا۔ شبلی جیسا فاضل انشا پرداز مہدی حسن کی رچی ہوئی طرز نگارش پر رشک کرتا ہے اور خود نیاز نہ صرف ان کے انداز بیان کے قائل ہیں بلکہ نیاز کی نثر میں جو جمالیاتی کیف ہے اس کے مزاج میں افادی الاقتصادی کا اثر بھی اور دوسرے اثرات کے ساتھ جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ سرکاری ملازمت کی غلامانہ مشغولیت نے مہدی حسن کو اتنی فرصت نہ دی کہ وہ

کسی موضوع پر کوئی مستقل تصنیف یادگار چھوڑ جاتے۔ صرف چند ادبی شہ پارے اور کچھ خطوط ہیں جو ان کے نام کو تاریخ ادب اردو میں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جس زمانے میں ہندوستان کا سیاسی شعور کہیں خفیہ کہیں علانیہ طور پر سرفروشانہ انداز سے آگے بڑھ رہا تھا اس وقت ہندوستان کا ادب خالص رومانی میلان کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یہ بڑھتی ہوئی رومانیت ایک طرف تو مغربی ادبیات کے مطالعہ کا نتیجہ تھی دوسری طرف خود اپنے ملک میں ٹیگور کی متصوفانہ رومانیت اس کی ذمہ دار ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ٹیگور کے ساتھ ساتھ انگریزی کے مشہور شعراء اور مصنفین بالخصوص عہد وکٹوریہ کے آخری دور کے ادیبوں کا اثر روز بروز اردو ادب میں مقبول ہو رہا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ اردو میں اس عجیب و غریب صنف نثر کا سودا ہر لکھنے والے کے سر میں سمایا ہوا تھا جس کو شعر منثور یا شاعرانہ نثر کہتے ہیں۔ ہندوستان میں اس کی ابتدا ٹیگور سے ہوئی ہے لیکن اس سے پہلے انگریزی میں آسکر وائلڈ (Oscar Wilde) اور والٹر پیٹر (Walter Peter) جیسے جمال پرستوں نے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈال دی تھی اور شعر منثور کی یہ صنف یورپ کے اکثر ملکوں میں رواج اور قبول عام حاصل کر چکی تھی۔ خود ٹیگور اس مدرسہ کی نظم و نثر کے اسالیب سے کچھ کم متاثر نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کے افکار اور اسلوب پر اس ادبی تحریک کا اثر زیادہ ہے جس کو "کلٹی بیداری" (Celtic Revival) کہتے ہیں اور جس نے بالآخر [illegible] (Ireland) کو قومی آزادی دلوائی۔ آج ہم صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ٹیگور کے منظومات کے اسلوب کی ترکیب میں ان کے شدید قومی اور ملکی میلانات کے باوجود مغربی رومانیت کا کس حد تک اثر ہے۔ اور شاید بغیر سوچے سمجھے ہوئے ہم کو آج یہ بھی نہ سوجھے کہ ہندوستان کی ہر زبان کے ادب کو اور خاص طور پر اردو نظم و نثر کو "گیتا نجلی" "باغبان" "ماہ نو" وغیرہ نے کس حد تک متاثر کیا ہے۔

اردو زبان میں نیاز فتحپوری نہ صرف اس نئے دور کے رہنما ہیں بلکہ ایک خاص ادبی دبستان کے بانی بھی ہیں جس کو جمالیاتی دبستان کہنا چاہیے۔ رومانیت اور جمالیات دونوں ان کی ادبی تخلیقات کی سب سے نمایاں خصوصیتیں رہی ہیں۔ میں صرف آج کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ خصوصیت کے ساتھ نیاز کی ادبی زندگی کے اس حصہ کا ذکر کر رہا ہوں جو ۱۹۲۶ء پر ختم ہوتا ہے۔

نیاز فتحپوری نے اپنی ادبی زندگی کی ابتداء شاعری سے کی اور نظمیں لکھنے لگے ان کی نظموں کے مطالعہ سے بہت صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ جہاں ایک طرف طبیعت کے رومانی ابھار سے متاثر ہیں وہاں دوسری طرف ابوالکلام آزاد کا اثر بھی ان پر غالب ہے۔ اسلوب نگارش میں تو بہرحال ان کا سلسلہ ابوالکلام آزاد سے ملتا ہے لیکن ان کی جو نظمیں رومانی نہیں ہیں ان میں نثر مواد اور موضوع میں بھی وہ ابوالکلام آزاد سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی بیشتر نظمیں قومی اور ملی ہیں اور ان میں ابوالکلام آزاد کی آواز کے ارتعاشات بہت صاف طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ مگر نیاز کو بہت جلد محسوس ہو گیا کہ وہ شاعری کے لیے نہیں بنے ہیں اور پھر وہ نثر کی طرف اس طرح مڑے کہ ان کی شاعری نہ صرف ہمارے لیے بلکہ ان کے لیے بھی آج ایک بھولا ہوا خواب ہے۔ یہ اردو ادب کے حق میں بہت مبارک ہوا۔ نیاز کا ذوق جمال اور ان کا حسن کلامانہ شعور وہ دوسرا آہنگ چاہتا تھا جس کا مظہر شاعرانہ نثر ہے۔ نیاز نے اردو زبان و ادب کی جو ناقابل فراموش خدمتیں نثر کے میدان میں کیں وہ شاید شاعری کے میدان میں وہ کر نہ سکتے۔

نیاز کے نثری کارناموں کا آغاز جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے شعر منثور سے ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں ان کے یہ ٹکڑے قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے، اور ہر نیا لکھنے والا ان کی تقلید کرتا نظر آتا تھا۔ یہ شعر نما منثورات زیادہ تر آسکر وائلڈ اور ٹیگور سے ماخوذ تھے لیکن انہوں نے اپنے تخیل کی اپج سے طبع زاد نمونے بھی پیدا کیے جو رنگین [illegible]

جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے نیاز کی انفرادی فنکار شخصیت انہیں نثری پاروں سے واضح اور نمایاں ہو گئی تھی ۔

۱۹۲۳ء سے پہلے نیاز کی حیثیت ایک خالص رومان نگار کی تھی جن منثورات کا مکمل ذکر کیا جا چکا ہے ان سے الگ ہو کر اس زمانہ میں نیاز کا سب سے بڑا کارنامہ افسانہ نگاری ہے ۔ پریم چند کے ساتھ نیاز فتحپوری نے بھی اردو زبان میں مختصر افسانہ کی بنیاد رکھی بلکہ ایک خاص منزل تک اس کی تکمیل بھی کی ۔ نیاز ایک زبردست قوت آخذہ کے مالک ہیں ۔ وہ بڑے سلیقہ کے ساتھ دوسری جگہ سے مواد لے سکتے ہیں اور اپنے انفرادی اسلوب سے اس کو اپنا بنا کر پیش کر سکتے ہیں ۔ ایسا کرنا کوئی عیب نہیں بشرطیکہ کوئی اپنے تخلیقی اسلوب سے دوسری جگہ سے ماخوذ مواد کو بالکل ایک نیا روپ دے دے ۔

شیکسپیر کا کوئی ڈرامہ ایسا نہیں جو دوسری جگہ سے نہ لیا گیا ہو لیکن اس کے ڈراموں کے اصلی ماخذوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں ۔ مگر شیکسپیر کے ڈرامے آج تک دنیا کو متاثر کئے ہوئے ہیں ۔ اول اول نیاز کے افسانے یونانی و ساطیر و قصص اور مصر و عرب یا دوسرے قدیم ملکوں کے حسن و عشق کی داستانوں سے ماخوذ ہوتے تھے جو بڑی رومانی سرگشتگی اور والہانہ دھن کے ساتھ لکھے جاتے تھے ۔ ان افسانوں کا موضوع بلا استثناء حسن و عشق ہے اور محبت اور عورت کی جیسی رنگین اور دلفریب تصویریں ان افسانوں میں ملتی ہیں اردو کے کسی دوسرے افسانہ نگار کے وہاں نہیں ملتیں ۔

نیاز کے تمام افسانوں پر معدودے چند کو چھوڑ کر شروع سے آخر تک ایک رومانیت چھائی ہوئی ہے جو محض سطحی نہیں ہوتی بلکہ دور تک جاری و ساری ہوتی ہے ۔ اس رومانیت کا تعلق کسی ماورائی یا تخیلی دنیا سے نہیں ہوتا نیاز کے افسانے اسی ٹھوس اور سنگین عالم آب و گل سے وابستہ ہوتے ہیں وہ جب حسن و عشق کے بیان پر آتے ہیں تو ہم کو ہوا اور بادل میں نہیں لے جاتے بلکہ جسم کی تمام چھپی ہوئی رنگینیوں اور کیفیتوں سے لذت آشنا کرتے ہیں ۔

"کیوپڈ اور سائیکی" "رائد محبت" "حسن کی عیاریاں" "صحرا کا گلاب" "کہکشاں کا ایک سیارہ" "شاعر کا انجام" "تاجدار رقاصہ" "شہاب کی سرگذشت" ۔ یہ جتنے افسانے ہیں سب محبت اور عورت کو ایک لطیف راگ میں منتقل کر دیتے ہیں جس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا اور جو پڑھنے والے کو اس طرح مبہوت کر لیتا ہے کہ اس کو پھر کسی بات کا ہوش نہیں ہوتا ۔ نیاز کے یہ عشقیہ افسانے سوز و گداز اور تاثیر کے ایسے مرقعے ہیں جن کی مثال نیاز سے پہلے نہیں ملتی ۔ لیکن نیاز کو محض رومانی افسانہ نگار سمجھنا غلطی ہوگی ۔ اردو میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے افسانے میں نفسیاتی تجزیے اور کردار نگاری کو اہمیت کے ساتھ داخل کیا ۔

جوں جوں ان کی افسانہ نگاری بالغ ہوتی گئی ان کے افسانوں میں نفسیاتی میلان زیادہ نمایاں اور مستعمل ہوتا گیا ۔ "شہاب کی سرگذشت" اور اس کے بعد جتنے مختصر یا طویل افسانے نیاز نے لکھے ان سب میں رومانیت کے ساتھ یہ نفسیاتی میلان بہت زیادہ ابھرا ہوا نظر آتا ہے ۔ اس اعتبار سے وہ اردو افسانہ نگاری میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو انگریزی ناول اور افسانے میں جارج ایلیٹ کی ہے ۔ لیکن نیاز محض نفسیاتی اشارہ کر کے رہ جاتے ہیں اور اپنے رجال داستان کے نفس کی گہرائیوں کا جائزہ لینے سے احتیاط برتتے ہیں ۔

مجموعی حیثیت سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نیاز کے افسانوں کی واقعیت اور ان کے نفسیاتی رجحانات کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی سب سے نمایاں خصوصیت خالص رومانیت یا حال پرستی ہے جس کا تعلق باطنی کیفیات سے زیادہ اور ظاہری حالات و حادثات سے کم ہے ۔ وہ ایک بہت تیز اور جزو رس قوت مشاہدہ کے مالک ہیں اور ماحول اور خارجی سوانح کے بہت صحیح نقشے پیش کرتے ہیں لیکن یہ نقشے محض پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے سامنے افراد کی انفرادی اور داخلی زندگی کو پھیلا کر پیش کیا جاتا ہے ۔ ۱۹۲۷ء کے بعد انھوں نے کچھ ایسے افسانے بھی لکھے جن کا واسطہ رسمی طور پر سماج اور معاشرے سے ہے ۔ لیکن ان افسانوں میں نیاز کے رومانی مذاق ہی کے تقاضے ہیں وہ جاذبیت نہیں جن کی بنا پر ان کے دوسرے افسانے یادگار رہیں گے اور جنکہ

بدولت اردو ادب کا مورخ نیاز کا نام محسن اردو افسانے کے بانیوں کی فہرست میں گنانے کے لیے اپنے کو مجبور پائے گا۔

نیاز ایک اونچے درجہ کے رومان نگار ہوتے ہوئے بھی رو۔ اول سے ایک سنجیدہ اور صاحب عقل و ہوش آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنے کو نہ تو کبھی شعر میں کھویا اور نہ رومان میں ڈبویا۔ حالانکہ وہ شعر و رومان دونوں کی پھڑکتی ہوئی رگیں پکڑ لینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

نیاز کو علوم عربی اور فارسی میں تو تبحر پر پورا درک حاصل ہو چکا تھا لیکن انگریزی میں بھی ان کا مطالعہ وسیع اور متنوع رہا ہے اور پھر وہ ایک خاص معیار کا تخلیقی شعور بھی رکھتے ہیں جس کی بدولت وہ اونچی اونچی علمی مہموں سے فیضیاب ہو سکے ہیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر ایک جامعیت پیدا ہو گئی جو نہ صرف شعر و رومان بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو نگاہ میں رکھے تھی۔

نیاز کی اس جامعیت کا پہلا مظاہرہ اس وقت شروع ہوا جب کہ انھوں نے ۱۹۲۲ء میں بھوپال سے "نگار" جاری کیا۔ یہ غیر متوقع جامعیت اور جاسوسی سحر ایک طرف تو نیاز کی وسعت ذوق و نظر کا ناقابل تردید ثبوت ہے لیکن دوسری طرف ان کی یہ جاسوسیت جو زیادہ گہری نہیں ہے ان کی تخلیقی قوت کے لیے خسارہ بھی ثابت ہوئی۔ نیاز صحیح معنوں میں ایک فنکار تھے اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ آج جب ہم "نگار" کا اداریہ یعنی نیاز کے ملاحظات پڑھتے ہیں تو موضوع سے زیادہ نیاز کا اسلوب تحریر ہم کو اپنی طرف کھینچے رہتا ہے۔ نیاز ایک صاحب طرز کے علاوہ اگر کچھ ہو سکتے تھے تو افسانہ نگار یا ایک خاص معیار کے نقاد۔ اور درحقیقت ان کی مستقل حیثیت اردو ادب میں انھیں خصوصیات کی بنا پر قائم ہے لیکن "نگار" کی ادارت کے سلسلے میں انھوں نے زندگی کے اور بہت سے مادی اور غیر مادی سنگین مسائل پر لکھنا شروع کیا جو دوسرے لکھنے والوں کے لیے چھوڑے جا سکتے تھے۔

مجھے وہ گھڑی بھولے گی نہیں جب کہ میں نے نیاز صاحب کو ۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں ایک مردانہ رائے دی تھی کہ مذہبی مباحث کو ملاؤں کے لیے اور مادیات متنبی کے لیے چھوڑ دیا جائے اور نگار کے صفحات کو ان سے بری رکھا جائے۔ لیکن نیاز کی طبیعت میں کچھ چلبلا پن بھی ہے دوسرے وہ سچی حق باتوں کی بازاری قیمت کو ایک معاملہ سنج کی حیثیت سے مجھ سے بہتر پرکھ سکتے ہیں اسی لئے انھوں نے میری بات سنی ان سنی کر دی اور آج تک ان جھگڑوں سے وہ حظ حاصل کر رہے ہیں جو شاید سات جنم لینے کے بعد بھی میں نہ کر سکوں۔ نیاز فطرتاً ایک صاحب اسلوب ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ افسانہ نگاری یا ایک خاص عنوان کی ادبی تنقید کے لئے موزوں تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی مستقل حیثیت فن تخلیق میں انھیں دو مسلکوں سے قائم رہے گی۔ لیکن اس کو کیسے بھلایا جائے کہ وہ زندگی کے اور معاملات اور مسائل پر بھی اپنے قلم کی جولانی دکھاتے رہے اور ان کے تحریری کارناموں میں افسانے اور ادبی تنقید کے علاوہ ایک ضخیم حصہ متفرقات کا بھی ہے جن میں اخلاق و حکمت، اقتصادیات و معاشرت، ادبیات و فلکیات، مذہب و تصوف، نفسیات، جنسیات، سمدرک یعنی علم فراست الید، علم نجوم اور پھر سیاسیات حاضرہ غرض کہ زمین و آسمان کا کونسا قضیہ ہے جس کو نیاز صاحب نے نہ چھیڑا ہو اور جس کو اپنے طرز تحریر کے جادو سے بڑے بڑے مرتد پڑھنے والے کے لیے دلکش نہ بنا دیا ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نیاز نے جب کبھی کسی موضوع کو اٹھایا تو کافی تحقیق اور چھان بین سے کام لے کر اس کو بڑے سلیقے کے ساتھ پیش کیا۔

نیاز کی تحریروں کی ایک مستقل خصوصیت وہ قرینہ ہے جو اردو کے بہت کم انشاپردازوں کو میسر ہوا ہے۔ نیاز کے علمی اور تحقیقی یا معاشرتی اور مذہبی مضامین سے ہم کو جو کچھ بھی ذہنی اختلاف ہو ہم ان کی کسی تحریر پر بد قرینگی کا الزام نہیں لگا سکتے۔ یہی شائستگی اور خوش ترنگی ہے جس کا آج بیشتر نوجوان ادیبوں کی تحریروں میں کامل فقدان ہے۔

[illegible] ہے۔ اس ادبی ہرکارہ پن نے خود ان کی اپنی خلاق طبیعت اور اصلی فنی آنچ کو نقصان بھی پہنچایا۔
پہنچایا نہیں بلکہ شاید اس سے "نگار" کو ایک تجارتی معاملے کی حیثیت سے بھی کچھ کم گھاٹا نہیں ہوا۔ مذہبی مسائل کو چھیڑ
کر نقصان کی رو یہ انحطاط تخلیقی قوت کی علامت ہے۔ انھوں نے اپنے لیے دشمنوں کا اچھا خاصا گروہ پیدا کر لیا ہے
اس سے "نگار" کے شیدائیوں کی تعداد بھی گھٹتی ہی گئی ہے۔ لیکن نیاز کا بڑے سے بڑا منکر بھی ان کے اسلوب کی ساحرانہ
[illegible] سے مبہوت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

نیاز کے اسلوب کی ایک زبردست خصوصیت وہ ڈرامائی اچانک پن ہے جو انھوں نے آسکر وائلڈ اور اس کے بعد کے
[illegible] نثر نگاروں سے سیکھا ہے اور جو ان کے معاصر یا ان کے بعد کی نسل کے کسی ادیب میں نہیں پایا جاتا۔ یہ اچانک پن ان کے
پڑھنے والے کو ان کی انشا پردازی کی توانائی کا اعتراف کرنے کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔ سلاوٹ اور بیباختگی کو اگر خوش آہنگی
کے ساتھ ایک جگہ دیکھنا ہے تو نیاز کے اسلوب کو دیکھیے۔ اور پھر یہ اسلوب محض جمالیاتی کیفیتوں سے معمور نہیں ہے بلکہ اس کے اندر
[illegible]ت اظہار اور تابندگی پائی جاتی ہے جو اس سے پہلے کسی اور نثر نگار کو نصیب نہیں ہوئی۔

نئی نسل کو نیاز سے جو ترکہ ملا وہ اسلوب ہے۔ ایسا اسلوب جو طرح طرح کی توانائیاں اپنے اندر لیے ہوئے ہے، اور جس پر
پرانے اور از کار رفتہ ہونے کا الزام آج بھی نہیں لگایا جا سکتا۔

نیاز کے اسلوب میں بیک وقت ایک ٹھہری ہوئی سنجیدگی اور سنبھلی ہوئی سوچ باہم ملی جلی ہوئی پائی جاتی ہے یہ اسلوب بسا اوقات عکاسی کے
[illegible] مکمل پختگی اور دلآویزی کے ساتھ بحث کی جا سکتی ہے۔ موضوع کی خشکی یا تلخی کو اسلوبی کیفیتوں میں اس طرح لپیٹ لیا کہ محسوس
نہ ہونے پائے معمولی ہنر نہیں ہے۔ اردو نثر کی نئی نسل نے یہی ہنر نیاز سے پایا ہے اور جب تک اردو زبان کا کوئی ادبی مستقبل ہے
اس کے ادیبوں کی کوئی نئی نسل نیاز کے اسلوب کے اثر سے بے نیازی نہیں برت سکتی۔ اردو نثر کی تاریخ میں نیاز کا اسلوب ایک زندہ
قوت ہے جس کے اثرات کبھی فنا نہیں ہو سکتے۔

آخر میں ایک اہم بات کا احساس دلانا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ نیاز اپنے دور کے بیشتر معاصرین کی طرح ان ادیبوں میں
سے ہیں جن کو رجعتی اور ترقی پسند خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے خود اپنے کو کسی جماعت کے ساتھ منسوب نہیں کیا۔ وہ ادب
اور زندگی کے بارے میں اپنے مخصوص اصول و نظریات رکھتے ہیں جن پر انھیں وثوق ہے اور ہمیں ان سے بدظن ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں
ہے۔ اپنے وقت کا بڑے سے بڑا انسان نوجوان نسل اور نئے دور کے لیے گزشتہ شمار ہو جاتا ہے۔ کارلائل اور رسکن، ہارڈی
اور [illegible] شیلر، مارکس اور والٹر پیٹر آج محض پارینہ کے لوگ ہو کر رہ گئے ہیں۔ شاعروں میں سے کسی جیسا بیباک انقلابی شاعر آگے
چل کر دقیانوسی لوگوں میں شمار کیا جائے گا۔ لیکن شعر و ادب کی تاریخ میں ان ناموں سے تجاہل یا تنافر برتنا جہالت اور تنگ نظری
سمجھا جائے گا، اور ان لوگوں کے اکتسابات کے زندہ عناصر آج کی نئی نسل کی روح میں کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح نیاز کے نام
سے اردو نثر کی جامع اور بے تعصب تاریخ کبھی تجاہل نہیں برت سکتی۔ نیاز میں ایک خصوصیت بڑی قابل قدر ہے جو پرانی
نسل کے لوگوں میں بہت نایاب ہے، اور یہ ان کی ادبی فراخدلی ہے۔ وہ خود کسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے، اور ان کے خیالات
و معتقدات اپنی جگہ پر مکمل ہیں۔ لیکن وہ نئی نسل کو ادب اور زندگی میں نئے راستے اختیار کرنے سے نہیں روکتے اور آگے قدم بڑھاتے
دیکھ کر خوش ہوتے اور کسی پر طعن نہیں کرتے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ اگر گزرے ہوئے دور کے لوگ نئے دور کے نوجوانوں سے خلوص
محبت کے ساتھ حوصلہ افزائی کے لیے صرف اتنا کہہ سکیں،

"سفر رفتہ رفتہ مبارک باد"

تو نئی نسل والے جو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کی امنگ اپنے اندر رکھتے ہیں اس کو اپنے حق میں برکت سمجھیں گے۔

ظ انصاری

قاضی عبدالغفّار

ایک روشن فکر صاحبِ طرز ادیب

۱۰ جنوری کو دن کے تین بجے "آجکل" کے دفتر میں ڈاک دیکھ رہا تھا اسی میں قاضی عبدالغفار کا تازہ خط تھا لکھا تھا کہ یہ آخری حملہ تھا، کئی دن سے میری حالت خراب ہے۔ اس معاملے میں تفصیلی خط ذرا ٹھہر کر لکھوں گا۔ وہ خط میں نے تہہ کیا ہوگا کہ شاعر نظامی نے آل انڈیا ریڈیو سے فون کیا کہ قاضی عبدالغفار صاحب کا کل دوپہر کو انتقال ہوگیا ہے کیا تم ان کے بارے میں آج شام کو ریڈیو پر ہنگامی تقریر کر سکو گے؟

میں حیران رہ گیا کہ کل ان کا انتقال ہوا ہے اور کل ہی انہوں نے یہ خط لکھا جو مجھے آج ملا یعنی آخری دم تک انجمن ترقی اردو کی ڈاک کا جواب دیتے رہے جب میں نے دوسرے روز علی گڑھ تعزیت کے لیے فون کیا تو تصدیق ہوگئی کہ انتقال سے ۲۴ گھنٹے پہلے تک وہ خطوں کا جواب دیتے رہے اور انجمن کے کاموں کے بارے میں مشورے اور ہدایات کا سلسلہ جاری رہا بستر سے اٹھنا منع تھا لیکن اس پر بھی اپنے فرض منصبی سے منہ نہ موڑا

قاضی صاحب کی یہ ایک ایسی خصوصیت تھی جس سے ہم لوگ، ہم جن کا نام قرطاس و قلم میں آج کے بعد نکلا ہے، بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، اور سدھار سے پہلے ادب اور صحافت میں ایک آدھ روشن درجے کا ایسی طرح سے اضافہ کر سکتے ہیں

شخصیت اور تحریر کا ربط باہم

قاضی صاحب کی زندگی کی داستان بڑی انوکھی ہے۔ وہ چاروں کھونٹ سے چوکس آدمی تھے اور روشن دماغی کا جوہر جو فطرت نے انہیں عطا کیا تھا اسے جو سنبھال کر انہوں نے زندگی کو ہر ایک کرید کے تجربات میں اتنے غوطے دیے تھے کہ دامن داغ محرومی سے ہمیشہ کے لیے پاک ہوگیا اور وہ خود سراپا نکھر کر رہ گئے تھے۔ یہاں میر درد کا وہ شعر میں گنگنائے بغیر نہیں رہ سکتا

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

یہ معنوی تر دامنی خاص طور سے ان کی ادبی تحریروں کی تازگی کا راز ہے۔ وہ شخص جس نے کم و بیش چالیس برس اخبار کی میز پر بیٹھ کر قلم گھسا ہو، یوں زندہ توانا اور برقرار رہے مشکل ہے، جب تک اس نے اپنی فطرت اور اپنے ذہنی وجود کو اخبار نویسی، روز مرہ کی روا روی سے بلند و برتر کر کے یا مقدس نہ رکھا ہو۔ قاضی صاحب کے تذکرے کے لیے ان کے سوگ میں بھی یہ حقیقت مجھے اپنی یاد دلاتی ہے کہ زندگی اور ماحول کے بارے میں فنکار کا رویہ، فنکار کی شخصیت اور اس کی ذہنی سرزمین ہی وہ اجزا ہیں جو اس کی فنی تخلیق میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ اس سے مفر ممکن نہیں کوئی اگر یہ دعویٰ کرے کہ اس کا وجود اور روزمرہ کی زندگی کے معمولات بالکل مختلف واقع ہیں اس شخصیت کی جو اس کے قلم یا قلم کے نتائج سے ابھری ہے تو یہ دعویٰ غلط اور گمراہ کن ہے گمراہ کن اس معنی میں کہ وہ معمولات تو محض سراب ہیں جو عام طور سے بظاہر دیکھنے والے کو نظر آتے ہیں ہم مصنف یا فنکار کی اس شخصیت کے معمولات پر اور اس ذہنی رویے پر گہری نگاہ رکھی ہوگی جو اس کا وجود معنوی ہے۔ مثلاً میں نے کئی بار سنا ہے کہ ریاض خیرآبادی

صہبا

نے شراب کا قطرہ نہیں چکھا لیکن ان کی شاعری شراب ساقی کے مضمون میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ہاں — یہ صحیح ہو سکتا ہے۔ لیکن اس دہری زندگی میں ہم "رند باصفا کی پارسا" زندگی کو ان کی ایسی شعوری کوشش قرار دینے پر مجبور ہیں جو ایسے دینی اور گھریلو ماحول کو شاعری کی صورت میں ملاپ دیتی رہی ہے (مجھے اس لفظ کے مکروہ ہونے پر معاف کیا جائے کیونکہ یہ میں نے قاآنی کے ہاں سے اٹھا لیا ہے۔ ملاپ جہاں ملاپ ہیں۔) اور اس کے بعد شاعر اپنا تمام فسوں اپنی شاعری میں سمیٹ کر روزمرہ کی زندگی کو پارسائی کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ یہ بات کسی کسی کو نصیب ہوئی ہے

اُٹھے کبھی مسجد سے تو میخانے کو ہو آئے ۔ پی آئے تو پھر بیٹھے رہے یاد خدا میں

میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ رند باصفا نے اگر گھریلو (اکبری)، دردناک اور دردمند زندگی بسر کی ہوتی تو وہ ایسے کھلتے ہوئے شعر نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس طرح جام و مینا اچھال اچھال کر زندگی بھر پارسا رہنا صرف ایسے فنکار کے لیے ممکن ہے جس نے دنیوی آبرومندی کی خاطر یا اخلاقی اور اعتقادی بندشوں کی بدولت اپنی ذہنی اُلوت کو شراب و ساقی کی ہستی کو دبی خلوت میں بدل ڈالا اور خود اس کے تقاضوں سے نجات پالی

من می روم بکعبہ و دل می رود بدیر • دارم رہِ بکفر بہر یک قدم دو سیر

اور یہ سطریں اصل موضوع سے بہک جانے کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ کہنے کا منشا یہ تھا کہ قاضی عبدالغفار ہزاروں گل گشت میں سانس کھینچ چکے تھے اور زندگی کو انھوں نے ملا ستی مولویوں سے لے کر گل اندامان سیمیں تک کی صحبتوں میں اٹھا لیا تھا۔ یہ بات اگر ذہنی احترام کے خیال سے میں نہ کہوں گا تو ان کی تحریریں کہہ دیں گی اور ان کی تحریر کے وہ شرارے بتا دیں گے جو کچھ کم پچاس برس صحافت تمام و ذہن کرتے رہے۔ چنانچہ تصانیف میں بھی جو مطبوعہ ہیں ان کی نثر خود قاضی صاحب کی زندگی کے بھرپور پہلوؤں کا اعلان کرتی ہے

نقش فرنگ سفرنامہ یورپ ہے جب وہ خلافت کمیٹی کے تیسرے وفد کے سیکرٹری کی حیثیت سے ۱۹۲۲ء میں لائڈ جارج کے بلاوے پر لندن گئے۔ یہ وفد کیسے ترتیب پایا، کیونکر وہاں پہنچا۔ کیا دیکھا، کیا سنا اور عالم اسلامی پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ہندوستان کی جانب ناکامی اور باہمی اختلاف کا پیام لے کر لوٹا۔ یہ اس قابل ہے کہ اسے ان کی ہزارہا صفحات اور ہزارہا الفت و روز پر پھیلی ہوئی تحریروں میں اہم درجہ دیا جائے

نقش فرنگ میں قاضی صاحب کے لباس میں ہم ایک ایسے شدید مذہبی قوم پرست سے ملتے ہیں جسے مغرب کی زندگی کا ہر ایک گوشہ تاریک نظر آتا ہے۔ وہ چاہے انگریزوں کے آداب معاشرت ہوں یا فرانسیسیوں کا طرز فکر اور لائڈ جارج کی آمرانہ جمہوریت ہو یا یورپ کے علمائے مشرق کی علمی کاوشیں — جس شے کو بھی ہندوستان کے قدامتی ماحول سے اجنبی پایا ہے اسی کو مصنوعی، فریب کار اور زوال آمادہ مادہ پرست سمجھا ہے۔ قاضی صاحب کی عمر اس وقت ۳۴ برس کی تھی۔ اپنے طور پر ایک بار پیرس بھی ہو آئے تھے ہو کیا آئے تھے وہاں ہندوستانی مال کی دکان کھول چکے تھے۔ لوگوں کے درمیان رہ چکے تھے لیکن دس بارہ برس ہندوستان کی جن تحریکوں کی آنچ میں وہ تپ چکے تھے ان کا اثر کچا نہیں تھا۔ ہندوستان کی آزادی، برطانوی امپیرلزم کی مخالفت اور عالم اسلام کا مرکزی خلافت ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۳ء تک مسلمانوں کے بیدار متوسط طبقے میں ان تحریکوں کا یکے بعد دیگرے زور رہا۔ لیکن یہ تحریکیں اپنے لیڈروں کی سوجھ بوجھ کی وجہ سے ہمیشہ مذہبی عقائد کے رنگ میں رنگی رہیں۔ صاف صاف سیاسی اور سماجی مورچے سے ان کی جنگ نہیں لڑی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ چند افراد کو چھوڑ کر باقی تمام کارکن اور عوام قومی آزادی کی راہ کے ساتھ مذہبی ماحول کی تجدید کی راہ پر بڑھتے گئے۔ قاضی عبدالغفار ان تحریکوں کے دھڑکتے ہوئے دل میں رہے تھے۔ مولانا محمد علی کے ہمدرد، اخبار میں حکیم اجمل خاں کی شریف منزل میں ابوالکلام کے قرب میں۔ خلافتیوں کے حلقے میں اس وقت جارہے

رہنماؤں کی ذہنی اور عملی زندگی کیا تھی مشرقیت کا اور قومی آزادی کا تصور کیا نہ رہا تھا۔ یہ دیکھنا ہو تو قاضی صاحب کی
دو کتابیں اس کا آئینہ ہیں نقش فرنگ اور حیات اجمل۔ ایک اسی وقت چھپ گئی تھی دوسری حکیم کی وفات
۲۰ برس بعد بار بار کی ترمیم اور اختصار کے بعد شائع ہوئی۔ جناب اجمل خان قاضی صاحب کے بہت گہرے

حیات اجمل رازدار، عزیز بزرگ، مونس و ہمدم اور مربی۔ اجمل خان کی یہ سوانح حیات نہیں ہے بلکہ یہ تفصیلی سوانح
عمری ہے خلافت، لیگ اور کانگریس کے اتار چڑھاؤ کی اس بیسویں صدی کی ابتدائی چوتھائی ایسی صاف اور واضح نظر آتی
ہے کہ کیا کسی تاریخ میں نظر آئے گی اور اس کے علاوہ خود ایک دستاویز ہے اس ارتقاء کی جو اس ۲۰ برس میں قاضی صاحب کا ذہن
قبول کر گیا۔ یہاں وہ "نقش فرنگ" والے قاضی صاحب نہیں بلکہ ان کا ترقی یافتہ اور زیادہ روشن فکر ہیولیٰ ہے جو نہ مشرق
سے بیزار ہے نہ مغرب سے صدر کرتا ہے بلکہ ایک ایک سیاسی اور سماجی، ذاتی اجتماعی واقعہ کو اس کے چوکھٹے میں لگا کر دیکھتا ہے
اس کی کمزوری اور قوت کے پوشیدہ رازوں پر ہاتھ مارتا ہے اور اپنے عہد کی سب سے ہنگامہ خیز تحریکات اور سب سے بیش اٹھاتی
ہوئی فکر کا ساتھ دیتا ہے۔ اب وہ حالات کو صرف خاص خاص لوگوں کے رجحان طبع اسباب کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ
انسانی زندگی، اجتماعی اقتصادی انتشار و انقلاب میں شخصی کامیابی اور ناکامی میں پس پردہ محرک اور محرک قوتوں کی سعی ٹٹولتا ہے۔ یہ
بات ممکن ہی تھی اگر قاضی صاحب نے یہ ۳۰ برس کا عرصہ تیس بار سفر یورپ میں، ٹرکی ایشیا کی زبردست شخصیتوں مصطفیٰ کمال
جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کے حالات سے مس اشغال میں مولانا محمد علی کی ناکامی اور مولویوں اور ریشمی رومالوں "کی تصویر کشی"
کو آزادانہ جانچے ہیں، بین الاقوامی حالات خصوصاً انقلاب روس کی عالمگیر اہمیت سمجھنے میں طاقتور اخبارات نکال کر روزمرہ کے سیاسی
ہنگاموں سے باخبر رہے اور سرسیدی سے جینے میں صرف نہ کئے ہوتے۔ اب ان کا نقطۂ نظر بے تعصب اور وسیع بھی ہو چکا
تھا اور اعصاب سے مذہب و سیاست کی یکجائی کا بخار اترنے کے ساتھ طرز بیان میں فرق پیدا ہو گیا تھا یعنی عبارت آرائی
اور کم مفہوم کے لیے زیادہ الفاظ کا استعمال (جو ہمارے انشا پردازوں کی روایت ہے) ابھی لڑ کھو چکا تھا۔ انگریز خود ترکی
کو ذلیل و کمزور کر دینے کے بعد کسی طرح خلافت اسلام کو کسی ایسے گروہ کے ہاتھوں میں پکڑا دینا چاہتے تھے جو ہمیشہ برطانوی سیاست
کے دست نگر ہیں، اس زمانے میں حکیم اجمل خان یورپ کے سفر پر جاتے ہوئے مصر کی خبر سنتے ہیں کہ وہاں بھی علمائے امت کے
دو گروہ ہو گئے ہیں ایک گروہ کا خیال ہے کہ خلافت المسلمین کا مرکز مصر میں ہو اور شاہ مصر ملیکہ مصر کئے جائیں، دوسرا گروہ
اس کے خلاف ہے۔ یہاں قاضی صاحب تبصرہ کرتے ہیں

> "دراصل زمانے کی (۱۹۲۵-۲۶ء) برطانوی سازشوں کا شاخسانہ تھا۔ انگریز چاہتے تھے کہ ان کے
> زیر اثر کسی ملک میں پھر خلافت کا ایک مرکز بن جائے جس کے نام سے وہ اسلامی ممالک کے لوگوں کو
> دھوکا دے سکیں لیکن یہ سازش کامیاب نہ ہو سکی اس لیے کہ سلطان ابن سعود نے مصر کی خلافت کو
> تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اگر اس وقت کسی طرح بھی مصر میں خلافت قائم ہو جاتی تو شاید ہندوستان
> کے مسلمانوں کو ـــ جو مذہبی اصطلاحوں کے پیچھے دوڑ رہے تھے ـــ زیادہ آسانی سے بہکانے کا موقع
> مل جاتا لیکن برطانوی مدبر کو ہزیمت میں ناکامی ہوئی اور اس کا سبب زیادہ تر یہ تھا کہ مصطفیٰ کمال نے
> ان مذہبی اصطلاحوں کے نام نہاد غباروں سے ساری ہوا نکال دی تھی"

اس طرح کے تبصروں اور بیانات نے "حیات اجمل" کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا ہے اور اسے ایک ایسی سوانح
عمری بنا دیا ہے جو کبھی بھی کم دلکش اور پرانی نہیں ہونے پائی بلکہ اپنے موضوع سے ۲۵، ۲۶ سال کی ہندوستانی سیاست
کی تاریخ میں ٹانک لیے جانے قابل ایک پر بصیرت دستاویز بن گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی آثار جمال الدین اور

آثار ابوالکلام کو بھی شامل کرلیا جائے تو بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ قاضی صاحب کی فطرت میں بغاوت و آزادی کے رجحان کے ساتھ جمالیات اور نفاست پسندی کے الگ الگ جوہر تھے اس نے سر سید پر قلم اٹھایا اور ہر پہلو کے لیے ایک آئیڈیل کردار چنا یقیناً اس طرح کے نمایاں کر دکھانے والے کے فکر اور فن دونوں کے لیے چشم کشا ثابت ہوتے ہیں

جمال الدین افغانی کی شخصیت عالم اسلام کی عظیم شخصیت تھی جس نے عنفوان شباب کی بے قراری اور آزادی پسندی

آثار جمال الدین افغانی کو روشنی دکھائی سنہ ۱۹ء میں علی گڑھ (ایم اے او کالج) میں پہلی اسٹرائک ہوئی تو قاضی عبدالغفار وہاں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے چودھری خلیق الزماں، تصدق احمد شیروانی، حسرت موہانی، سید محمود وغیرہ اس ہڑتال کے لیڈر اور قاضی صاحب شریک تھے وہ وہاں سے بھاگے انہ تحصیلداری کی وہاں سے بھی استعفا دیا سر یعقوب کی بہن سے ان کی شادی ہوئی۔ خود بھی بہت خوشحال گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن یہ ترغیبات مراد آباد میں روک لینے کے لیے کافی نہ ہوئیں سنہ ۱۹۱۳ء میں "ہمدرد" کے ادارے میں چلے آئے وہ بند ہوا تو کلکتہ چلے گئے وہاں سے "جمہور" اخبار نکالا پریس اور اخبار دونوں کو بتعلق سائی بے صفا کر کے تو گمنام گمنام کے مصر ہوتے ہوئے لندن جا پہنچے پیرس میں تجارت شروع کر دی وہاں ۱۶، ۱۷ مہینے ڈیرا ڈالے رہے۔ یہ سیاحت صرف سیاحت نہ تھی طبیعت کی بے قراری اور آزادی اور سیاسی ماحول کی جستجو بھی جمال الدین افغانی کی آواز اس وقت مغربی ایشیا خصوصاً اور تمام مسلم آزادی پسند دنیا میں عموماً گونج رہی تھی قاضی صاحب نے اس کا دامن پکڑ لیا کئی برس تک وہ اس آواز کو ریکارڈ کرتے رہے۔ پہلی سوانح حیات تھی جو ان کے قلم سے نقد کو کلی حیات اجمل سے پہلے اگر دونوں کتابوں پر تاریخ اشاعت درج نہ ہوتی تب بھی مصنف کی فکر کے ارتقائی زینے کی نشاندہی کرتا جاسکتا ہے کہ یہ حیات اجمل کے شعور سے پہلے کی تصنیف ہے اس میں بیان کی جولانی اور آتش نوائی، شدت اور حدت قاضی صاحب کی تمام تصانیف سے زیادہ ہے

میں یہ جولانی، شدت اور حدت سب سے کم ہے اس میں رکھ رکھاؤ، احتیاط اور نفاست پسندی زیادہ ہے

آثار ابوالکلام خود مولانا ابوالکلام کی صد درجہ نفاست پسندی اور باریک مزاجی کی لو اس کتاب میں ان کے اقتباسات کی کثرت کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ قاضی صاحب بھی اس تصنیف کے دوران اسی ذہنی خلوت میں گم ہیں مثلاً ایک جگہ اقتباس سے لدی ہوئی اس کتاب میں جس کا دوسری سوانح عمریوں سے ہٹ کر لوں پر اقتباس ہو جانے سے نہیں ہے۔ مولانا کی انفرادیت پسندی کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> "میری طرح جو لوگ تحریک خلافت کے زمانے میں مولانا آزاد اور مولانا محمد علی دونوں کو قریب سے دیکھ رہے تھے وہ سمجھ گئے کہ ان دونوں کے درمیان ایک ذہنی خلیج حائل ہے جس پر کوئی پل نہیں باندھا جاسکتا ۔۔۔ میں سوچتا ہوں تو مولانا آزاد کی ضد کے مسلک ہی میں ان کی شخصیت کا اصلی استحکام نظر آتا ہے۔ مولانا محمد علی اور مولانا کی انفرادیت میں بھی ایک بہت بڑا فرق تھا مولانا محمد علی ایک عمومی لیڈر تھے (پاپولر) ۔۔۔ ظفر اللہ کی طرح اپنے ادبالوں کا زاویہ ہوا کے رخ پر قائم کرسکتے تھے مولانا اس مفہوم اور رابطہ کی عمومیت سے تقریباً بیگانہ رہے ان کی انفرادیت کے دائرے میں سب سے بڑا سامان عمر عوام کی مقبولیت نہ تھی بلکہ ان کی انفرادیت بجائے خود تھی مولانا محمد علی بسا اوقات اپنے معتقدین اور مخالف سے دست و گریباں ہو جانے کی جرأت رکھتے تھے اور ضرورت کے وقت ان کی صحافت کا انداز بھی جارحانہ ہو سکتا تھا۔ لیکن مولانا بعض اوقات دوسروں پر اس لیے تنقید یا تعریض نہیں کرتے تھے کہ ایسا کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ یہ کوئی احساس کمتری نہیں بلکہ ایک بہت صفدی اور مستحکم انفرادیت ہے جو میدان جنگ میں اس لیے

نہیں جاتی کہ اسے کوئی برابر کا حریف نظر نہیں آتا ——"

مولانا کی انفرادیت پسندی کی داد دیتے ہوئے قاضی صاحب نے خود اپنی انفرادیت پسندی کی تسکین حاصل کی ہے اور اسی طرح مولانا کی نازک مزاجی اور انتہا درجے کی نفاست پسندی کو وہ خوش ذوقی قرار دیتے ہوئے اسے ہر اعزاز سے برتر قرار دیتے ہیں۔ اگر خود قاضی صاحب کے مزاج میں یہ اوصاف نہ ہوتے تو وہ مولانا کو سراہنا تو درکنار ان کی سوانح حیات پر ایسے دشوار زمانے کے دو سال صرف نہ کرتے۔ قاضی صاحب کے مزاج میں بھی بڑی ضد تھی۔ میں نے اس کے کئی کرشمے دیکھے ہیں۔ یہ ضد ہی تو اور کیا تھا کہ ایک بار علی گڑھ سے نکلنے کے بعد دوبارہ وہاں داخلہ نہیں لیا۔ حیدرآباد کا ہی واقعہ لیجئے وہاں نہ ملازمت حاصل کرنے کے خیال سے گئے تھے اس کی کوشش بھی کی لیکن جب صورت بن گئی تو دربار کے طور طریقوں میں سے ایک بات بلکہ ایک شرط انہیں ناپسند ہوئی اور انہوں نے ملازمت کا خیال ترک کر کے اپنا پرچہ "پیام" نکالا۔ "پیام" کی چودہ برس ادارت کی اور اسی ادارت کے دوران کڑی کمان کے تیر کی طرح اکڑے رہے۔ ایک بار انہوں نے اعلیٰ حضرت کا "کلام بلاغت نظام" اس بات پر اٹھا کر پھینک دیا کہ چوبداروں کی خواہش تھی کہ قاضی صاحب اڈیٹر کی میز سے اٹھ کر اس کی تعظیم بجا لائیں اور ایک بار بھرے دربار سے اٹھ کر چلے آئے کیونکہ حیدرآباد کے اخبار نویسوں کو آگے کی صفوں میں باعزت جگہ نہیں دی گئی تھی۔

قاضی صاحب کی یہ نازک مزاجی ان کے لباس میں کھانے پینے میں اور رہنے سہنے میں بھی نمایاں نظر آتی تھی پینے کی چیزوں میں بھی وہ اعلیٰ قسم پسند کرتے تھے مثلاً سگریٹ اُن کا اور مولانا کا ایک ہی تھا۔ "کریون اے"۔

روزمرہ کے معمولات میں یہ نفاست پسندی اور نازک مزاجی اور انفرادیت پسندی ایک ایسی رچی بسی کیفیت تھی جو خوشحال گھر کے ماحول میں پروان اور پھر اونچی ڈیوڑھی کے دوستوں اور بزرگوں میں پروان چڑھی تھی جس کے لیے انہیں کوئی جدوجہد نہیں کرنی پڑی تھی چنانچہ وہ ان کے مزاج کے خاصے کی طرح خود تحریر میں بھی سما گئی۔ صرف ادبی تحریروں میں نہیں بلکہ اخباری قلم کاریوں میں بھی ان کا اڈیٹوریل لب و لہجہ کے اعتبار سے ان کا "نشتر" رہا ہے۔ (مزاحیہ کالم) "دنی ملی" مسکراہٹ کے لحاظ سے منفرد رہا اور صاف نظر آتا تھا کہ صاحب قلم کوئی ایسا شخص ہے جو سر بازار یا ٹرک یا ریلوے کے اندیشے سے بھی اپنی رفتار کو تیز کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا اور محفل کے جوش عقیدت میں بھی سید ھا کھولے ڈالے بیٹھ کر لیٹ نہ ہوگا نہیں سے ان کی وہ مناسبت ہم پر آشکار ہوتی ہے جس نے محمد علی یا شوکت علی کو چھوڑ کر حکیم اجمل خاں کی رفاقت اختیار کرنے کی راہ انہیں دکھائی اور خود دو بزرگ ساتھیوں کی رفاقت بعد میں "جانِ اجمل" کا قالب اختیار کر گئی۔

بالکل مختلف قسم کی شخصیتوں کی طرح خصوصیات میں خود کو کھو کر جس طرح قاضی صاحب نے سوانح حیات لکھی ہے حالی اور شبلی سے ممکن نہ تھا کیونکہ حالی سرسید کے مشن کے شریک تھے ان کے رجحانات اور تعصب کے شریک نہیں شبلی کے آئیڈیل کردار ان کی آنکھوں کے آگے نہیں رہے اعتقادات و تصورات کی دنیا میں آباد تھے۔ البتہ اس اصول سے قاضی عبدالغفار کی سوانح نگاری کو مثالیت تسلیم کی جا سکتی ہے جو معقول بھی ہے اور بہتر گر بھی

آزادی پسند، نفاست پسند اور مزاج میں رچی ہوئی اس درد مند طبیعت کو اگر پہلی ہی چوٹ میں کھل کھیلنے کا موقع ملتا تو عجب نہیں چند سال گزرنے کے باوجود قاضی صاحب بھی عوام کی صفوں سے بالا بالا ہی گزر رہے تھے اور پارسائی کا ملمع ان کے لیے اس قدر ضروری نہ تھا، جتنا عوامی لیڈروں کے لیے یا پولر شخصیتوں کے لیے ہوتا ہے کہ عام طور پر سماج جس بات کو کھلے عام کرنے کی اجازت نہیں دیتا اس سے پرہیز کیا جائے یا غلطی پہ پیر ممکن نہ ہو تو عیب چھپا کر ہی سلا لیا جائے۔ انہوں نے رندی بھی کی، سرمستی بھی، لیکن اسی حد میں کہ نفاست پسند طبیعت پر بار نہ گزرے

لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری

ان دونوں کتابوں کے نقوش اسی عہد میں تیار ہوئے جس کے متعلق وہ ازلی
رد کیا گیا ہے۔ سعدی و حافظ از عہد شباب ازلی

حیرت نہ کرنی چاہیئے کہ قاضی صاحب کو "لیلیٰ کے خطوط" سے اتنی شہرت حاصل ہوئی اور ایسی کتاب کا پہلا ایڈیشن نکلے ... ۲۲، ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ آج ۲۲ برس گزر گئے لیکن یہ تصنیف آج بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے اور قاضی صاحب کے نام سے ایسی نسبت ہو گئی ہے کہ مصنف و تصنیف ہی ایک ہو گئے ہیں ... حقیقت میں ... لیلیٰ کے خطوط سے پہلے (LETTERS FORM UNKNOWN WOMAN) مقبولیت حاصل کر چکی تھی۔ دو عورت نہیں جو اسے پڑھ کر ہی۔ "لیلیٰ کے خطوط"، لکھنے کی تحریک ہوئی ہو، اس تصنیف کی اہمیت یوں بھی کم ہو جاتی ہے لیکن اس کی تازگی اور کشش میں فرق نہیں آیا ہے کہ اس کی زبان بیان میں اتنا لوچ ہے کہ سارے انداز بردار دوں میں اُمرا و جان ادا کے مصنف سے پہلے کسی نے طوائف کے منہ میں زبان ہی نہ رکھی تھی جو نہ بھی ابھی بتا سکتی رکھی میں جو کچھ آگیا تھا وہ بھی کم طوائف کی ولادت اور دوری کے لیے "لیلیٰ کے خطوط" دوسری تصنیف تھی جس میں ایک خوش مذاق، جہاندیدہ، متوازن، معاملہ فہم اور مظلوم طوائف کھل کر آئی۔ یہ محبوبہ آشنا نہیں تھا، ہمارے دبے ہوئے گھٹے ہوئے جوان مردوں اور عورتوں کے لیے سہی، لطف اٹھانے، سمجھنے اور رکھانے کا ایک سرمایہ تھا جبکہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ اڑی۔ پھر یہ کہ کسی اتنے بڑے افسانے لوں ہی انگلی تحو لیقتی نہیں کھینچا تھا بلکہ لطافت اور مختلف کیفیات اس انداز سے بیان کی گئی تھیں کہ اس زور و شوق، حالانکہ گذری بیان کر سکتا تھا ایسی بیان میں واقعے کی اصلیت کا رنگ دونوں کتابوں بلکہ کہیں کہیں تو سوچ رنگ دینا ہوتا

" تم نے کل ایک نوجوان سرہ آغا کو میرے گھر بیٹھے دیکھا ہوگا کچھ دنوں پہلے یہ میرا ایک سخت مرض کے دورے میں مبتلا تھے ان کو گمان یہ تھا کہ میں انھیں چاہتی ہوں میں نے ہزار کوشش کی کہ یہ خیال ان کے دل سے نکل جائے مگر وہ یہ سمجھتے رہے کہ میں ان پر مرتی رہی ہوں مگر اپنی نسوانی شرم و حیا کے باعث ان سے اظہار محبت نہیں کر سکتی۔ کچھ عجب نہیں وہ شاید منتظر تھے کہ کسی دن میں بے تاب ہو کر ان کے قدموں پر سر رکھ دوں گی۔ میری کج ادائیوں کو وہ عشق کی پردہ داری سمجھتے رہے مگر ان کا آئینہ اس دن سے ہے جس دن تم نے پارک میں مجھے ان کے ساتھ دیکھا تھا پیلی سب کی قیمت سے زیادہ بھی بڑے بڑے سودے کرتی ہوں۔ اس شب کو نے چارے بہت انداز کے ساتھ میری خواب گاہ میں تشریف لائے ان کے بار داد کو دیکھ کر میں اپنا بار داد بھول گئی عجب نہ کہ جب پہلے میں نے اس منہ کو بار بار اپنی سینڈلیوں اور ساڑیوں کی گولائی اور جسم کے تناسب کا مظاہرہ کرنے کی کوششوں میں سب ساز و سامان صائع فرما جاتے اس کے کہ مجھ سے اقدام رندانہ فرمائے اس کے موقع پہ کہیں ان سے یہ اقدام رندانہ کر دوں مگر کب سب ہی مشتاق تھا۔ انداز میں میرے پیچھے پر کبھی جاتے بیٹھے رہے "

لیلیٰ کے خطوط فرضی ہونے کے باوجود فرضی ہونے کی جعلی نہیں کھاتے اور ان کے پڑھنے سے کوئی زاویے زیادہ نہیں تاہم انہیں "بازاری" کے لوچ کی سیر کر سکتا ہے۔ یہی ایک راز ہے اُن کی عام مقبولیت کا پھر ان میں عورت کی مظلوم روح کی پکار بھی ہے اور اپنی شفقت سے کنارے والی عورت کی بے کسی اور بے بسی بھی کسی دوسری عورت کے کردار سے جو الفاظ نہ رکھا نہ نہیں کہلوائے جا سکتے تھے وہ لیلیٰ نے کہہ دیئے پڑھنے والے اسی کی زبانی سن بھی سکتے تھے اور ایک نہایت اہم راز جو قاضی صاحب کا طرز تحریر ہے اگر ان کی کوئی دوسری تصنیف باقی نہ رہی تب بھی یہ دو چھوٹی چھوٹی کتابیں انھیں صاحب طرز ادیب منوالیتیں وہ طرز جو رازے اور گردش کے ساتھ رو۔ دشوار سے سہل کی طرف عبارت آرائی سے سادگی کی جانب اور شوخی سے

مذاہب اور منطقیت کی طرف سفر کر رہا ہے

مجنوں کی ڈائری

کو "لیلیٰ کے خطوط" سے وہی نسبت ہے جو "شکوہ" سے "جوابِ شکوہ" کو۔ تصور میں نہیں آسکتا کہ کوئی ایسا شخص۔ روزنامچہ مرتب کر سکتا تھا جس کا اپنا روزنامچہ اخباری اور سیاسی مصروفیتوں سے پٹا پڑا ہو۔ پیرس میں کچھ عرصہ قاضی صاحب کو طوائفوں کی صحبت میسر آگئی تھی پھر واپس آئے تو بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ۲۶ برس تنہائی کی زندگی تھی۔ فارغ البالی تھی۔ سوسائٹی کے چیدہ اور نہایت کھرے طرف، صاحب اثر لوگوں میں شمار ہوتے تھے اونچے مکانوں کی تعطیلات پر اور ان کی نظر دور دور تک پڑتی رہی رقص اور موسیقی کا ذوق تھا ہی، اسمبد باز کواک اور ماریا۔ ہوا چنانچہ درایام جوانی "جہان کرا تقدودانی" سے گزر گئے ۱۹۲۹ء میں دوسری شادی تک دن روزِ عید اور رات شبِ برات کی طرح گزار۔ اور یہیں کے نقوش سے اوّل "لیلیٰ کے خطوط" اور پھر "مجنوں کی ڈائری" کے لیے آب و رنگ حاصل کیا

"الستر کا زہ جوہر لطیف وہ رقت۔ محبت۔ ہر عیاش اور رند کے قلب میں موجود ہے اور عورت سے عورت منتقل ہوتی رہتی ہے یعنی ہر عورت جو اس عاشق کے آغوش میں آتی ہے ایک ستر یا چند روز کے لیے اس رقت کی حامل رہتی ہے پھر جب رند کسی دوسری عورت کی طرف مائل ہوتا ہے تو وہ رقت بھی اسی طرح منتقل ہو جاتی ہے اور اسی طرح منتقل ہوتی رہتی ہے عورت سے عورت منزلیں طے کرتی ہوئی وہ رقت آخر اس عورت تک پہنچتی ہے جو اس کی مقصود ہے اور وہیں مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے"

"عورت اور مرد کی یک جائی کا لطف سر سے سر کی بالوں اور دلچسپ گفت و شنید میں ہے جسم کی کشش تو تعیش کا محض ایک جزو ہے۔ نہیں کہ ان نانبائی کی دکان پر دو چپاتی روٹیاں جس طرح حلق سے اتاریں دو گھونٹ پانی پیا اور ڈکار لیتے ہوئے چل نکلے۔ عیش کی لازمی شرط اطمینان اور فرصت ہے عیش پسند کھانا کھاتے ہیں تو دو گھنٹے آہستہ آہستہ منہ چلاتے ہیں تاکہ ہر لقمے کے پورے مزے سے ان کی زبان لطف اندوز ہو جائے اور ہر کھانے کے آب و نمک سے ان کے نفس کو زیادہ سے زیادہ ممکن وقت تک مسرور رہنے کا موقع ملے۔ عورت کی مجلس آرائی کا مسئلہ بھی ہم لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ نفس کا کیف شراب کے نشے کی طرح دیر تک قائم رہے"

قاضی صاحب نے اگرچہ ان دونوں کتابوں کے دیباچے میں اپنے مقصد کی وضاحت کر دی ہے کہ اس سے وہ جو اسدہ روحوں کو جھنجھوڑنا اور نوجوانوں کو بے لوث عشق پرستی کے جال اور کثافت سے بچانا چاہتے ہیں۔ یہ مقصد کہاں تک پورا ہوا اس سے ہمیں غرض نہیں لیکن ان کے ذکر سے یہ عرض کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ یہ دونوں کتابیں قاضی صاحب کے رنگین طرزِ بیان کا ایک نیا انداز ہیں اور جذبات کے دروں حسن و موسیقی کے ایسے شہد گواہ ہیں جن سے نوجوانوں، بڑے بوڑھوں اور پردہ نشینوں کی کافی بڑی تعداد نے آنکھیں سینکی ہیں کہ باقی تصانیف مجموعی طور پر بھی اتنی مقبول نہیں کی گئی ہیں۔ کن میں جن پر قاضی صاحب کا نام بحیثیت مصنف چھپا ہے مثلاً "تین پیسے کی چھوکری"، "اس نے کہا"، "سیب کا درخت" وغیرہ اس میں قاضی صاحب کا حصہ بہت کم ہے۔ ہونے کے برابر

تھی اور ایسے بہت مسودے پڑے ہیں جن کی اشاعت کا وہ اخباری اور تنظیمی مصروفیتوں کی وجہ سے انتظام نہ کر سکے لیکن صبح و شام کی ہمہ گو مشغولیت سے وقت چرا کر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ ان کے پاکیزہ ذوق، بھرپور زندگی، روشن خیالی اور جدید اسلوب کے ساتھ بیٹھے ہوئے اُفق کا ایک لطیف شاہکار تخصصوں کے خصوصیات سے اعدو الفاظ ہے۔ اور ان سب کے پیچھے ایسے طرزِ بیان کا نمونہ ہے جس میں شگفتگی بھی ہے، سلاست بھی اور بلا سادہ پرکاری، آن، بھی جس کا کوئی خاص نام نہیں مگر جس کے متعلق ایک شاعر کہہ گئے ہیں۔

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد
بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اُن کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ غیر معمولی آدمی نہیں تھے لیکن غیر معمولی قدر و قیمت کے کارنامے انجام دے کر رخصت ہوئے۔ اس کا فخر ہیں۔

اسلوب احمد انصاری

سرسید کی تعلیمی تحریک

سرسید ایک دیو پیکر انسان تھے۔ وہ ایک عہد آفریں دور میں پیدا ہوئے۔ وہ جس دور میں پیدا ہوئے۔ اس دور کی علامت بھی تھے۔ اور اس کے تقاضوں اور مطالبوں سے دست و گریباں ہونے کا حوصلہ اور استعداد بھی رکھتے تھے۔ ان کا زمانہ بڑا ہی تلاطم اور ابتری کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں کی سطوت و شوکت کی تباہی اور بربادی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اور اس کے اثرات کو اپنی شخصیت کی رگ رگ میں محسوس کیا تھا وہ ایک ذہن فعال اور قلب تپاں، ایک دیدۂ بیدار رکھتے تھے۔ وہ حالات سے شکست کھا کر عمل سے گریز کرنے والے نہ تھے۔ وہ تصوف میں اپنے ذہن کی بے قراری اور روح کی شکستگی اور اضطراب کو نہیں ڈبو سکتے تھے۔ تعمیری جدوجہد اور پیہم عمل کے وہ ایسے علمبردار تھے۔ جس سے کام لے کر وہ ناسازگار حالات پر فتح پانے اور اس کی تشکیل نو اپنے وجدان اور اپنی بصیرت کے مطابق کرنا چاہتے تھے۔ دوررس فراست، بیدار قوت فیصلہ، مغربی انداز فکر اور مسلسل سعی و عمل نے انہیں جدید دور کی عقلیت کے وہ امام تھے۔ اور اسی کی رہنمائی میں وہ اپنے ماحول کو پرکھنا، ماضی کو اجاگر کرنا اور مستقبل کی بنیادوں کو استوار کرنا چاہتے تھے۔ آج ہم اپنے گرد و پیش علم و فضل کا جو چرچا دیکھ رہے ہیں، وہ سرسید ہی کی سعی کا فیضان ہے۔ انہوں نے ادب اور معاشرت کے تمام گوشوں میں جوش حیات دوڑا دیا۔ سرسید ہی نے سب سے پہلے اس شعلہ کو روشن کیا جس سے بعد میں حالی، شبلی، محمد علی اور اقبال نے اپنی محفلوں کو جگمگایا۔ ماضی کے خاکستر میں یہی چنگاری تھی، جس نے مستقبل کی تیرہ و تار راہوں میں امیدوں اور آرزوؤں، ولولوں اور حوصلوں کی شمع کو فروزاں کیا۔ سرسید کی زندگی اور کارناموں کے مطالعہ کے بعد سب سے زیادہ ان مٹ نقش جو ذہن پر قائم ہوتا ہے۔ وہ ان کے [illegible] اور خلوص بے پایاں کا نقش ہے۔

سرسید کی شخصیت میں وزن و وقار اور ان کے منصوبوں میں آہنی قوت تھی۔ انہوں نے ہر کام بڑے پیمانہ پر کیا اور اس میں کمال و انہماک کی حدوں کو چھو لیا۔ ان کی مصروفیتوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کی اصلاح کو ضروری قرار دیا۔ اور قرآن پاک کی ایک نئی تفسیر لکھی "آثار الصنادید" کا پہلا ایڈیشن مولانا صہبائی کے اشتراک سے ضبط تحریر میں آیا۔ "دربار اکبری" کی تصحیح کی، مسلمانوں کو ہنگامۂ غدر کے الزام سے بے قصور ثابت کرنے کے لیے "اسباب بغاوت ہند" اور دوسرے رسائل لکھے۔ مسلمانوں میں علم و تہذیب و ادب کا صحیح اور سچا ذوق پیدا کرنے کے لیے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا، اور علوم کی ترویج و اشاعت اور ان کا اعلیٰ معیار قائم کرنے کے لیے سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ بے شمار مضامین مسلمانوں کے معاشرتی، تعلیمی، سیاسی اور مذہبی خیالات کی اصلاح کے سلسلہ میں لکھے اور چھپوائے۔ ان سب کارناموں کے پیچھے جو جذبہ کام کر رہا ہے، وہ قومی فلاح و بہبود کا جذبہ ہے اور جو طریقہ عمل انہوں نے اختیار کیا ہے۔ وہ خالص استدلالی ہے۔ بے لاگ اور معروضی تنقید سرسید کی تمام تحریروں کی خاص وصف ہے سائنٹفک نقطہ نظر اور علمی تلاش و تحقیق کی اس لگن سے پیدا ہوئی ہے۔

جو سر سید کے اندر رچی ہوئی تھی۔ سر سید کے تمام مشاغل اور اعمال کے محرکات دو ہیں۔ اوّل اپنی قوم کو ذہنی، اخلاقی اور تعلیمی پستی سے نکال کر علم و تہذیب و ثقافت کی بلندیوں پر سرفراز کرنے کی امنگ، اور دوسرے صداقت کی جستجو اور اس کا اعلان، اور اس جستجو میں دیانت داری کے ساتھ ان تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانا، جن سے وہ بہرہ مند تھے۔

یہ امر بے شبہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ سر سید ایک بلند پایہ مفکر اور مجتہد تھے۔ انہوں نے اپنے علم، اپنی بصیرت اور اپنی قوت عمل سے نہ صرف ہم عصری میلانات اور تحریکات کا رخ موڑ دیا، بلکہ ہماری آج کی زندگی کی داغ بیل بھی انہی کے ہاتھوں پڑی۔ اور اس پر انہی کے افکار و اعمال کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے زمانہ سے آگے دیکھ سکتے تھے۔ تاہم سر سید کی تعلیمی تحریک کے جو اثرات بعد میں مرتب ہوئے۔ ان کا جب ہم تجزیہ کرتے ہیں تو زمانہ حال کے معیاروں کے مطابق ہمیں اس میں بعض بنیادی خامیاں نظر آتی ہیں۔ جن مخصوص حالات میں رہ کر سر سید نے اپنی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اور جن خارجی موثرات نے ان کے نتائج کو متعین کیا تھا ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ ان حالات اور موثرات کے پیش نظر سر سید کے نتائج ایک حد تک ناگزیر اور مبرم تھے اور ان کے معاصرین وہاں تک بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جہاں تک کہ سر سید کی نظر پہنچ گئی تھی۔ سر سید کی تعلیمی اصلاح کی تحریک دراصل ایک ضمیمہ تھی، ان کی مذہبی تحریک کا۔ سر سید کا یہ خیال تھا۔ کہ اسلام ایک زندہ اور موثر قوت کی حیثیت سے اسی وقت برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ جب کہ اس کی تعبیر و تفسیر، جدید علوم کی روشنی میں اور سائنٹفک نقطہ نظر کے مطابق پیش کی جائے۔ سر سید اسلام کو عقائد کا طومار اور کرامات کی پھلجڑی نہیں سمجھتے تھے بلکہ زندگی کا ایک نامیاتی ضابطہ فکر و عمل کا ایک متوازی فلسفہ اور سماجی معاشی اور سیاسی زندگی کا ایک اعلیٰ نصب العین۔ اسلام کا نظریہ عقل سلیم کے موافق تھا۔ اور اس کی تاویل کے نتائج صحت مند اور دیرپا ثابت ہوئے۔ اگر سر سید تجدید اور اجتہاد کے جوش میں نقطۂ اعتدال سے متجاوز نہ ہو جاتے، اور بعض غیر ضروری فقہی موشگافیوں کو رد کرنے کے ساتھ ہی ان بنیادی معتقدات پر کاری ضرب نہ لگاتے، جو اسلام کا مغز اور اس کی روح ہیں۔ اسی سبب سے علماء اور فضلاء کا ایک بڑا گروہ، جن میں مولوی امداد علی اور مولوی علی بخش کے نام قابل ذکر ہیں۔ سر سید کا شدت سے مخالف ہو گیا۔

یہی صورت تعلیم کے میدان میں پیش آئی۔ سر سید ہندوستان میں نئے حالات کا اندازہ لگانے اور مغربی قوتوں کی برتری سے متاثر ہونے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ گئے تھے کہ مسلمانوں کی شکست خوردہ اور مضمحل و منتشر قوتوں کی شیرازہ بندی اور نئے سماج میں اُن کے مرتبہ کی ضمانت انگریزی تعلیم ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ حکومت اور سیاست میں مسلمانوں کو ان کے صحیح اور جائز منصب پر سرفراز کرنے اور یہاں کی ذہنی اور عملی زندگی میں اپنا مخصوص وظیفہ ادا کرنے کا وسیلہ انہیں یہی نظر آتا تھا۔ کہ مسلمان انگریزی زبان کے ذریعہ مغربی علوم و فنون کا اکتساب کریں۔ کیوں کہ انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ آنے والی جنگ میں پرانے رنگ آلودہ آلات حرب سے کام نہیں چلے گا۔ اس لیے جب انہیں معلوم ہوا کہ حکومت ہند بنارس میں سنسکرت کالج اور لاہور اور الہ آباد میں اورینٹل کالج قائم کرنا چاہتی ہے۔ اور اس کی از بس کوشش ہے کہ ہندوستان کے مفاد کے پیش نظر مشرقی علوم کی حفاظت اور سرپرستی کی جائے تو انہوں نے اس تجویز کے خلاف مدلل اور پرجوش مضامین لکھے۔

سر سید کی ان مساعی کے دو مفید نتائج ضرور برآمد ہوئے۔ اول تو یہ کہ ملک کی عام تعلیمی اور تہذیبی دوڑ میں مسلمان اس قدر پیچھے نہیں رہے، جیسے کہ سر سید کی تحریک کی غیر موجودگی میں غالباً رہتے، اور دوسرے یہ کہ

حکومت کی انتظامی مشین میں مسلمان بھی ایک کارآمد پرزہ کی حیثیت سے شامل ہو گئے۔ مگر اس کے پہلو بہ پہلو دو منفی نتائج بھی سامنے آئے۔ اول تو یہ کہ سرسید مشرقیت اور مغربیت یا مذہب اور سائنس کا جو پیوند علی گڑھ میں لگانا چاہتے تھے، وہ نہ لگ سکا، اور دوسرے یہ کہ اس نئی مغربی تعلیم نے، جو ماضی کی روایات سے گہرے طور پر مربوط نہیں تھی، پڑھے لکھے لوگوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جن کی نظر اوچھی، جن کا علم سطحی، اور جن کی فہم ناقص تھی، اور جو مشرق اور مغرب، دونوں کی روح اور روایات سے یکسر ناواقف اور بیگانہ محض تھے۔

اس معاملہ میں اکبر سرسید سے زیادہ حقیقت بین واقع ہوئے تھے۔ باوجود اس کے کہ اکبر نے مغربی تہذیب اور علوم پر جو تنقیدیں اپنے اشعار میں کی ہیں، وہ حد درجہ انتہائی ہیں، اور وہ اپنے خول میں جس طرح گرفتار رہنا چاہتے ہیں، مشرقیت کو جس طرح گلے سے چمٹائے رکھتے ہیں، اور نئی تحریکوں، نئے میلانات اور نئے اسالیب فکر سے جس طرح بدکتے ہیں، وہ بیک وقت مضحکہ خیز بھی ہے، اور اس سے ان کے فکر و فہم کے افلاس کا بھی پتہ چلتا ہے، لیکن اس کے ماننے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ سرسید کی اصلاحی تحریک کے جو نتائج مغرب و مشرق کے ادھورے اور ناپختہ امتزاج سے مرتب ہوئے، انہیں اکبر کی نظر نے پہلے ہی تاڑ لیا تھا۔ اور اسی لیے وہ عرصہ دراز تک سرسید کے سخت ترین مخالف رہے اور یہ بھی بڑی حد تک درست ہے کہ اکبر کی طنز و ظرافت کے تیر اور تیکھے نشتروں نے سرسید کی تحریک کے لیے ایک متوازن کر دینے والی قوت کا کام کیا۔ علی گڑھ کی بعد کی نسلوں میں نئے علوم کو جذب و قبول کے ساتھ، قومی اور ملی روایات کے تحفظ و احترام اور جدید و قدیم علوم، معاشرت، ادب اور فن کی خوشگوار اور صحت مند آمیزش کا جو جذبہ نظر آتا ہے۔ اس کا سہرا قطع نظر سیاسی رہنماؤں کی سرگرمیوں اور جانفشانیوں کے، ایک حد تک اکبر اور بڑی حد تک اقبال کے سر ہے۔

سرسید کے بے پناہ خلوص میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔ ان کی علمی ذکاوت و بصیرت بھی کم درجہ کی نہیں تھی۔ مگر سرسید ایک طرف تو غدر کے بعد مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کے اضمحلال اور انتشار سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اور دوسری جانب اہل یورپ نے علوم و فنون میں جو حیرت انگیز ترقی کی ہے، اس سے ان کی آنکھیں اس درجہ خیرہ ہو گئیں تھیں۔ کہ انہیں اپنا پورا سرمایہ حقیر نظر آنے لگا تھا۔ سرسید نے انگلستان سے احباب کے نام جو خط لکھے تھے، وہ ان کے اس ذہن کا آئینہ ہیں، جس پر مغرب کی برتری کا شعور مستولی تھا۔ سرسید کا اندازہ اس حد تک تو صحیح تھا کہ مسلمانوں میں ذہنی بیداری پھیلانے اور حکومت میں ان کے عمل دخل کو یقینی طور پر بروئے کار لانے کے لئے انگریزی زبان اور علوم کی تحصیل لازمی تھی۔ لیکن سرسید اس خاص دور کی تاریخ کے تقاضوں کی وجہ سے اس نکتہ کو فراموش کر گئے کہ اصلی اور دیرپا ذہنی بیداری کے سرچشمے مغربی علوم کی تحصیل سے اسی وقت پھوٹ سکتے ہیں۔ جبکہ اس کا گہرا رشتہ قوم کی ثقافت، اس کی تاریخ اور روایات۔ اور علوم و فنون کے کلاسیکل سرمایہ سے جوڑا جائے، ورنہ نتائج میں وہی سطحیت خامی اور ناپختگی باقی رہے گی، جو اسی صورت میں ناگزیر ہے۔ یہی وہ بنیادی حقیقت تھی، جسے اقبال کی عارفانہ بصیرت اور ژرف نگاہی نے پایا اور بے نقاب کیا اور میری رائے میں مسلمانوں کی ذہنی، اخلاقی اور روحانی زندگی کی نشو و نما پر جیسے انقلاب آفریں اور دیرپا اثرات اقبال کے کلام نے چھوڑے ہیں، کسی اور ادیب رہنما یا مصلح کے خیالات نے نہیں چھوڑے۔ علی گڑھ تحریک کی بنیادیں جو کچی تھیں، وہ برابر اپنا رنگ دکھاتی رہیں اس کے ردعمل کے طور پر شبلی اور مولانا محمد علی اور ان کے رفیقوں نے ندوہ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کی۔ یہ دونوں بزرگ اقبال سے جس حد تک متاثر تھے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ لیکن اب زندگی نے ارتقاء کے میدان میں ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اور اب مشرق اور مغرب کے درمیان وہ تصادم، امتیاز اور دوئی باقی نہیں رہی ہے جس پر پہلے زور دینا ضروری سمجھا جاتا تھا

وارث علوی

فلابیر اور مادام بواری

(۱)

حسن عسکری کے ہاتھوں فرانسیسی ادب کے دو عہد ساز شاہکار اردو ادب میں منتقل ہوئے ہیں۔ ایک فلابیر کا ناول مادام بواری دوسرا ستاں دال کا ناول سرخ و سیاہ۔

مادام بواری کی مقبولیت اور شہرت فرانسیسی ادب تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ تمام یورپی ادب پر اس ناول نے گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ فلابیر کے زمانے سے لے کر آج تک اس ناول کی مقبولیت میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اور ہر نسل نے مادام بواری میں زندگی کی ایک نئی معنویت کی جستجو کی ہے۔ اس بے پناہ حقیقت نگاری۔ دلآویز انداز بیان، اور بے مثال کردار نگاری کی بنا پر یہ ناول عالمی ادب کا انتہائی درجہ پر کشش شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن ناول کی فنی جامعیت سے قطع نظر رومانی اور کلاسیکی تصورات کی جو کشمکش اس ناول میں جھلکتی ہے۔ وہ آج تک فرانسیسی نقادوں اور دنیا کے مفکروں کو دعوت فکر و نظر دیتی رہی ہے۔ اردو ادب میں ناول کی اس تنگی کے پیش نظر براہ راست فرانسیسی سے ان ناولوں کا ترجمہ اور وہ بھی اس شخص کے ذریعہ جسے فرانسیسی ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔ اردو تراجم کی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسز کانسٹنٹ گارنٹ نے روس کے کلاسیکی ادب کے اہم نمائندوں خصوصاً طالسطائی۔ دستاوسکی، چیخوف وغیرہ کو اپنے تراجم کے ذریعہ انگلستان کو روشناس کرایا تو ان تراجم نے انگریزی فکر و نظر کو اتنا ہی متاثر کیا تھا جتنا کسی زمانے میں پلوٹارک کے تراجم نے کیا تھا۔ اردو میں فلابیر، ستاں دال، مارسل پروست یا تالستائی اور دوسرے فرانسیسی فنکاروں کی تخلیقات کو روشناس کرا کے حسن عسکری نے نئے دریچے ہم پر کھول دیئے ہیں۔ ان تراجم کے اثرات اردو ادب میں کیا ہوں گے اس کی پیشین گوئی ممکن نہیں۔ لیکن یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس سے پہلی بار مغربی ادب کے بڑے ناولوں کا مطالعہ ہماری ادبی بصیرت میں گہرائی اور وسعت اور رنگینی پیدا کر سکے گا۔ یہ تراجم ہمارے مروجہ تصورات میں ایک اہم انقلاب کا موجب ہو سکتے ہیں۔ زیر نظر مقالہ فلابیر کی شخصیت اس کے آرٹ اور مادام بواری کی خصوصیات کو سمجھنے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے۔ یہاں یاد دلانا ضروری ہے جو یہ بات بودلیئر نے فلابیر کے متعلق کہی ہے کہ اس کی زندگی میں ایک بھی ایسی چیز نہیں جو اس کی زندگی کے بے پناہ ملال کو دور کر سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی بھانجی کے علاوہ کوئی ایسی چیز اس کی زندگی میں نہیں جو اس کی زندگی کے بے پناہ ملال کو دور کر سکتی۔ زندگی کے کچھ خوشگوار لمحے اس کی عمر روزگار میں گزرے۔ ایک دو سفر بھی اس نے کیے۔ دو ایک کروکس سے اسے محبت تھی۔ زندگی کے کچھ خوشگوار لمحے اس کی زندگی میں آئے۔ اس کے دوستوں کی صحبت سے بھی وہ لطف اندوز ہوا۔ اور ایک ادیب کامیاب اور ناکام معاشقے بھی اس کی زندگی میں آئے۔ لیکن مجموعی طور پر زندگی کے ہنگاموں سے کنارہ کش ہو گیا۔ اور وہ بھرپور زندگی نہیں گزار سکا۔ عین عالم شباب میں فلابیر زندگی کے ہنگاموں سے کنارہ کش ہو گیا۔ وہ بچپن ہی سے بہت حساس، مدماغی اور تنہائی پسند واقع ہوا تھا۔ باوجود اس کے کہ اس کا باپ ایک کامیاب ڈاکٹر تھا۔ فلابیر کو متوسط طبقہ کا وہ تمام آسائشیں میسر تھیں جو اس زمانہ میں کسی بھی متوسط طبقے کے فرد کے لئے باعث رشک ہو سکتی تھیں۔ فلابیر اپنی زندگی میں کسی چیز کی کمی محسوس کرنے لگا۔ اور روحانی تنہائی کی کرب ناک اذیت میں خود کو مبتلا پانے لگا۔ وہ ایک مکتب گیا۔ دس سال کا تھا تب اسکول میں داخل ہوا۔ اور بہت جلد ہی نوع انسان کے خلاف ایک بے پناہ بیزاری کے جذبے گھر کرنے لگے۔ بعد میں اس کی یہ روحانی تنہائی جسمانی تنہائی کی شکل اختیار کر گئی۔ اس کی تمام زندگی اپنے مطالعہ کے کمرے اور گرامر کے گرد گھومتی ہوئی ختم ہو گئی۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ آخر اتنی کم سنی کے عالم میں ہی فلابیر زندگی سے بیزار اور عام انسانوں سے متنفر کیوں ہو گیا۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا خوش شکل اور تندرست لڑکا تھا۔ پدرانہ شفقت اور مادرانہ محبت سے بھی محروم نہیں تھا۔ یہ قیاس کرنا شاید غلط نہ ہوگا کہ زندگی سے بیزاری کی سب سے بڑی وجہ اس کی رومانی طبیعت ہو سکتی ہے۔ فلابیر کے زمانہ میں رومانیت اپنے عروج پر تھی۔ خوابوں کی خوبصورت اور رنگین دنیا میں رہنے والے نوجوانوں کو حقیقی زندگی کی تلخی اور بے کیفی بہت کھلتی تھی۔ تو طبیعت کا تجسس تمام تھا۔ فلابیر کے ایک اہم مکتب کے مطابق اپنے سر کو بار بار دیوار سے ٹکرا دیتا تھا۔ اور ایک لڑکے نے تو انہی سے پیاسی کا کام لینے کی

زندگی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ فلابیر کی قنوطیت اور کلبیت اسی مریضانہ رومانیت کا نتیجہ تھیں۔ اس کے رومانی رجحانِ طبع کی آئینہ داری اس کے ابتدائی ناول بخوبی کرتے ہیں۔ فلابیر کی رومانی طبیعت نے جب اپنے ارد گرد کی کاروباری زندگی میں سوائے بے لطفی اور بے کیفی، ابتذال اور انتشار کے کچھ نہ پایا۔ تو جیسا کہ رومانی ذہن کا خاصہ ہے، اس نے حقیقی زندگی سے چشم پوشی کر لی اور اپنے وقت اور اپنی دنیا سے گریز کر کے خوابوں کی بستیاں آباد کیں۔ فلابیر نے مغرب سے بھاگ کر مشرق کی پراسرار زندگی اور حال سے گریز کر کے قرونِ سالفہ کی موہوم روحانی فضاؤں میں پناہ لی۔ مادام بواری اس کا پہلا ناول ہے جس میں اس نے عام زندگی کی تلخ حقیقتوں سے اپنا رشتہ قائم کیا اور رومانیت کو جو شکست اسے اپنی زندگی میں حاصل ہوئی تھی، اسے اور بھی شدت سے فلابیر نے اس ناول میں بیان کیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مادام بواری رومانی اندازِ نظر پر سب سے مہلک حملہ ہے اور اس ناول سے کلاسیکی تصورِ حیات کی تجدید ہوتی ہے۔

فلابیر کے رومانی ذہن نے حیات اور کائنات کے متعلق بڑے خوابناک اور رنگین تصورات قائم کئے تھے۔ لیکن ابھی بحرِ حیات میں اس کے خوابوں کا سفینہ کچھ دور چلنے بھی نہ پایا تھا کہ حقیقتوں کی سرد اور بے رنگ اور مہیب چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ رومانی ذہن بہک جاتا ہے۔ شوریدہ سر تمنائیں اس کا ساتھ بہت دور تک نہیں چلتے۔ ابھی فلابیر زندگی کو پھر پرانے طریقہ پر گزارنے بھی نہ پایا تھا کہ زندگی سے پھر پایا۔ زندگی جو پہلے ایک پراسرار الجھی ہوئی پہیلی سی لگتی تھی جس کو سلجھانا اس کے رومانی ذہن کے بس سے باہر تھا۔ وہ تو صرف بحیثیت فنکار کے زندگی کا ناظر بن سکتا تھا۔ چنانچہ زندگی اور زندگی کی غرض و غایت کے متعلق تمام نظریات اور تصورات اس کے نزدیک محض سطحی اور ناقابلِ التفات تھے۔ اپنے ایک خط میں وہ صاف پر جوش طریقہ پر لکھتا ہے۔ "کوئی بھی عظیم دماغ کسی آخری نتیجہ پر نہیں پہنچا۔ کوئی بھی عظیم کتاب کسی قطعی نتیجہ پر نہیں پہنچی کیونکہ نوعِ انسان ہمیشہ آگے بڑھتی رہی ہے اور کسی ایک منزل پر ٹھہر نہیں سکی۔ ہومر کسی نتیجہ پر نہیں پہنچا۔ نہ ہی شیکسپیئر نہ ہی گوئٹے اور نہ ہی انجیل۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ایسی اصطلاح "سماجی مسئلہ" سے انتہائی قلبی اذیت پہنچتی ہے۔ جو دور حل تلاش کر لیا جائے گا، انسانیت کا آخری دور ہوگا۔ زندگی ایک دائمی مسئلہ ہے۔ اسی طرح تاریخ اور دوسری ہر چیز"

فلابیر کے لئے روزمرہ کی بے رنگ زندگی کی سطحی تھکن، اکتا دینے والی کسالت اور بے کیفی تو ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کا رومانی ذہن جو ہمیشہ غیر معمولی باتوں کا متلاشی رہتا تھا، معمولی زندگی کو کیسے قبول کر لیتا۔ لیکن زندہ رہ کر زندگی کو رد بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔ بے اعتنائی برتی جا سکتی ہے۔ حقیقی زندگی کا استغراق صرف آرٹ ہی میں۔ جدت میں کر سکتا ہے۔ یہ تو صرف آرٹ ہی ہے جو زندگی کی بے ربطی میں ربط اور پراگندگی میں تنظیم پیدا کر سکتا ہے۔ آرٹ ہی ہے جو حقیقی زندگی کو قابلِ برداشت بناتا ہے۔ فلابیر نے ایک بھٹکے ہوئے راہرو کی طرح زندگی کے لق و دق صحرا میں فن کا چشمہ ڈھونڈ نکالا اور تمام زندگی اس چشمہ سے سیراب ہوتے ہوئے گزار دی۔ فلابیر نے آرٹ کو زندگی کا نعم البدل مان لیا۔ اس بے رنگ دنیا میں صرف آرٹ کی رنگا رنگ دنیا میں انسان زندہ رہ سکتا ہے۔ آرٹ فلابیر کے لئے وقت گزاری ہی کا نہیں زندگی گزارنے کا ذریعہ بن گیا۔ محض جمالیاتی تفریح کا آلہ نہیں بلکہ زندگی کا واحد مقصد بن گیا۔

آرٹ اور عظیم فنکاروں سے اس کا لگاؤ کس قدر شدید تھا، اور ان کے مطالعہ سے جذباتی طور پر وہ کتنا متاثر ہوتا تھا، اس کا اندازہ خطوط کی ان سطروں سے ہوتا ہے جن میں فلابیر نے مطالعہ کے دوران میں فنکار کے ساتھ شدید جذباتی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ "جب تم عظیم فنکاروں کو پڑھو تو ان کے طریقہ کار پر گرفت حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ان کی روح کے قریب پہنچنے کی کوشش کرو۔ اور جب تم مطالعہ ختم کر لو گے تو تمہارا چہرہ فرطِ مسرت سے جگمگا رہا ہوگا۔ اس وقت تم موسیٰ کے مانند نظر آؤ گے۔ جو کوہِ سینا سے اتر رہا ہو اور جس کا چہرہ آسمانی نور سے جگمگا رہا ہو۔ کیونکہ اس نے خداوند خدا کا مقدس جلوہ دیکھا ہے۔"

فلابیر نے عام حیات کی تلخی سے گھبرا کر اسے ٹھکرا دیا مگر باقی زندگی سے اس کی علیحدگی اور عام انسانوں سے اس کی بے نیازی فلابیر کے فن کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ فن تو راستہ ہے فن کے لئے آخر خام مواد تو زندگی ہی سے لیتا ہے۔ زندگی کی رہگذر پر چلتے ہوئے فنکار جن خارزاروں اور خیابانوں سے گزرتا ہے۔ مختلف قسم کے جن راہرووں سے دوچار ہوتا ہے وہ اس کے ذہن کو ان تجربات و مشاہدات سے بھر دیتے ہیں جن کے بغیر کسی اعلیٰ فن پارے کی تخلیق ممکن نہیں۔ تجربات اور مشاہدات کا یہی خام مواد ہوتا ہے جسے فنکار کا تخیل حسین و جمیل زندگی کے مرقع کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ مثال والٹر، بالزاک، ٹالسٹائی، ترگنیف، دستوئیفسکی وغیرہ فنکاروں کی زندگی کے متعلق کچھ نہیں تو ایک بات ضرور کہی جا سکتی ہے۔ انہوں نے زندگی کو بھرپور طریقہ پر گزارا۔ ان کے معاشقے، ان کی انقلابی سرگرمیاں، ان کی سیاسی سرگرمیاں اور بعد میں حکمرانوں کے ہاتھوں قوم کی جلاوطنی اور سزایابیاں۔ ان کی اور ایسی زندگی غم اور محنت ان کے شعر۔ غرض کہ یہ فنکار زندگی کے ان تمام ہنگاموں اور جھمیلوں سے گزرے اور تجربات اور مشاہدات کا ایک ذخیرہ ان کے ادبی حافظے نے فراہم کر لیا جس پر ان کا تخیل ہمیشہ بھروسہ کر سکتا تھا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ فنکار زندگی کی بازی میں ایک جواری کی طرح صرف ہارے

ماحیتن کے لئے شرکت کرے کھیل کے داؤ پیچ سیکھنے کے لئے نہیں۔

زندگی سے بھاگ کر فلابیر نے آرٹ میں پناہ لی۔ لیکن آرٹ کا بھی کوئی نہ کوئی موضوع تو ہوتا ہی ہے اور کم از کم ادب میں تو موضوع کو سماجی زندگی سے بالکل بے نیاز بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ فنکار زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ اپنے ارد گرد کی زندگی کو موضوع ادب بنانے کی بجائے اس زندگی کو جسے آرٹ کا موضوع بنائے جو زمانی اور مکانی حیثیت سے اس سے دور ہو اور جس پر زمانے کی فاصلے سے ایسی دھند بکھری ہو کہ اس کے تمام بدصورت اور بدنما پہلو اپنا کھردرا پن کھو بیٹھے ہوں۔ زمانۂ قدیم کی ہر شے ایک رومانی سہانا پن لئے ہوتی ہے۔ وقت کا بھی پردہ سحر ہے۔ کھردرے اور تیکھے نقوش میں بھی ایک طلائی گداز اور ملائمت پیدا کر دیتا ہے۔ فلابیر نے یہی کیا۔ زمانہ حال کی زندگی سے بھاگ کر عہد قدیم کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا۔ ایک خط میں اپنی زیر تصنیف ناول سلامبو کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ میں ایک ناول لکھ رہا ہوں جس کا پس منظر قبل مسیح کا زمانہ ہوگا۔ کیونکہ میں اس بات کی اشد ضرورت محسوس کر رہا ہوں کہ اپنے ارد گرد کی جابرانہ زندگی سے جس کی عکاسی میں میرا قلم عرصہ تک آلودہ رہا ہے فرار اختیار کر لوں۔ میں اس جدید دنیا کی آئینہ داری کرتے کرتے اس قدر تھک گیا ہوں کہ اس کی صرف ایک جھلک ہی میرے دل میں بے پناہ اکتاہٹ پیدا کر دیتی ہے۔

بورژوا ادبی زمانے کے ابتذال سے بیزار ہو کر فلابیر نے زمانہ قدیم کی رومان انگیز فضاؤں میں پناہ لی۔ زندگی سے گریز کر کے فلابیر نے آرٹ میں پناہ لی اور آرٹ کے میدان میں بھی وہ زندگی سے چھپنے کے لئے مختلف سمتوں میں بھاگتا رہا۔ اس نے کارتھیج کو از سر نو زندہ کیا لیکن عہد قدیم کی حرارت آور فضا میں بھی اس کی روح کی پیاس نہ بجھ سکی۔ زندگی کی ازلی ویرانی اور اداسی نے کارتھیج کی رومان انگیز فضاؤں میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ جس کی غمناک روح، یہاں بھی سکھا نہ ہو سکی۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے "بدبار کی افسردگی مجھے دور جدید کے لوگوں سے بھی زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ کوئی ہنگامہ نہیں۔ کوئی گہما گہمی نہیں۔ ایک سوچتے ہوئے چہرے کی سنجیدگی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔"

تنگ آ کر فلابیر موضوع ہی سے بیزار ہو گیا تھا۔ "آرٹ، آرٹ برائے آرٹ۔ بے نام بھوت جو جھک جھک کر ہمیں لبھاتا ہے اور ہمیں تباہی کی طرف لے جاتا ہے" موضوع کی جستجو سے گھبرا کر بالآخر اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ آرٹ کا کوئی موضوع ہوتا ہی نہیں۔ عظیم آرٹ تو صرف ہیئت سے پیدا ہوتا ہے۔ موضوع اور مواد کی بے رنگی صرف طرز بیان کی رنگا رنگی اور ہیئت کی چمک دمک سے دور ہو سکتی ہے۔ طرز بیان کی خاطر فلابیر کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے۔ ایک طویل داستان ہے۔ سخت ریاضت اور بے پناہ ذہنی مشقت کے بعد وہ صرف چند صفحات لکھ پاتا اور پھر بھی اپنے کئے سے مطمئن نہ ہوتا۔ کسی موزوں لفظ کی تلاش میں دیوانہ وار کمرے میں ٹہلتا۔ کبھی لکھے ہوئے جملوں کی موزونیت اور آہنگ کا اندازہ لگانے کے لئے باہر بالکنی میں آ کر انہیں بار بار باآواز بلند پڑھتا۔ کسی جملے کی نحوی ترکیب۔ جملے کا تناسب اور موزوں لفظ کی تلاش میں اس کی حوصلہ شکن صبر آزما جدوجہد کے پیش نظر سامرسٹ ماہم کا یہ خیال غلط نہیں ہے کہ شاید ہی کسی فنکار نے آرٹ کے لئے یہ روحانی کرب برداشت کیا ہو جو فلابیر نے کیا ہے۔ "کسی راہب نے عشق خداوندی میں دنیا کی مسرتوں کو اس طرح نہیں ٹھکرایا جس طرح فلابیر نے تخلیق فن کے جنون میں زندگی کی گوناگوں مسرتوں کو۔" آرٹ کے مقابلے میں اسے اپنی محبت بھی ہیچ نظر آنے لگی تھی۔ اپنی محبوبہ لوئی کولٹ کو وہ لکھتا ہے۔ "بہتر ہے کہ میری بجائے آرٹ سے محبت کرو۔" یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی مادام بواری فلابیر کی زندگی میں داخل ہوئی لوئی کولٹ کی مرکزی اہمیت ختم ہو گئی۔ فرانسس ماریاک نے کیا عمدہ بات کہی ہے کہ آرٹ جس نے دشمنوں کو قریب تر کر دیا تھا، چاہنے والوں کو بعید تر کر دیا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق فن میں کربناک اذیتیں اٹھا کر فلابیر اپنی اذیت پسندی (ماسوکیت) کی تسکین کر رہا تھا۔ خود اسی کے الفاظ

جس کے وہ تخلیق فن کے عمل سے ایسی ہی محبت کرتا ہے۔ جیسے کوئی راہب اپنی کھردری اونی قبا سے جو اس کے جلد کو مسلسل خراشیں پہنچاتی ہے۔

آرٹ سے فلابیر کا بے پناہ عشق تو کسی سے بھی کسی حد تک غیر معمولی اور عجیب نظر آئے لیکن اس کے اسباب پر غور کرنے سے یہ کہنے کی اجازت ملنے کی جا سکتی ہے کہ سارا دل اس شخص کے لئے احترام اور عظمت کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے جس نے آرٹ کو انتہائی بلند اور مقدس مقام عطا کیا۔ اس پُرتزویر دور میں جب آرٹ بازار کی ایک جنس اور سستی شہرت اور خوشامد لوگوں کے ہاتھوں ذاتی مقاصد حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بن گیا ہے۔ فلابیر کا آرٹ سے لگاؤ ہمیں متاثر کئے بغیر نہیں رہتا۔

۱۸۴۴ء میں جب کہ فلابیر کی عمر صرف ۲۳ سال تھی اس کی زندگی کا ایک حادثہ رونما ہوا جس کی نوعیت اور فلابیر کی شخصیت اور فن پر جس کے اثرات کے متعلق آج تک نقاد مختلف قیاس آرائیوں میں مصروف ہیں۔ ایک رات جب کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ فلابیر پر اس اعصابی بیماری کا پہلا شدید حملہ ہوا جو اس کے سوانح نگاروں کے لئے ایک علمی معمہ سی ہوئی ہے۔ بعض مرگی۔ ہسٹریا یا ہسٹریائی مرگی Hysteria – Epilepsy کا نام دیتے ہیں۔ بہرصورت اس بیماری نے جو تا دمِ مرگ اس کے ساتھ لگی رہی اس کی شخصیت پر بہت گہرے اثرات چھوڑے۔ اس نے تنہائی اختیار کر لی اور سیاسی کام کا خیال زندگی بھر کے لئے ترک کر دیا۔ ۱۸۴۵ء میں اس کے باپ کا انتقال ہوا۔ باپ کی موت کے دو تین ہفتے بعد ہی اس کی بہن جس سے اسے بے حد لگاؤ تھا اور جو اس کے بچپن کی رفیق تھی۔ وضع حمل میں چل بسی اور اپنی یادگار ایک لڑکی چھوڑ گئی۔ اپنی بھانجی کی محبت اس کی زندگی کا گراں قدر سرمایہ بھی اور دیکھ بھال کی ذمہ داری اس نے جس شیفتگی۔ انہماک اور دلدارانہ شفقت کے ذریعہ کی اس سے فلابیر کی شخصیت کے اس رخ کی عکاسی ہوتی ہے جس میں ایک انسانی دل دھڑک رہا تھا۔ اور جہاں تک تشکیک پرستی کے تاریک سائے پہنچ نہیں پائے تھے۔

اس کی اعصابی بیماری اور غیر معمولی محنت کی معذرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی زندگی کے ۲۲ سال ختم بھی نہ ہونے پائے تھے اور اس کی مداواتی ستون منتشر ہو گئی۔ اس کے اندرونی دریچے ایک کے بعد ایک بند ہو گئے۔ اور جو دل کبھی عرصہ پہلے ہنگاموں اور ولولوں سے گونج رہا تھا اب ایک خالی ترکی مانند ویران اور سنسان نظر آنے لگا۔ اکا دکا معاشقوں اور چھوٹی موٹی سیاحت کے علاوہ اس نے تمام زندگی کروسے کی مانوس تنہائی میں گزار دی۔

جہاں تک اس کے معاشقوں کا تعلق ہے۔ مختلف نقادوں نے ان پر مختلف زاویوں سے نگاہ ڈالی ہے۔ لوئی کولٹ سے اس کی محبت کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ لوئی کولٹ خوبصورت تھی اور نیم خود شاعرہ بھی تھی۔ اپنے حسن اور اثر و رسوخ کی وجہ سے زمانے شاعری میں اس کا نام چل نکلا تھا۔ اس زمانے کے اکثر نامور فنکاروں کی وہ معشوقہ رہ چکی تھی وکٹر کزن۔ وکٹر ہیوگو۔ الفرڈ ڈی وگنی۔ الفرڈ ڈی موسٹ سب اسی کے کرشمۂ نگاہ کے رہ چکے تھے۔ کم از کم چار بار تو وہ اس انعام کی مستحق ٹھہر چکی تھی جو بہترین شعری تخلیق کے لئے اکیڈمی دیا کرتے تھے۔ اس کا شوہر موسیقی کا پروفیسر تھا۔ اور اس کا عاشق وکٹر کزن تھا جس سے اسے ایک لڑکی بھی تھی۔ فلابیر جب ۲۵ سال کا تھا اس کے دامِ محبت میں گرفتار ہوا اور لوئی کولٹ نے اس کی داشتہ بننا منظور کر لیا۔ اس محبت سے فلابیر کے ان خطوط کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو اپنے دلآویز طرز بیان بے ساختگی اور منکسرانہ خاطر کی وجہ سے اس کی گرانقدر تخلیقات میں ہیں

لیکن لوئی کولٹ کے ساتھ فلابیر کے تعلقات زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکے۔ اس کشیدگی کی مختلف وجوہات بتائی جاتی

جاتی ہیں ۔ سامرسٹ ماہم کا خیال ہے کہ فلابیر کو جو اعصابی مرض لاحق تھا اس کے علاج کے طور پر اسے کونائن سلفیٹ اور پوٹاشیم برومائیڈ کی کافی بڑی مقدار دی جاتی تھی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان قیاسات نے اس کی قوت مردمی کو کافی نقصان پہنچایا اور وہ زندگی بھر صحتمند جنسی تعلقات سے محروم رہا ۔ طوائفوں سے اس کے تعلقات جن کی وہ بہت ڈینگیں مارتا تھا محض فرضی تھے اور اپنی انا کی تسکین اور جنسی کمزوری کی پردہ پوشی کی خاطر وہ انہیں بیان کرتا پھرتا تھا ۔ چنانچہ جب لوئی کولٹ نے یہ بات پھیلا دی کہ وہ عنقریب فلابیر سے شادی کرنے والی ہے تو فلابیر کی پریشانی دیکھنے کے قابل تھی ۔ اس نے لوئی کولٹ سے ملنا بالکل ترک کر دیا اور جب لوئی کولٹ ملاقات کی غرض سے زبردستی اس کے مکان پر گئی تو اپنی ماں کے سامنے دھکے دے کر نکال باہر کیا ۔

آندرے موروا کی رائے اس کے برعکس ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ فلابیر کی برگشتگی مذاق سلیم کی بنا پر تھی ۔ فلابیر لوئی کولٹ کی شاعری (جو یقیناً معمولی تھی) اس کے خطوط اور اس کی تکلفات اور تصنع سے گرانبار گفتگو سے بیزار تھا ابتداء میں تو فلابیر کا عشق نہایت رومانی اور شدید تھا لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ جب لوئی کولٹ کی سطحی اور بے رنگ شخصیت سے تکلفات اور آرائشوں کے بھڑکدار پردے ہٹنے لگے ، لوئی کولٹ کی ذہنی تہی مائیگی اور مذاق سلیم کا فقدان فلابیر کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا ۔ اس توجیہ کے باوجود فلابیر کا اپنے مکان پر لوئی کولٹ کے ساتھ بے رحمانہ اور سفاکانہ برتاؤ ابھی بھی تشریح طلب ہے ۔

(۲)

جب فلابیر نے Temptation of St Anthony مکمل کر لی تو اس نے اس ناول کا مسودہ اپنے دو گہرے دوستوں میکسم ڈوکیمپ اور Louis Bouilhet کو پڑھ کر سنایا ۔ چار روز تک ناول سناتا رہا ۔ چار گھنٹے صبح اور چار گھنٹے شام ۔ چوتھے روز نصف رات گئے فلابیر نے ناول ختم کیا اور ان سے رائے طلب کی ۔ ایک طویل بحث کا آغاز ہو گیا ۔ ان میں سے ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ " ہمارا خیال ہے کہ ناول کو نذر آتش کر دینا چاہیئے ۔ سب سے بڑا سب سے زیادہ سنگین اعتراض تھا تو یہی کہ اسلوب بیان تکلفات و آرائشوں سے بوجھل ہے Louis Bouilhet نے تجویز .... پیش کی کہ فلابیر کو بالزاک کو نمونہ بنا کر ایک حقیقت پسند ناول لکھنا چاہیئے ۔ میکسم ڈوکیمپ نے کہا کہ " غنائیت کی طرف تمہارا میلان ناقابل مزاحمت ہے تمہیں اس موضوع کا انتخاب کرنا چاہیئے کہ اس پر لکھتے وقت غنائیت اس قدر مضحکہ خیز معلوم ہو کہ تم اسے ترک کرنے پر مجبور ہو جاؤ ۔ کوئی بھی عامیانہ سا موضوع اٹھا لو ۔ ان واقعات میں سے ایک واقعہ لے لو جس سے بورژوا زندگی بھری پڑی ہے ۔ پھر اس واقعہ کو فطری طور پر لکھنے کے لئے خود کو مجبور کرو ۔"
Louis Bouilhet نے تجویز پیش کی کہ تم ڈی لامیر کی کہانی کیوں نہیں لکھتے ۔ فلابیر اس خیال پر پھڑک اٹھا ۔

یوجین لامیر ، فلابیر کے باپ کا جو ایک سرجن تھا شاگرد رہ چکا تھا ۔ بعد میں وہ ہسپتال میں ہاؤس سرجن بن گیا ۔ اس کی پہلی بیوی ایک ادھیڑ عمر کی بیوہ تھی اور اس کے انتقال کے بعد ڈی لامیر نے ڈیلفن کوتیر نامی ایک لڑکی سے شادی کی جو خوبصورت ہونے کے علاوہ بورڈنگ اسکول کی تعلیم یافتہ لڑکی تھی ۔ یہ بڑی خود غلط قسم کی نہایت خراج لڑکی تھی اور اپنے متعلق نہایت مبالغہ آمیز خیالات اور خوش فہمیوں میں مبتلا تھی ۔ شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ اپنے سادہ لوح اور غریب شوہر کی بے کیف صحبتوں سے اکتا کر یکے بعد دیگرے اپنے مختلف چاہنے والوں سے تعلقات پیدا کرتی ہے اور اپنی حیثیت اور استعداد سے کہیں زیادہ روپیہ ملبوسات و دیگر تکلفات پر خرچ کرتی ہے اور بری طرح مقروض ہو جاتی ہے بالآخر اپنے چاہنے والوں کی عدم توجہی اور قرضخواہوں کے پیہم تقاضوں کی شکار ڈیلفن زہر کھا کر خودکشی کر لیتی ہے ۔ اپنے

پیچھے وہ ایک لڑکی چھوڑ جاتی ہے جس سے ڈی لاسر کو شدید لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے لیکن اپنی رفیقۂ حیات کے متعلق آئے دن ایک نانت سے برگشتہ خاطر ہو کر بالآخر اپنی زندگی کا بھی خاتمہ کر دیتا ہے۔ یہی وہ معمولی اور بے رنگ کہانی ہے جو فلابیر کے تخیل کی آنچ کھا کر ایک عظیم فنی شاہکار میں بدل جاتی ہے۔ ۱۸۵۱ء میں وہ اس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے اُس وقت اُس نے عمر کے تیس سال گزارے تھے۔ اس عمر میں اُس نے گویا اپنی تمام زندگی گزار دی تھی۔ ۱۸۵۱ء کے بعد بقول آندرے موروا اُس کی زندگی کی کہانی اُس کے آرٹ کی کہانی رہ جاتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فلابیر نے ایک زندہ واقعہ اپنی ناول کا موضوع بنایا اور ڈیلفین کے ایک موہوم عکس کو اپنے فنی اعجاز کے ذریعہ ایک جیتا جاگتا کردار بنا دیا۔ ایما کا کردار ڈیلفین کا عکس تو ہے ہی لیکن اس میں بہت کچھ بلکہ بہت کچھ وہ جو اسے فلابیر ہی کے قلم کی دین ہے۔ فلابیر کا عقیدہ تھا کہ فنکار کو چاہئے کہ وہ اپنے کردار کی شخصیت میں جذب ہو جائے اور کردار کو اپنی شخصیت میں گم نہ ہونے دے۔ اس لئے ایما مادام بواری کو اپنی شخصیت کا پرتو نہیں بنایا۔ حالانکہ ایما کا رومانی ذہن بہت کچھ فلابیر کی رومانی شخصیت کی آئینہ داری کرتا ہے۔ پھر بھی ایما کی اپنی ایک شخصیت ہے۔ وہ ایک منفرد وجود رکھتی ہے۔ ناول میں فلابیر نے ایسی معروضیت پیدا کی جو بعد میں آنے والے حقیقت نگاروں اور فطرت پسندوں کے لئے مشعل راہ بن گئی۔ اس بحث سے قطع نظر کہ ناول میں فنکار کی اتنی معروضیت جتنی فلابیر نے برتی ممکن ہے اور اگر ممکن ہے تو جائز بھی ہے فلابیر کا حقیقتوں کو بے لاگ طریقہ پر پیش کرنا کم از کم فنکاروں کے اس رویہ کے خلاف ایک صحت مند بغاوت کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعہ فنکار انسانی کرداروں اور حقائق کو اپنی شخصیت یا اخلاقی اصولوں پر ڈھال لیتے ہیں اور اس طرح ان کی فطری نشوونما اور نفسیاتی ہم آہنگی کو مجروح کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں تھا کہ مذکورہ معروضیت نے فلابیر کو مطلق بے حس رکھا اور جذباتی طور پر اس میں کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ ناول لکھنے کے دوران میں فلابیر اکثر ان اذیتوں سے متاثر ہوا جس سے اس کے کردار گزر رہے تھے۔ جب ایما نے سنکھیا پھانک لی تو فلابیر کی زبان سنکھیا کا تلخ ذائقہ محسوس کر رہی تھی۔ اسے بار بار متلی کا احساس ہوا اور واقعہ کو ضبط تحریر کرتے وقت اس کی طبیعت غیر معمولی طور پر بگڑی رہی لیکن فلابیر نے ناول کے فطری ارتقا، کرداروں کی نفسیاتی اٹھان اور واقعات کے حقیقی ربط میں کوئی دخل اندازی نہیں کی۔ اسی لئے مادام بواری معروضی آرٹ کا بے مثال نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ ایک خط میں لکھتا ہے "حقیقت میں مادام بواری کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ ایک بالکل فرضی داستان ہے۔ اس میں میں نے اپنے جذبات اور اپنی زندگی کو بالکل غیر متعلق رکھا ہے۔ میرے بہت سے اصولوں میں ایک اصول رہا ہے کہ فنکار خود کو اپنی تحریروں میں نہیں لانا چاہئے۔ فنکار کا رشتہ اپنے فن سے وہی ہونا چاہئے جو خدا کا اپنی تخلیق سے ہے۔ صاحب اقتدار اور نظروں سے پوشیدہ وہ ہر جگہ محسوس کیا جائے لیکن کسی جگہ نظر نہ آئے"

مادام بواری رومانی تصور حیات کی شکست کی کہانی ہے۔ رومانیت کلاسیکی جبر کے خلاف ایک زبردست بغاوت تھی جب روسو نے کہا تھا کہ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن ہر جگہ وہ پابہ زنجیر ہے" تو اسے شاید نہیں معلوم تھا کہ وہ ایک ایسے فکری انقلاب کی بنیاد رکھ رہا ہے جو عرصہ دراز تک انسانی ذہن کو متاثر کرتا رہے گا۔ رومانیت نے فکر کی بجائے جذبات کو زیادہ اہمیت دی اور انسان کو اس کی بے پناہ صلاحیتوں کا احساس دلایا۔ انسان کو اس نے فطری طور پر معصوم اور معدن تصور کیا اور بتایا کہ صرف غلط ماحول اور مخالف حالات کے جبر کے زیر اثر انسان کی شخصیت مسخ ہو گئی ہے۔ اگر ماحول کو خوشگوار بنایا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان اپنی تمام پاکیزہ صفات لے کر دنیا کو جنت ارضی میں تبدیل کر دے اور مسرتوں کے کے نغمے بار چشمے بہا دے۔ نتیجہ ہوا کہ رومانی ذہن نے زندگی کو ایک حیاتیاتی ضرورت سمجھ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ رومانی

ذہن نے ایسی بے پایاں مسرتوں کا تصور کیا جسے ہماری روزمرہ کی عام زندگی بہم پہنچانے سے قاصر ہے۔ ایک
عام تجرباتی زندگی کی بے رنگی اور بے کیفی اس کے لئے ناقابل قبول ہی تھی جب رومانی ذہن حقیقی دنیا کا ہم وجود اور اگر زندگی کی
بے لطف حدود کو دیکھتا تو وہ انتہائی نفرت اور بیزاری کے عالم میں ان سے گریز کرنے کی کوشش کرتا۔ زندگی کی جاتی جاتی چند حدود
اسے مطمئن کرنے کو کافی نہیں تھی۔ اس کے لئے یہ کافی نہیں تھا کہ پیدا ہو اور محض زندہ رہنے کی حدود میں تمام زندگی
اگر زندگی میں حسن کی شعلہ سامانیاں نہیں۔ رومان انگیز رعنائیاں نہیں۔ وہ خواب آور سرریں اور کیف انگیز مسرتیں نہیں
جن کی جھلکیاں وہ دنیائے تخیل میں دیکھا کرتا ہے تو پھر زندہ رہنا ہی کیا معنی۔ عام تجرباتی زندگی کی بے کیفی اور اکتا دینے والے
تواتر سے تھک کر رومانی ذہن نے اپنے تخیل کی دنیا میں پناہ لی۔ حقیقی دنیا سے یہ فرار رومانی ذہن کی اہم خصوصیت
ہے۔ یہ فرار مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ کسی نے تلاش حق میں خود کو گم کر دیا۔ کسی نے طلسماتی دنیاؤں کی
سیر کی۔ کسی نے ابتدائے عہد انسانی کی زندگی میں اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈی۔ کسی نے فطرت سے اپنی وابستگی کو
تمام مسائل کا حل سمجھا۔ کسی نے عہد عتیق اور قرون وسطیٰ کی رومان انگیز فضاؤں میں پناہ لی اور کبھی مستقبل کی موہوم
دنیا کو لوٹ جانا کر حال سے آنکھیں پھیر لی گئیں۔ یہ اور ایسی ہی بہت سی پناہ گاہیں ہیں جو رومانی ذہن کی زندگی
تراشتی رہی ہے۔ مادام بواری کی طبیعت رومانی ہے لیکن ذہن سطحی ہے۔ اپنے بے رنگ ماحول، قصباتی زندگی کی یکسانی
اور اپنے ویران بھرے دل کی محرومیوں کی تلافی وہ جنسی ہیجان کے ذریعہ کرتی ہے۔ سطحی محبت کی دلفریبیاں اور جنسی
لذات کا سامان اس کے لئے راہ فرار ہے۔

فلابیر جو طبعی طور پر رومانی واقع ہوا تھا مادام بواری لکھ کر گویا اپنے رومانی ذہن کی ..... تنکیس کا اعلان
کرتا ہے۔ فلابیر کا جملہ "میں ہی بواری ہوں" بڑی معنوی گہرائی رکھتا ہے۔ فلابیر کا رومانی ذہن اپنی بقا کے
لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا لیکن اسے نجات نصیب نہیں ہوئی۔ اس ذہن کی شکست اس کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ شاید
اس کی زندگی کا اہم ترین تجربہ بھی۔ اس نے حیات کے ایک تصور کی موت کا منظر دیکھ لیا۔ اس نے زندگی کے کسی نئے تصور
کی طرف قدم بڑھایا یا نہیں یہ الگ بات ہے لیکن اسے کم از کم یہ تو معلوم ہو گیا کہ موروثی تصورات اور اخلاقی نظام اب
اس کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس نے یہ سبق ضرور سیکھا کہ رومانی آرزومندی اور بے جا خواہشوں کا حقیقی زندگی میں
کوئی مقام نہیں ہے۔ مادام بواری رومانی آدرش کی شکست کا ایک بہت ہی فنکارانہ مطالعہ ہے۔ فلابیر کو فرانسیسی
ادب کا سروینٹس بھی اسی لئے کہا گیا ہے۔ ڈان کوئکزوٹ اور مادام بواری دونوں رومانی تصورات پر جارحانہ حملہ
ہیں لیکن مادام بواری کی ایک خصوصیت ہے جو اسے سروینٹس کے شاہکار سے ممتاز کرتی ہے۔ مادام بواری میں رومانی تصور
حیات کا مطالعہ حقیقت پسندانہ پس منظر میں کیا گیا ہے۔ اسی لئے ناول کا پس منظر جو قصباتی فضا پر مشتمل ہے اتنی
اہمیت رکھتا ہے۔ فلابیر نے قصباتی فضا کو اپنی تمام بے رنگ کیفیات کے ساتھ ناول میں ابھارا ہے۔ یہ قصباتی فضا
محض ناول کے پس منظر کا کام نہیں دیتی بلکہ ایک ایسی مرکزی اہمیت اختیار کر لیتی ہے کہ ناول مادام بواری اور قصباتی فضا
دونوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے پر دونوں کے عمل اور ردعمل سے ناول کی حقیقی کہانی جنم لیتی ہے۔ ایک طرف
مادام بواری کا رومانی ذہن اور دوسری طرف قصباتی زندگی کا بے رنگ ماحول۔ دونوں کے تصادم سے وہ کہانی منصۂ
شہود پر آتی ہے جو آج بھی دنیا کے کونے کونے میں دہرائی جا رہی ہے۔ آندرے موروا نے مادام بواری کو
Universal Type غلط نہیں کہا۔

زندگی آج بھی انسانی خواہشوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ زندگی کی معمولی محرومیاں بھی رومانی رجائیت کو چند ہی دنوں

[redacted]

میں تھپک کر دیتی ہیں اور زندگی کو ایسے کراں مسرتوں کا سرچشمہ سمجھنے والا رومانی انسان عام زندگی سے مفاہمت کر لیتا ہے یا اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ہماری آرزوئیں جب حقیقی زندگی میں تکمیل نہیں پاتیں تو خوابوں میں پناہ پاتی ہیں۔ بیداری کے خواب عہد حاضر کے انسانی شعور کا ایک اہم جزو ہیں۔ حقیقی زندگی کے مطالبات اور مساعی قبول کرنے کی صلاحیت ابھی بھی عام نہیں ہے۔ زندگی کے بے کیف واقعات سے تھک کر آج بھی ہم ہماری خواہشوں کی تکمیل رومانی آرزو مندی اور بیداری کے خوابوں کے ذریعہ کرتے ہیں۔ رومانی انسان جو حقیقی زمانے سے بھاگ کر خوابوں کی سرزمین کی تلاش میں رہتا ہے حقیقی دنیا سے ایک ایسا تکرار ملال لیتا ہے جس کے بعد کبھی خوشگوار ثبات نہیں ہوتے۔ وہ عورتیں معاشی اعتبار سے مادام بوواری سے کتنی مشابہت رکھتی ہیں جو کسی آدرشی دولہا کو اپنی حیات سانے کے خواب دیکھتی ہیں لیکن جن کی قسمت میں اسی عام کاروباری زمانے کے کسی عام شخص کے ساتھ زندگی بتانا لکھا ہوتا ہے۔ رومانی داستان عالم کے سرابی حقیقی زندگی میں تلاش عبث ہے۔ ان رومانی نوجوانوں کی محرومی حیات کو محض ان کی بدقسمتی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ جو ان کی شخصیت میں ایسے کئی پہلو موجود ہوتے ہیں جو انہیں زندگی سے ایک ناخوشگوار تعلق پیدا کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ اسی لیے مادام بوواری کو محض ایک ایسی بدقسمت عورت کی داستان کہنا جو ایک ہیروئن تو بن جانا چاہتی تھی لیکن بدقسمتی سے جسے صرف ایک ڈاکٹر ملا۔ جو ایک دلفریب عاشق چاہتی تھی لیکن بدقسمتی سے جسے … عیار رجا … والے ملے — اور اس طرح مادام بوواری کی زندگی کو محض ناقابل یقین حادثات کا سلسلہ بتانا جیسا کہ سارتر نے کیا ہے۔ مادام بوواری کو سمجھنے کا کوئی بہتر طریقہ نہیں ہے۔ مادام بوواری میں جو المیہ حزن پوشیدہ ہے اسے ہم اس کے کردار میں جو ایک المیہ کردار کی جھلکیاں ملتی ہیں انہیں اتنی آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ ایما کے کردار میں اتنی گہرائی اور توانائی نہیں ہے کہ وہ بڑا المیہ کردار بن سکے لیکن ایما ایسی معمولی عورت بھی نہیں جس کی داستان ایک مظلوم عورت کی داستان بن جائے۔ ایما کی سب سے بڑی کمزوری اس کی … ہے۔ اس میں اتنی ذہنی پختگی اور اخلاقی توانائی نہیں ہے کہ وہ زندگی کے نشیب و فراز کو ہموار کر سکے۔ اس کے کردار میں وہ پختگی بھی نہیں ہے جو خیالی اور حقیقی دنیا میں توازن برقرار رکھ سکے۔ وہ بہت جلد سپرانداز ہو جاتی ہے اور حالات کے بے قابو بہاؤ اسے ایک بے بس تنکے کی طرح بہا لے جاتے ہیں۔ انہی وجوہات کی بنا پر وہ کوئی بڑا المیہ کردار نہیں بن سکی۔ المیہ کردار کی سی تھوڑی سی جھلکیاں ہمیں اس میں نظر آتی ہیں۔ محض خارجی حالات محض ایما کی رومانی طبیعت اس کی تباہی کا سبب نہیں بلکہ … المیہ صورت حال کی تشکیل کرتے ہیں۔ ایک غیر ہم آہنگ ماحول جس سے ایما کو کوئی طبعی مناسبت نہیں ہے اپنی تمام شدت کے ساتھ ایما کی رومانیت کو کچلنے کے لیے اٹھتا ہے۔ یہ کہنا کہ ایما کی شکست محض رقت پیدا کرتی ہے … ہے وہ ایک شدید المیہ احساس کی تخلیق کرتی ہے۔

گوئٹے نے کلاسک کو صحت مند اور رومانٹک کو غیر صحت مند کہا ہے۔ کلاسک انسان کو اس کی تمام کمزوریوں اور تضاد اور انتشار … کے مجموعہ کے طور پر قبول کرتا ہے چنانچہ جہاں رومانی زندگی کو … ہیجان کے سپرد کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ ہاں کلاسک زندگی میں ضبط اور فکری سنجیدگی سے کام لیتا ہے۔ اسی لیے کلاسک حقیقتوں سے گریز نہیں کرتا بلکہ حقیقت میں مسرت تلاش کرنے کی جستجو کرتا ہے۔ مادام بوواری سے ادب میں نو کلاسکی ادوار کا آغاز ہوتا ہے۔ ۱۸۵۰ء میں فرانسیسی عوام رومانیت سے بیزار ہو چکے تھے۔ وہ سیاست اور جمہوریت دونوں سے تو بیزار ہو چکے تھے۔ وہ قدامت پسند تاریخی داستانوں، پرتکلف انداز بیان … لطیف جذبات غرض یہ کہ رومانی ادب کی تمام تر انتشاری کیفیات اور طلسماتی روایات سے تنگ آ چکے تھے۔ اگر یہ سچ ہے کہ ایک بڑے ادب پارے کی طلوع کا وہی وقت وہی ہوتا ہے جب ایک مردہ روایت دم توڑتی ہے اور اسی کی نعش سے ایک زندہ روایت جنم لیتی ہے تو مادام بوواری

صحیح وقت پر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی ۔

رومانی تخیل کا حقیقی دنیا میں جو عبرتناک انجام ہوتا ہے اس کی نقش کشی فلابیئر نے کمال فنکاری سے کی ہے ۔ ایما کے رومانی حالات کی تصویر کشی میں فلابیئر نے ایسے حقائق پیکر تراشے ہیں اور اسلوب نگارش کے وہ نادر نمونے پیش کئے ہیں جن سے فرانسیسی ادب ابھی تک محروم تھا ۔ شارل کی شادی کی پیشکش کو ایما یہ سمجھ کر قبول کر لیتی ہے کہ آخر کسی ڈاکٹر کی رفیقۂ حیات بننا ۔ ان حالات میں کوئی معمولی بات نہیں ہے ۔ لیکن شارل کو تو فلابیئر نے ایک بورژوازی ابتذال کی مجسم تصویر بنا کر پیش کیا ہے جس سے وہ زندگی بھر بیزار رہا ۔ شارل ایک ناکام ڈاکٹر ۔ غیر دلچسپ مصاحب اور حماقت کی حد تک بیچارا ہوا انسان ثابت ہوا ۔ وہ خوش تھا کہ اسے ایک ہوشیار اور خوبصورت بیوی مل گئی ۔ لیکن ایما کا کیا ۔ ؟ ایما تو شادی کے بعد بھی یہ جاننے کی کوشش کرتی رہی کہ عشق ۔ سرمستی ۔ کامرانی جیسے لفظ جو کتابوں میں اسے نہایت حسین معلوم ہوتے تھے زندگی میں صحیح صحیح کیا معنی رکھتے ہیں ۔ ایما نے عشق و محبت کے تصورات آخر رومانی کتابوں ہی سے لئے تھے ۔ " ان ناولوں میں اول سے آخر تک بس عشق ہی عشق ہوتا تھا ۔ عاشق ۔ معشوقائیں ۔ سنسان نشیمنوں میں غش کھاتی ہوئی مظلوم شہزادیاں ۔ تاریک جنگل ۔ دل کا درد ۔ وعدے ۔ سسکیاں ۔ آنسو اور بوسے ۔ چاندنی میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں ۔ سایہ دار کنجوں میں بلبلیں ۔ " ایما کی یہ نادانی تھی کہ رومانی کتابوں کی دنیاؤں کو اس نے حقیقی زندگی میں تلاش کرنے کی کوشش کی ۔ شارل اس کے خوابوں کو حقیقت میں نہ بدل سکا ۔ ایما کی تشنۂ تکمیل خواہش رومان انگیز تصورات اور بیداری کے خوابوں میں بدل جاتی ہیں ۔ حقیقت سے قدم آہستہ آہستہ اکھڑنے لگتے ہیں اور اکتساب مسرت کے لئے تخیل پر سادہ اعتماد کیا جانے لگتا ہے ۔ " بعض اوقات وہ سوچا کرتی کہ بہر حال یہ میری زندگی کا سب سے مسرت انگیز زمانہ ہے یعنی ماہ عروسی ۔ اس کی شیرینی سے پورا مزہ لینے کے لئے ضروری تھا کہ کسی طرح خوش آہنگ ناموں والی سرزمینوں کو اڑ چلیں ۔ جہاں شادی کے بعد کے دن بڑی لطیف بیکاری میں گزرتے ہیں ۔ بگھیوں میں نیلے ریشمی پردوں کے پیچھے بیٹھ کر ڈھلوان سڑکوں پر آہستہ آہستہ چڑھا کرتے ۔ کوچوان کا پہاڑوں میں گونجتا ہوا گیت اور آبشار ۔ ۔ ۔ کی دبی دبی آواز سنا ۔ سورج ڈوبنے کے وقت جھیلوں کے کنارے لیموں کے درختوں کی خوشبو میں لدی ہوئی ہوا میں سانس لیتا ۔ ۔ ۔ ۔ اسے کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں چند خاص خاص جگہیں ہیں جہاں خوشی ملتی ہے جیسے کوئی پودا ایک خاص مٹی میں اگتا ہے کہیں دوسری جگہ نہیں پنپ سکتا ۔ اب کیوں نہیں ہو سکتا کہ وہ سوئٹزرلینڈ میں لکڑی کے مکانوں کے چھجوں پر جھکی کھڑی ہو یا اسکاٹ لینڈ کی کسی جھونپڑی میں اپنی افسردگی کو دلوتی سا کر پوچھے اور ساتھ میں اس کا شوہر ہو جو لمبے لمبے دامنوں والا سیاہ مخملی کوٹ پہنے ہوتے ۔ لمبا ہیٹ اور جھالردار کف اور کالر پہنا ہو ۔ " یہ Romantic reverie کی اس سے بہتر مثال شاذ ہی ادب میں ملے ۔

غرض ایما کی رومانی آرزومندی اسے روزانہ زندگی کے مطالبات کے لئے نا اہل بنا دیتی ہے ۔ وہ شارل کی غیر دلچسپ مصاحبت اور قصباتی زندگی کی ویرانی سے بھاگ کر عشق و محبت کی رومانی فضاؤں میں لطف و انبساط کی جستجو کرتی ہے ۔ رڈولف کی بے دماغی کی بوالہوسی کے لئے ایما اچھا شکار ثابت ہوتی ہے ۔ وہ اس کے ساتھ فرار ہونے کو بھی تیار ہے لیکن رڈولف اسے چھوڑ کر چل دیتا ہے ۔ رڈولف کی بے وفائی ایما کی زندگی کا ایک بحرانی حادثہ ثابت ہوتی ہے ۔ ابھی تک تو ایما کو یقین تھا کہ رومانی عشق دنیا میں ممکن ہے لیکن اب اس یقین کی بنیادیں اکھڑ جاتی ہیں ۔ اور ایما جس کے لئے اب رومان ختم ہو چکا ہے اور جو حقیقت کا جام تلخ نوش کر چکی ہے خود کو شہوانی لذات

میں بھول جانے کی کوشش کرتی ہے۔ اور جنسی ہیجان اور جذبات کی شوریدہ سری کے ذریعہ حقیقت کی تلخی کو مٹانا چاہتی ہے۔ لیکن حقیقت کا آخری منتقمانہ حملہ ابھی باقی ہے۔ یہ حملہ سود خوار کے ہمیک یا یہ کے ہتھیار سے کیا جاتا ہے۔ شاید ایما کی رومانیت پر حقیقت کا یہ سب سے بڑا وار ہے۔ محبت کے ہاتھوں نہیں بلکہ قرض خواہوں کے ہاتھوں وہ تنگ آ کر سنکھیا پھانک لیتی ہے اور اس کی پریشان زندگی کو بالآخر قرار نصیب ہو ہی جاتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ میکبتھ کی موت کی طرح ہم ایما کی موت پر بھی ایک غم ناک طمانیت قلب اور افسردہ سکون محسوس نہیں کرتے۔ دونوں کی بے قرار زندگی موت کے بعد ہی سکون پاتی ہے۔

مارٹن ٹرنل نے ٹھیک کہا ہے کہ "فلابیر کے اہم کردار عموماً ایسے لوگ ہیں جو اپنی اس جماعت سے دور بیٹھے ہیں جس میں وہ پیدا ہوئے ہیں۔ اور پھر ذاتی تعلقات کے ذریعہ اپنی زندگی کو از سر نو تعمیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں یکے بعد دیگرے یہ تعلقات ٹوٹ جاتے ہیں اور یہ اکھڑے ہوئے کردار جو اسی دنیا میں سانس لیتے ہیں جس میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ایک کربناک احساس علیحدگی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔" مادام بواری بھی ایک ایسا ہی رنجیدہ کردار ہے۔ خارجی حالات اور حوادث کی دنیا کے درمیان جو خلیج حائل ہے مادام بواری اسے پار نہیں کر سکی۔ سپاٹ زندگی کی ہولناک ویرانی سے بھاگ کر وہ شہوانی لذت کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ شہوانی لذت بھی مقصود بالذات نہیں ایک ذریعہ فرار ہے۔ وہ فطری طور پر بدچلن نہیں۔ اگر حالات سازگار اور خوشگوار ہوتے تو شاید وہ کامیاب زندگی گزار سکتی۔ امیل فگٹ۔ آندرے موروا، سامرسٹ ماہم نے اس امکان پر غور کیا ہے کہ ایما اگر ہومز کی رفیقہ حیات بنتی تو شاید کامیاب زندگی گزار سکتی اور خود ہومز کے لیے بڑی مددگار ثابت ہوتی۔ لیکن فلابیر کے مقصد کے لیے کہانی کا یہ طریقہ کارآمد نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ایما کو بچایا جا سکتا ہی نہیں تھا۔ اس کی زندگی میں رومانیت ناکام ہو چکی تھی۔ وہ ایما کی زندگی میں بھی رومانیت کو شکست دینا چاہتا تھا۔

مادام بواری کے لیے نجات کے مختلف راستے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر وہ کثیر الاولاد ہوتی تو شاید ماں کے تقاضے اسے حقیقی زندگی سے مفاہمت کرنے پر مجبور کر دیتے۔ آندرے موروا کا کہنا ہے کہ رومانی ذہن کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ وہ غیر معمولی چیزوں کی تلاش کرتا ہے اور معمولی چیزوں میں اپنی دلچسپی کھو بیٹھتا ہے۔ معمولی لوگ غیر معمولی نہ سہی لیکن غیر دلچسپ نہیں ہیں۔ رومانی ذہن رومانی محبت کی تلاش میں انسانی محبت کو نظر انداز کر جاتا ہے۔ اگر ایما شارل کو ذرا بھی سمجھنے کی کوشش کرتی اگر وہ اس کے ساتھ اپنی زندگی کی محدود مسرتوں میں شریک ہونے کی کوشش کرتی۔ اور زندگی کی لامحدود مسرتوں کی تلاش صرف آرٹ کے میدان میں کرتی اور آرٹ کی دنیا کو حقیقی دنیا میں بدلنے کی کوشش نہ کرتی تو شاید اطمینان بخش زندگی گزار سکتی۔

کچھ بھی ہو زندگی سے مفاہمت اور زندگی کو حیاتیاتی عمل سمجھ کر قبول کرنا ضروری ہے۔ لیکن انسان آرزوؤں۔ ارمانوں اور چاہتوں کو ترک بھی نہیں کر سکتا۔ ہر کسی کی شخصیت کا کچھ نہ کچھ عنصر تو ضرور رومانی رہتا ہے۔ لیکن اس سرد مہر دنیا میں رومان کی شکست بھی ناگزیر ہے۔ انسان زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ شکست آرزو کے المیہ کو برداشت کر لے۔ آرزو کی موت کا غم زندگی کا بنیادی غم ہے۔ اور اس غم سے آج بھی انسان کو نجات نہ ملی۔ شاید مادام بواری کی غیر معمولی مقبولیت کی یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اس میں ایک شکست آرزو کی ویران سناٹوں کا عکس ہے۔ ممکن ہے ہر رومانی کا انجام مادام بواری کی طرح المناک نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زندگی گزارنے کے طریقے مادام بواری سے مختلف ہوں۔ لیکن زندگی سے فرار کی ضرورت آج بھی محسوس کی جاتی ہے۔ آرٹ۔ ادب۔ علم۔ سیاست سب فرار کے ذریعے بن سکتے ہیں۔ اور بنتے ہیں۔ ہمارا شعور زندگی کو آج بھی اثباتی طور پر قبول نہیں کر سکا۔ حقیقت اور رومان۔ شخصیت اور کائنات کا تصادم آج بھی موجود ہے۔ چاہتوں۔ ارمانوں۔ آرزوؤں۔

اور خوابوں کی دنیا اور حقیقی دنیا کے درمیان آج بھی ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہے۔ زندگی میں ایک نئے توازن کی تلاش۔ ایک نئی معنویت کی جستجو ابھی ختم نہیں ہوئی۔ شاید اسی لئے آج بھی مادام بواری دنیا کی چند مقبول ترین کتابوں میں سے ایک ہے ایسا یقیناً ایک Type Phenomena ہے۔ چاہے آپ اسے گنہگار کہئے۔ بے وفا کہئے۔ کم عقل کہئے۔ چاہے آپ اسے ہیروئن تسلیم کیجئے۔ بہرحال وہ ہے ضرور۔ ہر جگہ اور ہر وقت وہ موجود رہی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں مادام بواری فلابیئر کے چند زندہ ترین کرداروں میں سے ہے۔

اگلے نمبر کی ایک جھلک

• افسانہ

عصمت چغتائی
پرکاش پنڈت
جیلانی بانو
گربچن سنگھ
رام لال
غیاث احمد گدی
دوار لطیف
ابراہیم شفیق

• ڈرامہ

کرتار سنگھ دگل
صفی الدین صدیقی

• مقالہ

سجاد ظہیر
طاہر علی خاں مسلم
عالم خوندمیری
حفیظ قتیل
حسینی شاہد

• ترجمہ

ابوظفر عبدالواحد

• نظم، غزل

فیض احمد فیض
مخدوم محی الدین
سردار جعفری
کیفی اعظمی
نظر حیدرآبادی
سلام مچھلی شہری
کنول پرشاد کنول
سردار الہام
نور محمد نور
محمد علوی
صغرا احمد صوفی
مظہر امام
موج علیگ
وارث کرمانی
شاہد مہدی
زاہدہ زیدی
کنور اخلاق محمد خاں
راشد آذر
راحل
سلیمان اریب

سید حمید شطاری

زمانۂ جاہلیت کی عورت

قدیم زمانہ میں عورت نے جو ترقی کی ہے زمانۂ جاہلیت کے عرب کو صحراؤں میں پرورش پانے والی ہونے کی بنا پر اسی کو ذہن میں رکھنا ہے جہاں وہ پیدا ہوا اور اس ماحول کی ساری شرافت تھی ۔ جہاں بہادری، مروت اور حمیت و خودداری میں تو سارے علم و تمدن کی نسبت کم تھی ۔ مگر کسی لحاظ سے زمانۂ جاہلیت کی قوم کی تسلسل اس طرح نہیں رکھ سکتی تا وقتیکہ وہ اپنے آپ کو محض چند قدم آگے پیش نہ کرے ۔ عہد جاہلیت کی ماں کو ہم ایسی ہی مانتے ہیں

موجودہ زمانے کی تہذیب و تمدن مغربی اقوام کی عورت کو جو آزادی آج حاصل ہے وہ آج سے تقریباً ساڑھے چودہ برس قبل کی عرب عورت کو حاصل تھی ۔ وہ بے پردہ آزادانہ چل پھر سکتی اور عام محفلوں میں شریک ہوتی تھی ۔ وہ اپنی شادی کے معاملے میں کامل آزاد تھی ۔ اپنے شوہر کا انتخاب اکثر خود کرتی تھی ۔ باپ بھی بغیر اپنی لڑکی کے مشورے اور مرضی کے اس کی شادی نہ کرتا تھا ۔ شادی کا پیام آتا اور وہ اس سے راضی نہ ہوتی تو انکار کر دیتی تھی چنانچہ حسناء کے لیے جو اپنے زمانے کی حسین ترین عورت تھی درید بن الصمہ نے پیام بھیجا لیکن اس نے انکار کر دیا کیونکہ وہ ادھیڑ عمر کو پہنچ چکا تھا ۔ اس موقع پر (موسلم) کہتی ہے کہ جو سردار جنگ میں بڑوں کی طرح دشمنوں کو بھگتے تھے ایک بوڑھے سے اب میں شادی کروں گی ۔ کہتی ہے مَا كنت لادع بني عمي وهم مثل عوالي الرماح وأتزوج شيخاً) [1]

عورت کو طلاق کا حق حاصل تھا ۔ شادی کے بعد اگر وہ خاوند کو کسی وجہ سے نہیں پسند کرتی تو اسے چھوڑ دیتی اور کسی دوسرے کا انتخاب خود کر لیتی اور اس کا یہ عمل اس کی شرافت پر کوئی دھبہ نہ لگا سکتا تھا بلکہ یہ اس کے عزور پر محمول کیا جاتا تھا ۔ سلمیٰ بنت عمرو عدی بن النجار کی ایک عورت تھی جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے ۔ فانها كانت امرأة شريفة لا تتزوج الرجال الا وأمرها بيدها اذا كرهت من الرجل شيئاً تركته ''(وہ ایک شریف عورت تھی جسے اپنی شادی کے کامل اختیارات حاصل تھے ۔ یہاں تک کہ اگر شوہر میں کوئی خامی پاتی تو اسے چھوڑ دیتی تھی)

جاہلی عرب مرد عورت کی عزت کرتے اور دوست احباب کی خاطر تواضع اور ان کی مہمان داری کرتی تھی ۔ نکلسن (NICHOLSON) لکھتا ہے کہ سوسائٹی میں اس کے ساتھ غلامانہ سلوک نہیں کیا جاتا تھا اور نہ اسے مال منقولہ کی طرح سمجھا جاتا تھا بلکہ [illegible] کے ساتھ مساوات حاصل تھی ۔ اس آزادی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کون اس کو مقید اور [illegible] کی عادی کہہ سکتا ہے ۔ محمد [illegible] نے '' مكانة المرأة العرب في الجاهلية والاسلام '' میں لکھا ہے

كانت النسوة العربيات في الجاهلية والاسلام يعادلن رجالهن في الفصاحة والكرم والنص من الحرب [illegible] حسبهم وعلى عكس ما تظنه اهالى اوربا من انه

---

[1] اوائل اسلام میں لوگوں کی رگوں میں جاہلیت ہی کا خون دوڑ رہا تھا اس لیے ان کے دلوں میں وہی جذبات، وہی امنگیں اور طبیعتوں میں وہی جوش و خروش تھا اس لیے اس مضمون میں اوائل اسلام سے بھی مثالیں پیش کی گئی ہیں

اسیرات لازواجهن مستعبدات لهم" عرب کی عورتیں زمانہ جاہلیت اور اسلام میں فصاحت، شرافت اور شجاعت میں مردوں کی برابری کرتی تھیں اور انھیں ایسی آزادی حاصل تھی جو دوسری عورتوں کو حاصل نہ تھی اور جو اہل یورپ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے شوہروں کی قیدی تھیں یہ خلاف واقعہ ہے۔ جرجی زیدان لکھتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب کی ترقی کا سب سے بڑا سبب ان کی عورتوں کی برتری تھی۔ مرد عورتوں کے متعلق عمدہ رائے رکھتے تھے۔ وہ عزت و وقعت رکھنے والی اور دانشمند تھیں۔ بہت سی عورتیں ایسی گذری ہیں جنھوں نے میدان سیاست، جنگ، ادب و شعر، تجارت اور صنعت میں ممتاز حیثیت حاصل کی۔ بعض عورتیں تو اپنی اعلیٰ قابلیت اور مختلف خوبیوں کی وجہ سے اتنی مشہور ہوئیں کہ ضرب المثل بن گئیں۔

مرد میدان جنگ میں جاتے تو عورت اپنے گھر بیٹھی ان کی فتح و نصرت کے لیے دعائیں کرتی اور رہتیں نہیں جاتی تھی بلکہ میدان جنگ میں بھی ان کے ساتھ رہتی تھی۔

لمّا رأيت نساءنا — يفحصن بالمعزاء شدّا

وبدت لميس كأنّها — بدر السماء إذا تبدّى

وبدت محاسنها التي — تخفى وكان الأمر جدّا

نازلت كبشهم ولم — أر من نزال الكبش بُدّا

(عمرو بن معدیکرب)

(جب میں نے ہماری عورتوں کو میدان جنگ کی سخت زمین پر ایسی سخت اور تیز چال سے نشان قدم چھوڑتے دیکھا اور لمیس (عورت کا نام ہے) آسمان پر چودھویں رات کے چاند کی طرح ظاہر ہوئی اور اس کا وہ سارا حسن جو چھپا رہتا تھا جلوہ گر ہو گیا اور اس وقت کا معاملہ غایت درجہ سنجیدہ ہو گیا تو میں دشمنوں کی فوج میں کود پڑا اور بجز لڑنے کے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا)

ان مبارک ہاتھوں کو جنھیں جانے شرح ہوا چاہیے ہم دیکھتے ہیں کہ دشمن کے خون سے سرخ ہوئے ہیں۔ عورتوں کی فوج مردوں کے پیچھے ہے ہر عورت کے ساتھ ایک مشکیزہ اور ہاتھ میں "ہراوۃ" (ڈنڈا) ہے تاکہ اپنے گرے پڑے زخمیوں کو پانی پلائیں اور ان کو اٹھائیں اور دشمن کے زخمی سپاہیوں کو ہراوۃ سے ختم کر دیں (جرجی زیدان)۔ اور اگر کسی میدان جنگ میں عورتوں نے دشمنوں کا خون نہ بہایا تو کیا مضائقہ۔ مردوں کے لیے عورتوں کا خود ہی میدان جنگ میں باعث غیرت ہوتا ہے اور پھر ان کا میدان جنگ میں پرجوش تقریریں کرنا، لڑائی کے لیے اشعار پڑھنا، جوش دلانا کیا کچھ رنگ نہ لاتا ہوگا۔ نکلسن لکھتا ہے:۔

THE PRESENCE OF WOMEN ON THE FIELD AND THE ACTIVE SHARE THEY TOOK IN THE COMBAT NATURALLY PROVOKED THE BITTEREST FEELINGS. IF THEY WERE NOT ENGAGED IN FINISHING THE BLOODY WORK OF THE MEN, THEIR TONGUES WERE BUSY INCITING THEM

حقیقت تو یہ ہے کہ جاہلی عرب کی فتح و شکست ان کی عورتوں ہی کی بہادری اور دلیری پر موقوف تھی۔ چنانچہ خنساء جنگ قادسیہ (۱۶ھ) میں اپنے چار بیٹوں کے ساتھ شریک رہی اور انھیں ایسی زبردست اور پرجوش وصیت کے ذریعہ ابھارا کہ صبح ہوتے ہی یکے بعد دیگرے سب میدان جنگ میں کود پڑے اور اپنی جان لڑائی کی نذر کر دی۔ جب خنساء کو خبر ملی کہ اس کے چاروں بیٹے شہید ہو گئے۔ تو کہا "الحمد لله الذي شرّفني بقتلهم وأرجو من ربّي أن يجمعني بهم في مستقرّ الرحمة" (الحمد للہ کہ اس نے مجھے ان کے قتل سے مشرف کیا اور میں امید کرتی ہوں کہ میرا پروردگار

مجھے ان کے ساتھ جوار رحمت میں اکٹھا کرے گا۔

غزوۂ احد میں (۳ ہجری) میں قریش کا جھنڈا میدانِ جنگ میں گر گیا اور ایسے ہی پڑا رہا لیکن ان میں سے ایک عورت نے جس کا نام "عمرہ بنت علقمۃ الحارثیہ" تھا اسے اٹھا لیا اور بلند کیا۔ تب اس جھنڈے کے تلے جمع ہوئے۔ "ہند بنت عتبہ" ابوسفیان کی بیوی اسی سفر میں اشعار پڑھ پڑھ کر اپنی قوم کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کر رہی تھی جنگ ختم ہو گئی تو عورتوں کے ساتھ وہ بھی نکلی لاشوں میں حضرت حمزہؓ کی نعش بھی نظر پڑی اس نے لاش کا پیٹ چیر کر کلیجہ نکال لیا اور اسے منہ سے چبانے لگی پھر پتھر پر چڑھ کر مسلمانوں کی شکست پر فخریہ اشعار پڑھنے لگی

جس صحرائی زندگی نے عورتوں کی بہادری اور شجاعت کے اعلیٰ نمونے اور ساتھ ہی غیظ و غضب کی وحشیانہ مثالیں پیش کی ہیں وہاں ان کی حمیت و خودداری کی بھی محافظت کی ہے صاحب الاغانی ابوالفرج الاصفہانی کہتا ہے کہ بہت کم ایسی قومیں ہوں گی جو زمانہ جاہلیت کے عربوں کے مقابلے میں حمیت و خودداری کا دعویٰ کر سکیں بلکہ جہاں تک ہمارا خیال ہے سوائے عرب کے کوئی قوم ایسا دعویٰ نہیں کر سکتی یہاں تو ذرا ذرا سی بات پر تلوار کھینچ جاتی اور خون کے دریا بہہ جاتے اور اس کا سلسلہ برسوں تک جاری رہتا یہاں تک کہ قبیلے مٹ جاتے عوام تو عوام بادشاہوں کے حکم کو بھی ان کی حمیت نے قبول کرنا گوارا نہ کیا۔ موجودہ زمانے کی خوشامد اور چاپلوسی مفقود تھی۔ بادشاہ حیرہ عمرو بن ہند نے ایک دن اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ کیا عرب میں کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جس کی ماں میری ماں کی خدمت کرنے کو عار سمجھے۔ انھوں نے کہا جی ہاں وہ عمرو بن کلثوم کی ماں ہے۔ بادشاہ نے وجہ دریافت کی تو کہا اس کا باپ "مہلہل بن ربیعہ" اور چچا کلیب بن وائل عرب کے سرداروں میں سے ہیں اور کلثوم بن مالک اس کا شوہر عرب کا شہسوار اور اس کا بیٹا عمرو اپنی قوم کا سردار ہے۔ بادشاہ نے عمرو بن کلثوم کے پاس کہلا بھیجا کہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں اور میری ماں بھی تمہاری ماں سے ملے گی۔ وہ دونوں آئے کھانے کے اہتمام پر بادشاہ کے اشارے پر اس کی ماں ہند نے خدمتگاروں کو علیحدہ کر دیا اور اثنائے گفتگو میں لیلیٰ (عمرو بن کلثوم کی ماں) سے کہا "ناولینی یا لیلیٰ ذالک الطبق" (اے لیلیٰ ذرا وہ طبق تو مجھے دے دو) تو لیلیٰ نے جواب دیا "لتقم صاحبۃ الحاجۃ الی حاجتھا" (جسے ضرورت ہو وہ خود اٹھ کر لے لے) پھر ہند نے دوبارہ قول لوٹایا لیلیٰ نے اس ذلت کو برداشت نہیں کیا اور چیخ کر "واذلاہ یا لتغلب"۔ عمرو بن کلثوم کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو مارے غصے کے چہرہ سرخ ہو گیا اور عمرو بن ہند کی تلوار کی طرف جو وہیں خیمے کے سامنے لٹک رہی تھی جھپٹا اور اس سے عمرو بن ہند کا قتل کر دیا۔ یہ جاہلیت کی حمیت کا نتیجہ ہے جس نے بادشاہ کی ماں کے حکم کو بھی اپنے لیے باعث ننگ و عار سمجھا

جس قوم میں عورتوں کو اتنی آزادی حاصل ہو۔ ان کے اخلاق و کردار کے متعلق بدگمانی پیدا ہونے کا امکان ضرور ہے لیکن جہاں کی عورتوں کے خمیر میں بہادری اور شجاعت، حمیت و خودداری ہو۔ اور جو موت کو ایک کھلونا سمجھتی ہوں کیا ان کی شرافت، عصمت و عفت پر حرف آ سکتا ہے؟ فاطمہ بنت خرشب ان تین شریف عورتوں میں شمار کی جاتی ہے جنھوں نے "المنجبات" (شریف زادوں کی ماں) کا لقب حاصل کیا۔ اس کے سات لڑکے تھے جن میں سے تین ربیع، عمارہ اور انس "الکملۃ" کے نام سے مشہور تھے ایک دن حمل بن بدر نے بنو عبس پر حملہ کیا فاطمہ اسی قبیلہ کی تھی حمل نے اسے قید کر لیا اور اس کے اونٹ کو جس پر وہ سوار تھی ہانک کر لے جانے لگا تو فاطمہ چلائی "اے مرد تیرے حواس بھٹک رہے ہیں خدا اگر تو نے مجھے قید کر لیا اور ہم اس پہاڑی کو جو اس وقت ہمارے سامنے ہے عبور کر جائیں تو پھر تمہارے اور زیاد کی اولاد میں کبھی صلح نہ ہو گی (زیاد اس کے شوہر کا نام تھا) کیونکہ لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگیں گے۔ برائی کا شبہ بھی بہت کافی ہے: اس نے کہا۔ میں تجھے لے

ملوں گا تاکہ تو میرے اونٹوں کو چرائے۔ جب فاطمہ کو یقین ہو گیا کہ وہ بالکل اس کے بس میں ہے تو اپنے اونٹ سے گر کر جان دے دی اور مر گئی کیونکہ اسے اپنی عصمت کے ساتھ اپنی اولاد کی بے عزتی کا بھی خوف دامن گیر تھا۔ لیلیٰ بنت لکیز تو اپنی پاک دامنی ہی کی وجہ سے "العفیفہ" کے لقب سے پکاری جانے لگی۔ بہت سی عورتیں ادب وعفت میں مشہور تھیں۔ ان عورتوں میں سے جو ادب وعفت میں مشہور تھیں نعمان بن منذر کی بیٹی "حرقۃ" بھی ہے۔

جاہلی عرب کو اس کی صحرائی اور وحشیانہ زندگی کا لحاظ کرتے ہوئے مروت، اخلاق، صداقت اور وفا شعاری سے جسے موجودہ متمدن اور مہذب زمانے کی پیداوار کہا جاتا ہے بیگانہ ہونا چاہئے تھا لیکن یہ چیز زمانہ حاضرہ کے مہذب و متمدن مردوں سے زیادہ جاہلی عورت میں پائی جاتی ہے حقیقت میں لطیف دل سے دیکھا جائے تو یہ اوصاف صرف اسی صحرائی زندگی کی پیداوار ہیں یہاں ہی اوصاف کی وجہ سے بہت سی عورتوں نے شہرت پائی اور بعض مثلاً "فکیھۃ" اور "ام جمیل" کے نام تاریخ میں زندہ رہ گئے۔ فکیھۃ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے قبیلہ پر سلیک بن سلکہ نے حملہ کیا تھا تو فکیھۃ کے قبیلے نے بھی اس سے بدلہ لینے کی خاطر اس پر حملہ کرنا چاہا اور اس کی گھات میں رہنے لگے۔ سلیک سرعت دوڑ میں مشہور تھا اس لیے بزرگوں کی ہدایت کے مطابق انھوں نے سلیک کے پیچھے اتر کر پانی پی کر سیر ہونے تک انتظار کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ پانی پی لینے کے بعد وہ بھاگ نہیں سکے گا۔ جب سلیک نے اپنے آپ کو گرفتار ہوتا دیکھا تو بستی کا ایک ڈیرے میں پناہ کی غرض سے گھس گیا وہاں فکیھۃ تھی۔ اس نے اس سے پناہ کی درخواست کی وہ اپنا کرتہ سلیک پر پھینک، تلوار کھینچ کر حملہ آوروں اور اس کے درمیان کھڑی ہو گئی جب حملہ آوروں نے اسے مجبور کیا تو اس نے نقاب کو نکال پھینکا اور سر کے بالوں کو پریشان کر کے مدد کے لیے چلائی تو اس کے بھائی آ گئے اور سلیک کو بچا لیا چنانچہ سلیک نے اس بارے میں کہا ہے۔

لعمر ابیك والانباء تنمى — لنعم الجار اخت بنی عوارا
من الخفرات لم تفضح اباها — ولم ترفع لاخوتها شنارا
كأن مجامع الاردان منها — نقىً درجت علیه الریح هارا
یعاف وصال ذات البذل قلبی — ویتبع الممنعة النوارا
وما عجزت فكیهة یوم قامت — بنصل السیف واستلبوا الخمارا

(خبریں تو بہت اڑائی جاتی ہیں لیکن تیرے باپ کی جان کی قسم بنو عوار کی بہن کی پڑوس کیا ہی اچھی پڑوس ہے۔ وہ ایسی باحیا عورتوں میں سے ہے۔ اس نے اپنے باپ کو کبھی رسوا نہیں کیا اور نہ اپنے بھائیوں کو عیب اور بدنامی کا دھبہ لگنے دیا۔ اس کے سرین ایک ٹیلہ ہیں جس پر سے ہوا ڈھلکتی ہوئی چلی ہے۔ ایسی شریف عورت کے ساتھ وصل کو میرا دل ناپسند کرتا اور ہمیشہ سے محفوظ ایسی پردہ نشین کے پیچھے پیچھے رہتا ہے اور اس دن فکیھۃ عاجز نہیں ہوئی جب وہ تلوار کھینچ کر کھڑی ہو گئی اور لوگوں نے اس کی اوڑھنی کھینچ لی)

جاہلی عرب کی عورتیں ذکی اور عقلمند ہوتی تھیں۔ ایسی بہت سی عورتیں اس دور میں پائی جاتی ہیں لیکن سب سے زیادہ مشہور حضرت ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ بنت خویلد تھیں وہ عقلمند اور ہوشیار ہونے کے علاوہ شریف اور مالدار بھی تھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مہلہل بن ربیعہ درخت کے نیچے سو رہا تھا اس کے دو غلاموں نے اس سے تنگ آ کر اسے قتل کرنا چاہا۔ انھوں نے اس کے دونوں ہاتھ پیر باندھ دیئے پوچھا "کیا کرتے ہو" بولے کہ تیرے ظلم کا بدلہ لیتے ہیں کہا "اگر تم مجھے مار ڈالو تو میری بیٹیوں کے پاس جانا اور میرے سلام کے بعد یہ شعر پڑھ دینا۔"

من مبلغ الاقوام ان مهلهلا — لله دركما ودر ابیكما

یہ دونوں مہلہل کو قتل کر کے اس کی بیٹیوں کے پاس گئے اور "واسملماہ، واستلاہ، وافارس الحرب" کہہ کر کر شور وشیون کرنے لگے۔ سب بیٹیاں تھیں کہ معاملہ کیا ہے جب ان غلاموں سے پوچھا گیا تو انھوں نے مہلہل کا وہ شعر پڑھ کر سنایا۔ کسی نے کچھ نہ سمجھا لیکن مہلہل کی چھوٹی بیٹی سب کچھ سمجھ گئی اور "واتکلاہ فسل ورب الکعبۃ" کہہ کر رونے لگی اور کہا کہ ان دونوں غلاموں کو ملدا ماردو کیونکہ یہی قاتل ہیں۔ میرے باپ کا اس شعر سے یہ مطلب ہے کہ۔

مَنْ مُبلغُ الاقوام ان مہلہلا ؛؛ اَضحیٰ قتیلا فی الفلاۃ مجدلا

للہ درکما ودرابیکما ؛؛ لایبرح العبدان حتی یقتلا

(کون میری قوموں کو خبر دینے والا ہے کہ مہلہل قتل کر دیا گیا ہے اور زمین پر مارا ہوا پڑا ہے۔ خدا کے واسطے تم دونوں کی اور تمھارے باپ کی نیکی ہے۔ یہ دونوں غلام اس وقت تک نہ جانے پائیں جب تک کہ تم انھیں قتل نہیں کر لیتے)

جاہلی عورت کا مختلف حیثیتوں سے مطالعہ کرنے کے بعد اس کے شعر وادب پر بھی روشنی ڈالنی ضروری ہے شعر وادب اور تمام علوم میں اس کا خاص حصہ رہا ہے۔ اس دور میں بہت سی عورتوں نے شعر کہنے میں نام پیدا کیا لیکن ان کا کلام ضائع ہو چکا ہے اور بہت ہی کم شاعرات کا کلام دستیاب ہوا ہے مثلاً کبشۃ اخت عمرو بن معدی کرب، جلیلۃ بنت مرۃ، جس نے اپنے بھائی کلیب پر بہترین مرثیہ کہا ہے۔ ان میں امیمۃ (امامۃ) بھی ہے جس نے اپنے شوہر "ابن الاطنابہ" کی جنگی سرگرمیوں پر بہترین شعر کہے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے بہتر اس مضمون کو کسی شعر میں ادا نہیں کیا

وانت الذی اخلفتنی ما وعدتنی ؛؛ واشمت بی من کان فیک یلوم

وابرزتنی للناس ثم ترکتنی ؛؛ لھم غرضا اُرمیٰ وانت سلیم

فلوان قولاً یکلم الجسم قد بدا ؛؛ بجسمی من قول الوشاۃ کلوم

(تم ہی تو ہو جس نے وعدہ کر کے مجھ سے کیا تھا پھر گئے اور تمھارے بارے میں لوگوں کی مجھ پر ملامت ہے اور میری تکلیف و مصیبت پر تمھاری خوشی ہے۔ میرا معاملہ لوگوں پر ظاہر ہو گیا۔ پھر تم نے مجھے چھوڑ دیا تاکہ لوگ اپنی بیہودہ گوئی کا مجھے نشانہ بنائیں اور تم بچے رہو۔ اگر کوئی بات جسم کو جراحت پہنچا سکتی ہے تو ان چغل خوروں کی باتوں نے میرے جسم پر کئی زخم کر دیئے)

خنساء اور خرنق بھی اپنی مرثیہ گوئی کے لیے مشہور ہیں۔ ان میں عورتوں کا ایک طبقہ ایسا بھی گذرا ہے جنھیں شعر خاص لگاؤ تھا اور آپس میں اشعار سنانے کے لیے دوسروں کے اشعار زبانی یاد کر لیا کرتی تھیں۔ اس غرض کے مجالس منعقد کی جاتی تھیں حضرت عائشہ کے متعلق روایت ہے کہ ان کو "لبید" کے تمام اشعار یاد تھے "العقد الفرید" میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا میں لبید کے ایک ہزار اشعار روایت کر سکتی ہوں اور یہ اشعار دوسرے شعراء کے مقابلے میں جن میں روایت کر سکتی ہوں بہت کم ہیں۔

جہاں ہم مردوں کو شاعروں کے حکم بنتے دیکھتے ہیں وہاں عورتیں بھی یہ فریضہ انجام دیتی ہوئی ملتی ہیں۔ ان میں ایسی عورتیں بھی گذری ہیں جن کے سامنے شعراء اشعر کا لقب حاصل کرنے کے لیے اپنا کلام پیش کرتے تھے چنانچہ "علقمۃ الفحل" اور "امرؤ القیس" دونوں نے "ام جندب" (امرؤ القیس کی بیوی) کے سامنے اشعر ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس نے کہا کہ تم دونوں ایک ایک قصیدہ ایک ہی بحر وقافیہ میں نظم کرو۔ دونوں نے اپنے اپنے قصیدے سنائے "ام جندب" نے

"علقمہ" نے جس پر حملہ کیا وہ ... [illegible]

تیر کرتا ہے وہاں علقمہ کا گھوڑا صف جنگ کے اشارے پر صولے مانق کرنے لگتا ہے

جاہلی عورت شعر و شاعری کے علاوہ خطابت سے بھی بہرہ ور تھی میدان جنگ میں مردوں کو لڑانے والی بھی عورت تھی جس نے اپنی پرجوش تقریر سے اپنی قوم کو دشمن کے مقابل ثابت قدم رکھا اور اس کو فاتح بنایا۔ "ھند بنت الخس" جس کو "الزرقاء" کہتے ہیں اور "جمعۃ بنت حابس"، دو مشہور خطیبات تھیں۔

یہ ہے جاہلیت کی مکمل عورت جو کہ شعر و ادب کے گلستاں میں اور کیا تیغ و سنان کے میداں میں، ہر جگہ مرد کے دوش بدوش ہے لیکن یہاں ایک بحث یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ عورت کا درجہ معاشرۂ جاہلیہ میں جب اس قدر بلند تھا تو پھر زندہ لڑکیوں کو دفنانے کا کیا سبب تھا؟ اس کا سبب کچھ تو وہ مخط سالیاں تھیں جن سے عربستان قلت بارش کی وجہ سے اکثر و بیشتر دوچار ہوا کرتا تھا اور کچھ تو یہ غیرت کا خیال بھی دامنگیر ہوتا تھا کہ باپ اس بات سے بھی ڈرتے تھے کہ کہیں ان کی بیٹیاں جنگ میں قیدی نہ بنالی جائیں اور اس طرح بے غیرتی کے مستوجب ہوں جیسا کہ ایک شاعر باپ جو غربت اور مفلسی کی کشمکش میں مبتلا ہے بہت موثر پیرایہ میں اپنی حالت بیان کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی اس سے پہلے مرجائے تاکہ لڑکی رشتہ داروں کے رحم و کرم کی دست نگر ہونے کی ذلت گوارا کرے

لولا أميمةُ لم أجزع من العدم   ولم أقاسِ الدجى في حندس الظلم

أحاذرُ الفقرَ يوماً أن يُلمّ بها   فيهتك الستر عن لحم على وضم

تهوى حياتي وأهوى موتها شفقاً   والموتُ أكرم نزال على الحرم

أخشى فظاظةَ عمٍّ أو جفاءَ أخٍ   وكنت أبقي عليها من أذى الكلم [1]

(اگر میری بیٹی امیمہ نہ ہوتی تو میں فقر سے نہ ڈرتا اور نہ ہی طلب مال میں نکلتا۔ مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ ایک دن امیمہ پر فقر کی بلا نازل ہو کر عصمت کا پردہ چاک کر دے وہ تو چاہتی ہے کہ میں اس کے لیے زندہ رہوں اور میں اس کی موت کا خواہش مند ہوں اس خوف سے کہ میں اسے فقر و ذلت کی حالت میں نہ دیکھوں اور موت عورتوں کے لیے اس حالت سے بہتر ہے مجھے چچا کی سختی اور بدخلقی کا ڈر ہے اور ادھر بھائی کی جفا کا بھی اندیشہ۔ میں تو اسے کوئی ایسا کلمہ بھی نہیں سنا سکتا جو اسے تکلیف دے چہ جائیکہ ان لوگوں کی بدخلقی اور سختیوں میں اسے مبتلا کروں)

غرض کہ جیسا کہ قرآن میں مذکور ہے لڑکی کی پیدائش ایک مصیبت سمجھی جاتی تھی وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ (اور جب ان میں کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جائے تو سارے دن اس کا چہرہ بے رونق رہے اور دل ہی دل میں گھٹتا رہے اور جس خبر کی اس کو خبر دی گئی ہو اس کے عار سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرے آیا اس کو ذلت پر لیے رہے یا اس کو زندہ یا مار کر مٹی میں گاڑ دے) بطور مقولہ کے کہا جاتا تھا کہ "دفن البنات من المكرمات"، "نعم الختن القبر" (بیٹیوں کا دفن کرنا مکرمات سے ہے، قبر کیسی اچھا داماد ہے) لیکن اسلام نے اس رسم بد کا استیصال کیا اور اس کی سخت ممانعت کر دی۔ "ولا تقتلوا أولادكم خشية إملاق"

---

[1] شاعر اسحق بن خلف، خلیفہ مامون الرشید کے عہد کا ہے گویا جاہلیت کا شاعر نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اس نے جاہلیت کے حالات کی تصویر کھینچی ہے۔ اس لیے اس کا یہاں ذکر کیا گیا

نحن نرزقهم وایاکم۔ ان قتلهم کان خطأً کبیرا (اور اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشے سے قتل مت کرو کیونکہ ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی بے شک ان کا قتل کرنا بڑا بھاری گناہ ہے)

ہم اس مضمون کو "شعری" کی لکھی ہوئی "امیمہ" کی نہایت حسین و دلکش تصویر پر ختم کرتے ہیں جس کا کرشمہ "صرف صحرا" کی آزادی ہی میں کھل کھیل سکتا ہے۔ شعری لکھتا ہے:۔

"اس نے اپنے چہرہ پر سے گھونگٹ کھینچ کر پرسکون اور ساکت نظروں کے ساتھ ـــ حرام مار کرتے ہوئے مجھے متوالا کر دیا ـــ اس کی نیچی نظریں گویا کسی گم شدہ شے کو تلاش کر رہی ہیں ـــ وہ ایک طرف کو جھکی جھکی نہیں رہتی ـــ ساتھ رہنے سے جواب دیتی ہے ـــ قحط اور ناداری کے زمانے میں صبح سویرے اٹھ کر اپنی کھانے کی چیز پڑوسیوں کو کھانا کھلا کر دیتی ہے ـــ برائی کی ہوا بھی اس کے حرم کو نہیں چھو سکتی حالانکہ پڑوس میں کئی گھر تاک لگائے ہیں ـــ اس کا شوہر اپنی بیوی کے بارے میں کسی افواہ سے نہیں ڈرتا کیونکہ "امیمہ" کا نام خالص اور پاک ہے ـــ وہ اپنے شوہر کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے ـــ شام کو جب وہ اس سے ملے تو وہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ تم نے دن کہاں گذارا؟ ـــ وہ چھریرے بدن کی اونچی پوری عورت ہے۔ اگر حسن انسان کو پریوں میں بدل سکتا تو وہ پری ہوتی"

فدقّت وجلّت واسبکرّت واکملت فلو جُنّ انسانٌ من الحسن جُنّت

انجمن ترقی اردو (حیدرآباد)

کی

مطبوعات

۱۔ "گوتم بدھ" طویل نظم (اردو اور ناگری رسم خط میں) از محمد فضل الرحمٰن — قیمت۔ ایک روپیہ

۲۔ "سقراط" (تین ایکٹ کا تاریخی ڈرامہ) از محمد فضل الرحمٰن — قیمت۔ ایک روپیہ چار آنے

۳۔ "روح ادب" حصہ اول و دوم۔ انتخاب نظم و نثر اردو — قیمت فی حصہ ایک روپیہ آٹھ آنے

۴۔ "چند شخصیتیں" سیاسی و ادبی — از قاضی محمد عبدالغفار — زیر طبع

۵۔ "لسانیات" — از پروفیسر عبدالقادر سروری — زیر طبع

۶۔ "سماجی انسانیات" — از فاطمہ شجاعت — زیر طبع

۷۔ "چنگیز" (پانچ ایکٹ کا تاریخی ڈرامہ) از محمد فضل الرحمٰن — قیمت۔ دو روپے

۸۔ "بچوں کی کتابیں" مرے۔ از کہانیاں۔ بچوں کے گیت۔ چند بڑے آدمی۔ ہونہار (ڈرامہ) — قیمت مکمل سٹ۔ دو روپے

مِلنے کا پتہ:-

اردو ہال حمایت نگر حیدرآباد دکن

اور حیدرآباد کے دوسرے کتب فروش

ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات

مقدمہ تاریخ دکن — از پروفیسر عبدالمجید صدیقی — قیمت ۔ عہ ۱۲ ر

..ل والوں کی تاریخ — از مولوی سید مراد علی صاحب طالع — قیمت ۔ عہ ۳ ر

حیدرآباد — از ڈاکٹر زینہ سلطانہ — قیمت ۔ ۱ ر

سلسلہ سوانح سلاطین آصفی — از مولوی سید مراد علی صاحب طالع — ہر کتاب کی قیمت ۲ ر مکمل ست عہ

مدار الملک سالار جنگ اعظم — از سید محمد صدیقی — قیمت مجلد ۔ ۸ ر

مدار الملک — از سید محمد صدیقی — قیمت ۔ ۸ ر

ہندوستانی تمدن — از ڈاکٹر ایشور ٹوپا ایم اے پی ایچ ڈی — قیمت ۔ تین روپے آٹھ آنے

ہندوستانی قومیت کا مسئلہ — از ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا — قیمت ۔ ۸ ر

اشوک اعظم — از سید مہدی جعفری ایم اے — قیمت ۔ ۸ ر

قبل جنگ سے پہلے — از پروفیسر ہارون خاں صاحب شیروانی — قیمت ۔ تین روپے آٹھ آنے

تاریخ سیاسیات — از پروفیسر عبدالمجید صدیقی — قیمت ۔ تین روپے آٹھ آنے

اسلامی عدل گستری — از محمد عبدالحفیظ صاحب صدیقی — قیمت ایک روپیہ دس آنے

مسلمان شاہی خاندان — از محمد عبدالرحمن خاں صاحب تو ترسیل کلیہ جامعہ عثمانیہ — قیمت ۔ پانچ روپے

دادا بھائی نوروزجی — از مولوی ظہیر الدین احمد صاحب — قیمت ۔ ۲ ر

ریاض مختاریہ — از لالہ زر علی دانش — قیمت ۔ پانچ روپے

بلقان — از عبد صدیقی صاحب — قیمت ۔ ۲ ر

بہمنی سلطنت — از پروفیسر عبدالمجید صدیقی — قیمت ۔ دو روپے آٹھ آنے

حیدرآباد فرخندہ بنیاد — از ڈاکٹر زور — قیمت دو روپے آٹھ آنے

حیات بخشی بیگم — از نصیر الدین ہاشمی — قیمت ۔ ۱۲ ر

تاریخ گولکنڈہ — از منشی شمس الدین — قیمت ۔ دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ادبیات اردو

خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

جگر مراد آبادی

دی شب بہ کنارم آمد آں شوخ — داماںِ حیا، بہ رخ کشیدہ
یک پیکرِ حسن و شعر و نغمہ — یک صنعتِ قدرت آفریدہ
یک حسنِ نگار و صد بہاراں — یک شوقِ من و ہزار دیدہ
از جوشِ خلوص مہر بر لب — وز کیفِ نشاط آبدیدہ
جنبش بہ نگاہِ ناتمامے — لرزش بہ لبِ سخن رسیدہ
گفتم کہ چساں گذشت بے من — گفتا بہ خیالت آرمیدہ۔!
آں ہم سخنے کہ از لطافت — دل محرم و گوش ناشنیدہ
واں ہم نگہے کہ در نزاکت — جز دیدۂ عشق کس نہ دیدہ
باز آ۔ کہ نگاہِ نارسایم — ہم دیدہ جمال و ہم نہ دیدہ

باز آ کہ زِ مدتے جگر ہست
دل خوں شدۂ وزِ خود رسیدہ

فراق گورکھپوری

کہوں اک رباعی سنو اک غزل

آنسو سے بھرے بھرے یہ نیناں رس کے — ساجن کب لے سکھی تھے اپنے بس کے
یہ جاڑے کی رات یہ برہ کی بپتا — جس طرح الٹ گئی ہو ناگن ڈس کے

آہ اجاڑے پاکھ برہ کی رین سکھی — میرے آنگن کیوں آئی ہے سہاگ جلی
بجھی بجھی سی سکھی پریم کی چنگاری — بھڑک اٹھی تو دنیا بھر میں آگ لگی
اپنے جنم دن سے تھی محبت مت ماری — دیکھا آؤ نہ تاؤ آگ میں کود پڑی
لپک رہے ہیں کرشن کی بنسی کے کوندے — انگ انگ میں راگنیاں ہیں بسی ہوئی
بات وہی تھی بن بن کے جو بگڑی ہے — آس وہی تھی جو بندھ بندھ کر ٹوٹ گئی
گھات میں ہے وہ ترچھی نظر برچھی تولے — بچ کے نکل اے پریم انی کی چوٹ بری
پریم پجاری نیم دھرم سے جیتا تھا — توڑ دیا ہر سنجم تجھ کو کیا سوجھی
من کو میں سمجھاؤں تو لیکن ڈر ہے — ہو نہ جائے آج آپس میں کچھ کہا سنی
روپ کامنی کا وہ عالم رات گئے — جوبن سے مدھ چھلکے آنکھیں نیند بھری
پریم ڈگر میں ساتھی کیسا موڑ آیا — گرے پچھاڑیں کھا کے ہمت چھوٹ گئی
آج پریم کی ملکوں ملکوں شہرت ہے — کل تک گھر میں بات نہ پوچھی جاتی تھی
بچتے ہیں جو ہال لابھ کے دھڑکوں میں — پریم کے داؤں لگاتے ہیں دیکھا دیکھی

صبا

ہوں یا ہوں کرشن کہ مجنوں یا ہم تم — ملن کے بعد بیوگ جگت کی ریت یہی
جب آنکھ پڑی اُس سُندر مکھڑے پر — ایک کرن اُجلے للاٹ پر بچھل گئی
ں کہوں کیا ایک سُجان نہیں ملتا — دل کی کون سُنے گا دنیا دیوانی
ہ سیتہ ہے لیکن اُس کے نام انیک — ایک ندی ہے لیکن اُس کے گھاٹ کئی
ی کو بھی بھرما دیتی ہے دنیا — نام رُوپ کی سکھیو یہ مایا نگری
ں اور بات کر پریتم، آنسو پونچھ — تیرے برہ میں پوچھ نہ مجھ پر کیا بیتی
ا رنگ روپ ہے اُس کا رُت سنگھار[1] — گونج رہی ہے بالوں میں گنگا لہری[2]
جھمٹ مارے تار کھڑی من مندر میں — اکثر راتوں کو یوں تیری سُدھ آئی
س کی پتلی کا سبھاؤ چلتا جادو — گھر بھر میں چنچل چپل سیج پر لاج بھری
ں کا بیر نکالا کب کی تھی آن بن — پریم دکھائی دیا کہ دنیا ٹوٹ پڑی
ں آپ بیتی نہ سمجھ ان باتوں کو — اس پردے میں کتنی ہوں میں جگ بیتی
ے سادھو سنت یہ کس کے میت ہوئے — ہم تم ابلا نار سکھی، پریتم جوگی

جل جل کر آکاش دیپ بجھ گئے فراقؔ
پو پھٹتی ہے جیسے برہن کی چھاتی

[1] دو مشہور نظموں کے نام - فراق

قاضی عبدالغفار

(قاضی صاحب اپنے ایام جوانی میں کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ ان کی ۱۹۱۹ء-۲۰ء کی ایک غزل جو ہمیں ان کی نواسی ثریا صاحبہ کی وساطت سے ملی ہے شائع کی جا رہی ہے۔ (ایڈیٹر)

کہانی دل کی آخر ایک شب یوں ختم ہو جائے
کہ جیسے طفل ناداں روتے روتے تھک کے سو جائے

کہیں سے ایک شب اے چشم گریاں مجھ کو تو لا دے
وہ اک آنسو جو نقش زندگی کو آ کے دھو جائے

عمل فطرت کا ہے کچھ جلوہ گاہ دہر میں ایسا
کہ بس اک لمحہ کھولے آنکھ غنچہ اور سو جائے

ورب زندگی راہ محبت سے نہ بھٹکا دے
متاعِ زخمِ دل اس کی امانت ہے نہ کھو جائے

مخدوم محی الدین

آج کی رات نہ جا

رات آئی ہے کئی راتوں کے بعد آئی ہے
دیر سے دور سے آئی ہے مگر آئی ہے
مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی اجالوں کا پیام آئے گا
آج کی رات نہ جا
زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی آبِ حیاتِ لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے
آج کی رات نہ جا
آج کی رات کئی راتوں کے بعد آئی ہے
کتنی فرخندہ ہے شب کتنی مبارک ہے سحر
وقف ہے میرے لیے تیری محبت کی نظر
آج کی رات نہ جا

سیّد علی منظور

دعوتِ موازنہ

(۱)

بہار جاں جو سن ہی عید آئی عروساں کا ہے خوب جوبن سمائی

بہار صبح نو ہے شب اختتام نئے گل رنگ نئے جلوے نئے جام

نئی محفل نیا مطرب نیا ساز نئے نغمے نئے شاعر نئی ان کی دنیا

نظارے بیخ صبح دم کی ہے نئی تمنا سمٹ کر آ گئی ہے

غم جاناں نہیں رازِ غمِ جاں سرور اکثر ہے دیدار جاناں

نہیں دیدارِ جاناں ہی دل آرا دیارِ حسن ہے الوان سارا

بیانِ ماہوش ناداں سے مسرور غم دوراں سے دور جام بدوش

بھلا عشق و مسرت میں کہاں عشق مسرت ہی مسرت بس یہی عشق

نظارے ہی نظارے دون ہی دون ہوئے جاتے ہیں پورے ارمان سب ہی

جوانی مل رہی ہے ان کی پیری ستارے آ رہے ہیں شادمانی مری!

(۲)

خوشی کے فلسفہ کا ہو کے ماہر بنا اک سنگ ہے افسردہ خاطر

مکاں میں اس کے بھی عید آئی لیکن پریشاں میں گزرا صدمہ کا دن

کئے جاتا ہے یہ پُرسوگ دود چراغِ آرزو دیتا نہیں لو

کرے محسوس دل میں جوش کیسا وہ اطمیناں کا لے کس طرح سانس

جگر میں جس کے خارِ غم ہو پیوست نہ گلگوں ایسا جسم و دل مست

نہ ہو خوشحال جس کا عہدِ ماضی رہے کیوں عہدِ حاضر اس سے راضی

امیدوں کی مدد لے جو ہو ملاش تہی دستی ہو اس کی خاک پاش

پرانا کوٹ شانہ بھی پرانا نیا آتا نہیں سادہ زمانہ

امارت جنگ سے چمکیں سویرے ہلاکت تنگ کا یہ حال ارے رے

کیا افلاس نے یوں اس کو پامال نظر آتا ہے بڈھا یہ جواں سال

خود اس کی ہی سمجھ کا ہے یہ سب پھیر
نئی ہو پر کسی تو کب تک اندھیر

اثر لکھنوی

اندھا دیوتا

(قاضی نذرالاسلام شاعر بنگال کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ)

ان رہرووں کے سوت سے جو ہمکنار ہیں — آلودہ خوں سے نقش قدم دیکھتا ہوا
پھانسی کی رسی ہاتھ میں اپنے لئے ہوئے — وہ گامزن ادھر کو وطن کا ہے دیوتا

•

معذور آنکھوں سے ہے، جبیں پر سیاہ داغ — صدیوں کی شرمناک غلامی کا اک نشاں
ہے رات اندھیری، ابر کے ٹکڑے ہیں جابجا — دھندلی سی کہکشاں ہے کہ شعلہ دھواں دھواں

•

ٹکراتا، ناپتا ہوا ان سب کے درمیاں — بڑھتا ہے دھیرے دھیرے غمناک دیوتا
اُس سمت بج رہا ہے جدھر ہڈیوں کا ساز — رستہ ٹٹولتا ہوا، کچھ سوچتا ہوا

•

وہ آلہ جس سے کرتا ہے دشمن وطن پہ وار — یہ دیوتا بھی لیتا سہارا اُسی کا ہے
منزل نہ جانے کون ہے، جانا ہے جس طرف — پر طرز حرب و ضرب سکھایا اسی کا ہے

•

ہر چند ہر قدم پہ ہے خطروں کا سامنا — بڑھتا ہے جوش بڑھتی ہوئی دقتوں کے ساتھ
رکتا ہے اور رک کے سنبھلتا ہے بار بار — پستی کی سمت بھی ہے نظر رفعتوں کے ساتھ

•

جب لڑکھڑا کے گرنے کو ہوتا ہے ناتواں — جو پائے مرگ تھامتا ہے اک شاک اُسے
سوتی تھی تیرہ غار میں اب تک جو زندگی — انگڑائی لے کے تکتی ہے وہ یک بیک اُسے

•

جس کال کوٹھری کی سلاخوں میں اک اسیر
زنجیر پا سے اپنی ہی کرتا ہے گفتگو
پھانسی کا تختہ غسل جو کرتا لہو سے ہے
پامال ظلم روح بھی، ہمراہِ آبرو

•

وحشی درندے کرتے ہیں ناخن جہاں پہ تیز
جس جا کہ زندہ عورتیں جلتی ہیں آگ میں
ممیاتے جانور ہیں بندھے بھینٹ کے لیے
اُس راہ سے گزرنا ہے دیوتا کے بھاگ میں

•

پَو پھٹنے کو ہے نیند کے ماتو اٹھو اٹھو!
کچھ ہوش ہے؟ وہ دیکھو شفق پھولی چرخ پر"
ہے اندھے دیوتا کی یہی دکھ بھری پکار
رہرو مگر ہیں پھر بھی بھٹکتے ادھر اُدھر

•

آواز دیوتا کی وہ پہچانتے نہیں
کس نے صدا دی اُن کو یہ مطلق نہیں خبر
"کوہ ندا" کی گونج تھی بس اس قدر ہے علم
ریجھے ہوئے ہیں باؤلے خود اپنی چال پر

•

دیوتا بلندیوں میں ہے پستی میں ہے ڈگر
منزل کا دے نشان تو کون ایسے حال میں
دلدل کہیں ہے راستے میں کھائیاں کہیں
فرصت کسے کہ دیکھے گھرے ہیں وبال میں

•

رہرو اِدھر تو جادہ اُدھر ہے رواں دواں
اس کارواں میں ہمدم و ہمدرد و ہم سفر
ہیں موت اور شباب، شفق، اندھا دیوتا
دیکھیں کہاں ہو بھور، کہاں رات ہو بسر

•

احمد ندیم قاسمی

قطعات

ایٹم

ذرۂ خاک میں ادراک کی حدّت بھر کر
اپنی تخلیق کے شعلوں میں نہ جل جاؤ کہیں
روشنی ہی سہی اس دور کی تہذیب کا رُوپ
موم کی طرح چمک کر نہ پگھل جاؤ کہیں

راکٹ

آدمی جو ہوا سے بھی نکل جائیں گے
چاند پر عظمت آدم کا علَم لہرانے
قابل داد ہے یہ جرأت پرواز مگر
چاندنی کو بھی کہیں بانٹ نہ لیں دیوانے

آنند نرائن مُلّا

آزار ہیں نئے تو ہیں چارے نئے نئے
ملتے ہیں زندگی کو سہارے نئے نئے
جب بھی گھری ہے موجوں میں کشتی حیات کی
ابھرے ہیں موج ہی سے کنارے نئے نئے
لائے گی تیرگی ہی مداوائے تیرگی
یہ رات خود جنے گی ستارے نئے نئے
یہ خارزار آپ ہی اگلے گا لالہ زار
پھوٹیں گے تہ سے دشت کی دھارے نئے نئے
ہونے دو دہر سازِ ماضی کو رزقِ خاک
یہ آندھیاں لیے ہیں منارے نئے نئے
عزم جواں ہو دل میں تو راہیں نئی نئی
نظروں میں تاب ہو تو نظارے نئے نئے

منزل بہت قریب ہے اب گام گام پر
رہرو کو مل رہے ہیں سہارے نئے نئے

تمکین سرمست

مقام ہوش میں پوچھو نہ دیوانوں پہ کیا گزری
جب آئی شمع محفل میں تو پروانوں پہ کیا گزری
سکون دل کی بیتابی دلِ بیتاب کیا جانے
مرادِ دل ہوئی حاصل تو ارمانوں پہ کیا گزری
نگاہ لطف کے صدقے نگاہ لطف سے تیرے
خبر بھی ہے تجھے تیرے پشیمانوں پہ کیا گزری
ابھی جوشِ جنوں، دردِ محبت اور بڑھنے دو
یہ دامن خود بتا دیں گے گریبانوں پہ کیا گزری
خزاں میں گلستانوں پر جو بیتی سب پہ ظاہر ہے
کسی کو کیا خبر لیکن بیابانوں پہ کیا گزری
یہ باقی رات کٹ جائے ذرا سورج نکل آئے
پھر اک شمع خود کہہ دے گی پروانوں پہ کیا گزری
سرِ دریا تشنگی پوچھے کوئی سیراب کے دل سے
کہ جب خم ہو گئے خالی تو پیمانوں پہ کیا گزری
جو کچھ گزری سو گزری مجھ پہ لیکن کیا کہوں تمکیں
مرے ضبطِ مسلسل سے ستمرانوں پہ کیا گزری

ساغر نظامی

ان سے پھر کچھ معاہدات ہوئے　　پھر وہ مائل بہ التفات ہوئے

پھر اسیرِ توہمات ہوئے　　پھر ہلاکِ تصورات ہوئے

حاصلِ رمزِ کائنات ہوئے　　جو نظر سے مکالمات ہوئے

چشمِ نم یہ جھکی جھکی نظریں　　از سرِ نو معاملات ہوئے

سب کو مارا ترے تغافل نے　　ہم شہیدِ تعلقات ہوئے

شب کو ہم بھی تھے ان کی محفل میں　　کیا کہیں کیا تکلفات ہوئے

دل کے جذبے سمٹ کے راز بنے　　اور جو بکھرے تو کائنات ہوئے

تیرے رخ کی ضیا سے صبح ہوئی　　تیرے گیسو بکھر کے رات ہوئے

چند پرتو ترے تبسم کے　　ماہ و خورشید کائنات ہوئے

آ رہے تھے ہمیں جفا میں مزے　　کیوں وہ مائل بہ التفات ہوئے

دل کی بربادیوں کا رونا کیا　　ایسے کتنے ہی واقعات ہوئے

ہجر کی شب دبے دبے نالے　　حاصلِ شورِ کائنات ہوئے

پھر کہیں اہتمامِ طور کرو　　ہو گئی عمر ان سے بات ہوئے

ابھی تھے اور ابھی نہیں کچھ بھی　　یہ بھی کوئی تعلقات ہوئے!؟

کیا اسے انتظار کہتے ہیں　　جیسے جگ ہو گئے ہوں رات ہوئے

دورِ ساغر کو انقلاب نہیں
ورنہ کتنے تغیرات ہوئے!؟!

شاد عارفی

تری نگاہ میں احساس کا لہو پا کر
کہیں شراب نہ پینے لگوں میں گھبرا کر
جبینِ شوق کو جاتو رہے ہو ٹھکرا کر
رہے لحاظ پلٹنا پڑے گا پچھتا کر
کلی کلی نے چھپایا ہے رازِ نکہت و رنگ
حقیقتوں کو تامل کے بعد رسوا کر
نوازنے کا یہ مطلب سمجھا نہ جائے گا
کہ اپنے آپ سے جاتا رہوں تجھے پا کر
یہ میکدہ کہ جہاں دیر بھی ہے کعبہ بھی
تو اس کو عیب لگانے چلا ہے ۔ توبہ کر
وہ کیا ہنسیں گے جنھیں تازگی نصیب نہیں
وہ کیا کہیں گے جو دل رہ گئے ہیں مرجھا کر
کبھی تو میری طرف بھی نگاہِ ناز اٹھا
شعورِ بزم کی بابت کبھی تو سوچا کر
بُرے پہ نامِ خزاں کا نکل گیا ورنہ
چمن چمن سے بہاریں گئی ہیں ٹھکرا کر
ہوا وہ حسن کا عالم کہ شاد کیا کہیے
مری نگاہ کی برجستگی سے شرما کر

جاں نثار اختر

ہزار پردۂ محمل اٹھے ہوئے ہیں تو کیا
وہ میری لیلیٰ آشفتہ سر کہاں سے ملے
نظر نظر میں حسینوں کی، سو تقاضے ہیں
جو مجھ سے کچھ نہ کہے وہ نظر کہاں سے ملے
میں لے کے جاؤں کہاں اپنے دل کے ٹکڑوں کو
مجھے ملے تو میرا شیشہ گر کہاں سے ملے
غزل میں کیجئے اجمالِ دل بیاں بھی تو کیا
وہ دادرس نگہِ مختصر کہاں سے ملے

قتیل شفائی

بھروسہ

ایک پتنگا
تنہا تنہا
شام ڈھلے اِس فکر میں تھا
یہ تنہائی کیسے کٹے گی ؟

رات ہوئی
اور شمع جلی
مغموم پتنگا جھوم اٹھا
ہنستے ہنستے رات کٹے گی

صبح ہوئی
اور سب نے دیکھا
راکھ پتنگے کی اُڑ اُڑ کر
شمع کو ہر سو ڈھونڈ رہی تھی

جگن ناتھ آزاد

ترکِ وطن

حضرت جوش ملیح آبادی کے ہندوستان سے پاکستان تشریف لیجانے پر

یہ میں ہر گوشۂ دہلی سے کیا آواز سنتا ہوں ÷ وطن کو ناز تھا جس پر وطن سے آج جاتا ہے
یہ ایسی بات ہے جس کا یقیں مشکل سے آئے گا ÷ چمن سے بلبلِ رنگیں نوا دامن چھڑاتا ہے

•

مری بزمِ وفا سے جانے والے! اک ذرا تھم جا ÷ کہ جو کچھ سن رہے ہیں کان میں اس کا یقیں کر لوں
اگر اس بات میں اے جانے والے! کچھ صداقت ہو ÷ تو پھر میں اپنا دل سنگیں کلیجہ آہنیں کر لوں

•

وطن کی سرزمیں کو چھوڑنے والے! خبر بھی ہے ÷ وطن کی سرزمیں کو چھوڑنا کتنی اذیت ہے
کہاں ممکن کہ لفظوں کی زباں اس کو بیاں کر دے ÷ وطن کی سرزمیں کو چھوڑنا جتنی اذیت ہے

•

یہ مجھ سے پوچھ تو جس سے لڑکپن میں وطن چھوٹا ÷ کہ یہ غم زندگی بھر چین سے رہنے نہیں دیتا
یہ وہ کانٹا ہے جو تا زیست پہلو میں کھٹکتا ہے ÷ خوشی کی موج میں احساس کو بہنے نہیں دیتا

•

وطن سے رشتۂ شاعر کچھ ایسا پاک رشتہ ہے ÷ کہ اس میں کاہشِ سود و زیاں باقی نہیں رہتی
کوئی سمجھے تو یہ رشتہ کچھ اس صورت کا رشتہ ہے ÷ کہ اس میں کچھ مجال این و آں باقی نہیں رہتی

•

یہ رشتہ محض لفظوں کا نہیں ہے دل کا رشتہ ہے ؎ یہاں الفاظ کا آئین کوئی چل نہیں سکتا
گل و بلبل کا ہے یہ شمع و پروانہ کا رشتہ ہے ؎ یہاں دل کے سوا آئین کوئی چل نہیں سکتا

•

بآسانی وطن کی سرزمیں کو چھوڑنے والے ؎ وطن کی سرزمیں کو چھوڑنا آساں نہیں ہوتا
فقط دل کا وطن کی خاک سے پیمان ہوتا ہے ؎ تجارت کا وطن کی خاک سے پیماں نہیں ہوتا

•

ہزار انسان شاہی قصر سے وابستہ ہو جائے ؎ لڑکپن جن میں کھیلا ہو وہ گلیاں یاد آتی ہیں
زر و لعل و گہر کب آنسوؤں کو روک سکتے ہیں ؎ گذشتہ دور کی جب رنگ رلیاں یاد آتی ہیں

•

وطن شاعر کی منزل ہے وطن شاعر کا جادہ ہے ؎ وطن کشتی ہے شاعر کی وطن ساحل ہے شاعر کا
وطن کی خاک سے میں کیا بتاؤں رشتۂ شاعر ؎ وطن کا جو بھی ذرہ ہے دھڑکتا دل ہے شاعر کا

•

وطن کو چھوڑنے والے! ذرا مجھ کو بتاتا جا ؎ ہوائے صبحدم یادِ وطن لائی تو کیا ہوگا
دُعا یہ ہے نئی دنیا مبارک ہو تجھے لیکن ؎ وہاں کی بھی فضا تجھ کو نہ راس آئی تو کیا ہوگا

•

سلام مچھلی شہری

یہ منزل

خود فریبی کیلئے اب کوئی ساماں بھی نہیں
غمِ جاناں بھی نہیں ہے، غمِ دوراں بھی نہیں
ہائے یہ منزلِ ہستی کہ جہاں پر آکر
یہ گماں ہوتا ہے جیسے کہ میں انساں بھی نہیں

ایسا کچھ ساحرۂ وقت نے پھونکا افسوں
کوئی کیفیتِ رنگیں ہے نہ دل کی نہ جنوں
سوچ کہتی ہے کہ تم پھول تھے احساس کا پھول
آئینہ وقت کا کہتا ہے کہ میں پتھر ہوں

تیز رفتار فضاؤ! مجھے آواز نہ دو
اب مرے پاس کوئی گیت نہیں، ساز نہ دو
منفرد موت ہے یہ میری، مجھے مرنے دو
فکرِ خاموش کو اب قوتِ پرواز نہ دو

ساتھ میں وقت کا دے پاؤں، مجھے ڈھنگ نہیں
اپنی تقصیر ہے، دنیا سے کوئی جنگ نہیں
سازِ حاضر ہمہ شعلہ، ہمہ طوفاں لیکن
میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی آہنگ نہیں

میں یہ کہتا ہوں کہ ہم ایسے کلاکاروں کو
غمِ جاناں بھی نہیں ہے، غمِ دوراں بھی نہیں
خود فریبی سے نہ ٹل پائے گی افکار کی موت
دل کو بہلانے کا اس میں کوئی امکاں بھی نہیں

ظہیر کاشمیری

ملبوس کی سلوٹ سلوٹ میں پنہاں غمِ دوراں دیکھا ہے
ہر شوخ کا داماں دیکھا ہے، ہر بُت کا گریباں دیکھا ہے

آزادِ گلستاں کا دامن، ممنونِ کفِ صیّاد نہ ہو
ہر شاخ کو لرزاں دیکھا ہے، ہر پھول کو گریاں دیکھا ہے

اے دوست، غمِ جاناں سے کبھی، پل بھر کیلئے فرصت جو ملی
دنیا کے غموں کا نشتر بھی، نزدیک رگِ جاں دیکھا ہے

یہ سود و زیاں کی بستی ہے یا شعبدۂ نیرنگِ نظر
تاریک اجالوں کے پیچھے، ظلمت کو فروزاں دیکھا ہے

اب عشق ہوا تسکین بجاں اب حسن ہے آوارہ سا دھواں
خورشید میں خنکی دیکھی ہے، مہتاب کو سوزاں دیکھا ہے

یہ موسمِ گل، یہ جشنِ طرب، یہ روشنیوں کا سیلِ رواں
سینوں میں الاؤ دیکھے ہیں، پلکوں پہ چراغاں دیکھا ہے

گیسو تھے کہ پیچاں زنجیریں، قد تھا کہ فرازِ دار لیے
ہم ایسے دردپرستوں نے، یوں جلوۂ جاناں دیکھا ہے

پہلے تھا ظہیرؔ احساسِ زیاں اب ہیچ ہے دولتِ کون و مکاں
جب غیر کا داماں دیکھا تھا، اب اپنا گریباں دیکھا ہے

شاہد صدیقی

مستیوں کے دامن میں انقلاب پلتے ہیں
میکشوں کی لغزش سے میکدے سنبھلتے ہیں

کیوں ہمارے ساتھ ایسے سست گام چلتے ہیں
جو سفر سے گھبرا کر راستے بدلتے ہیں

ظلمتیں اجالوں پر فتح پا نہیں سکتیں
اک چراغ بجھتا ہے سو چراغ جلتے ہیں

دیکھیے کہاں پہنچیں یہ سفر کے دیوانے
آسماں کو تکتے ہیں اور زمیں پہ چلتے ہیں

کیا ہوا جو ساکن ہے آج سطح دریا کی
تہہ میں کتنے ہی طوفان کروٹیں بدلتے ہیں

زندگی کو ڈھلنا ہے آج ان کے سانچوں میں
زندگی کی گرمی سے جن کے دل پگھلتے ہیں

ایک پل کے رکنے سے دور ہو گئی منزل
صرف ہم نہیں چلتے، راستے بھی چلتے ہیں

آشنا ہیں پروانے سوزِ غم کی عظمت سے
شمع ہو تو جلتے ہیں اور نہ ہو تو جلتے ہیں

پروین شاکر

وہ چشمِ سرمگیں جو بہ ظاہر ادھر نہ تھی
دل ہی سے ہمکلام تھی، مجھ کو خبر نہ تھی

جب تک شریکِ حال کسی کی نظر نہ تھی
تھی زندگی حسین، مگر اس قدر نہ تھی

میں خود حجابِ دوست سے محجوب ہو گیا
ورنہ حکایتِ غمِ دل مختصر نہ تھی

اب حُسن لے رہا ہے جفاؤں کا جائزہ
کل تک مری حدیثِ وفا معتبر نہ تھی

اُکسا رہی ہے آج فضا التفات کی
کل تک حیات کو ہوسِ بال و پر نہ تھی

اب کاروانِ گیسو و عارض میں ہوں شریک
پہلے یہ خوش سلوکیٔ شام و سحر نہ تھی

پلکوں سے میں نے چُنی جہاں کل چُنے تھے خواب
کیوں کر یہ مان لوں وہ تری رہگذر نہ تھی

اب ہم نوا ہیں اس دلِ نازک کی دھڑکنیں
کل تک خود اپنے دل کی تڑپ نغمہ گر نہ تھی

اب چاک پیرہن کی ہنسی پر ہیں رو رہے
وہ دن گئے جب ان کی نظر بخیہ گر نہ تھی

نظر حیدرآبادی

ایک رات

شکوۂ بختِ نارسا کب تک — وا رہیں گے لبِ دعا کب تک
دلِ محزوں خدا سے پوچھ نہ لے — سازِ بیگانۂ صدا کب تک
بے نوائی کی یہ سزا کب تک!

نور و نکہت کی انجمن سے دور — عشرتِ خلد کے وطن سے دور
کیوں تڑپتا رہے کوئی طائر — سرزمینِ گل و سمن سے دور
دور ہنگامۂ چمن سے دور!

ظرفِ غم آزمائے جاتی ہے — زخم پر زخم کھائے جاتی ہے
تمتمائے شعاعِ صبحِ امید — زندگی لڑکھڑائے جاتی ہے
رات کیا کیا ستائے جاتی ہے!

دل سے کیا یہ غبار اترے گا — بارِ فکرِ فرار اترے گا
بول اے آسماں کہ کب آخر — نشۂ سوگوار اترے گا
چاندنی کا خمار اترے گا!

پھر فضاؤں میں گیت لہرائے — ہائے اب کس طرح سے چین آئے
کتنے ظالم ہیں کشتگانِ فراق — نور آواز میں چرا لائے
کاش یہ ماہتاب جل جائے!!

خلیل الرحمٰن اعظمی

بن لکھی کہانی

وہی مٹی کا پیارا گھر
نگاہوں میں ابھی تک پھر رہا ہے
وہی سوندھی سی خوشبو اب بھی میرے پیرہن میں ہے
مرے پیارے وطن، اے میرے پیارے گاؤں میں تجھ کو نہیں بھولا

مرے وہ دن جو تیرے ساتھ گزرے ہیں
میں ان کی ایک اک تصویر سینے سے لگائے ہوں
یہ تصویریں چھپا کر میں نے اپنے دل میں رکھی ہیں
یہ وہ البم ہے
جس کو سب کی نظروں سے بچا کر
میں کبھی تنہا الٹ لیتا ہوں
اور اپنا وہ چہرہ دیکھ لیتا ہوں
کنول کے پھول کے مانند جو اک روز تازہ تھا
جسے اب کوئی میرا ہم وطن دیکھے
تو کہہ دے یہ تو کوئی اور ہے
اس شخص کا اُس کھیت اور باغوں کی بستی سے ہے کیا رشتہ
یہ البم اس لیے بھی میں چھپا کر سب سے رکھتا ہوں

کہ یہ تو شہر ہے یاں ہر طرح کے لوگ بستے ہیں
مری معصوم تصویریں نمائش گاہ کی زینت نہ بن جائیں
کوئی ان کی مدد سے ایک افسانہ نہ لکھ ڈالے

وہ جاڑوں کی سہانی راتیں اب تک یاد آتی ہیں
مری ماں اک کہانی مجھ سے کہتی تھی
کوئی شہزادہ تھا
جو اک پری کا ذکر سن کر گھر سے نکلا تھا
مگر جب چلتے چلتے وہ پری کے دیس میں پہنچا
تو اس پر ایسے دیوؤں کا پڑا سایہ
جنھوں نے اس کو پتھر کا بنا ڈالا

مجھے جب یہ کہانی یاد آتی ہے
مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ میں بھی شاہزادہ تھا
یہاں سے دور میری راجدھانی تھی
جہاں کی لہلہاتی کھیتیوں پر میری اک دن حکمرانی تھی
مگر جب علم و فن کی اک پری کا تذکرہ سن کر
یہاں آیا تو شہر علم و فن کے دیوتاؤں نے
غم دوراں سے سازش کر کے کچھ کا کچھ بنا ڈالا
میں اپنے گھر کو اب کیا منہ دکھاؤں گا؟

قاضی سلیم

دل کا کیا رنگ کروں

داغِ دل نذر کروں تجھ کو کہ خوابوں کا لہو
نہیں کچھ بھی تو مرے پاس بجز ذوقِ طلب
ہوں نبرد آزما محرومی و مجبوری سے
کیسے سمجھاؤں عناں گیر اصولوں کا سبب
دلِ شوریدہ ہے خاموش تو بے وجہ نہیں
ہو گی اس میں بھی کوئی مصلحتِ ہر لب
کسی سمجھوتے پہ مائل ہی نہیں میرا جنوں
ورنہ افسردہ نہیں آج بھی وہ روحِ طرب

تشنگیٔ مقصدِ کامل کی قسم کھاتی ہے
عزم کی آہنی دیوار بنی جاتی ہے

ریزہ ریزہ ہیں ابھی حسنِ لطافت کے زجاج
آج سنگینیٔ حالات سے ہے کس کو مفر
تیرے خوابوں کے لیے فرصتِ تعبیر کہاں
ابھی ارمانوں کی قیمت ہے فقط دیدۂ تر

کچھ نہیں آج گرانبار تردد کے سوا
جو بھی تھوڑی سی لطافت ہے ترا پرتو ہے
فکرِ ویرانیٔ ماحول سے آزردہ نہ ہو
اپنا احساسِ محبت تو گلِ خودرو ہے
ماہ و انجم کی دمک صبح کی محتاج نہیں
سینۂ شب میں جو پیوست ہے ایسی ضو ہے
رہیں پائندہ یہ معصوم تمنائیں تری
ان کی تابش ہی مری شمعِ یقیں کی لو ہے

میں نہیں دوں گا حوادث کو محبت کا خراج
ہاں مگر چاہیے اب شعلہ و آہن کا مزاج

دلِ گرفتہ نہ ہو بے سود نہیں تیری وفا
ہوں گے یہ عہد یہ پیمان مرے زادِ سفر
سہل ہو جائے گی ہر منزلِ دشوار گذر
ہو گی جب سایہ فگن یادِ سرِ راہ گذر

نرش کمار شاد

فرقِ غم و نشاط تو کہنے کی بات ہے
ورنہ ترا ستم بھی ترا التفات ہے

تحلیل کر چکا ہوں جسے اپنی ذات میں
شاید اسی کا نام غمِ کائنات ہے

مے تو ہے مے خلوص سے ساقی اگر ملے
ہم میکشوں کو زہر بھی آبِ حیات ہے

یاروں کی بے پناہ نوازش کے باوجود
میری تباہیوں میں مرا اپنا ہات ہے

دل نے بنا دیا ہے محبت کا دل مجھے
ہر وارداتِ شوق مری واردات ہے

لے دے کے رہ گیا ہے ترے غم کا آسرا
سنتے ہیں تیرا غم بھی مگر بے ثبات ہے

ہم تیرہ بخت نور کے پیغامبر بھی ہیں
اے شادؔ ہم پہ ختم یہ تاریک رات ہے

کمال احمد صدیقی

آج دلھن کی طرح رات آئی
چاند تاروں کی اک برات آئی

رخِ ہستی سے اٹھ گیا گھونگھٹ
مسکراتی ہوئی حیات آئی

زندگی آئی ہے شبستاں میں
اور خوشی اس کے سات سات آئی

جام کھنکے ہیں جام چھلکے ہیں
اپنے قبضہ میں کائنات آئی

لب پہ شکوہ نہیں تبسّم ہے
زندگی آج اپنے ہات آئی

دیپ جلتے ہیں، رنگ کھلتے ہیں
کتنی سج دھج کے آج رات آئی

طاہر علی خان مسلم

نہیں نہیں نہیں نہیں اُدھر ہر ایک بات پر
مدارِ زندگی اِدھر امیدِ التفات پر

کسی کے عشق میں نفس نفس مرا رچا ہوا
کسی کا حسن ہے محیط میری کائنات پر

مآلِ فصلِ گل یہ ہے چمن میں آج رو دیا
تو کھلکھلا کے ہنس پڑی کلی مرے ثبات پر

ضیائے مہر و ماہ کو لئے وہ جلوہ گر ہوئے
یقینِ سحر کا ہو رہا ہے مجھکو اپنی رات پر

تمام شکوے لب تک آ کے ہو رہے ہیں شکرِ غم
رکھا جو مسکرا کے ہاتھ اُس نے میرے ہاتھ پر

بغیر موت کے کہاں نشاط و کیفِ زندگی
مدارِ رقصِ مرگ کا ہے نغمۂ حیات پر

سنا کے مسلم اور بھی فزوں ملال ہو گیا
ہنسی نہ ضبط کر سکے وہ غم کی واردات پر

یعقوب عثمانی

بہاروں کی کشش کیا واقعی کم ہوتی جاتی ہے
چمن سے خود بخود وابستگی کم ہوتی جاتی ہے

میں پھر بھی ڈر رہا ہوں پاسِ آدابِ محبت سے
بظاہر شوق کی بے رہروی کم ہوتی جاتی ہے

کہاں سے لاؤں وہ گل پاشیاں عرضِ تمنا کی
مزاجِ حسن کی وارفتگی کم ہوتی جاتی ہے

انھیں یہ زعم جیسے دل کو ہر دولت عطا کر دی
مجھے یہ وہم جیسے ہر خوشی کم ہوتی جاتی ہے

تبسم چھیڑتا رہتا ہے اکثر آ کے ہونٹوں پر
فغانِ زیرِ لب کی ناخوشی کم ہوتی جاتی ہے

تم ہی ڈھارس بندھا دو اپنے منظر تابِ جلووں کی
اندھیرا بڑھ رہا ہے روشنی کم ہوتی جاتی ہے

متیان سروش

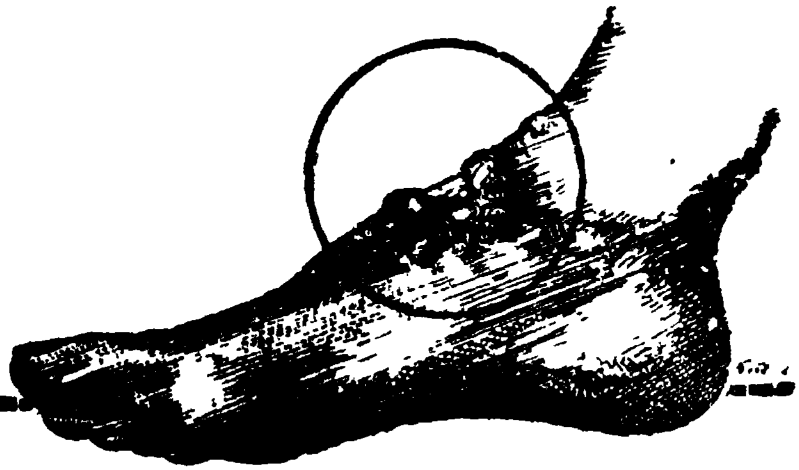
لب نازک پہ آیا ہے ہمارا نام بھی اکثر
مِلا ہے بے خودیٔ عشق کا پیغام بھی اکثر
کسی کی ہم نشینی دلنوازی کے تصدق میں
شبِ مہ بن گئی جامِ مئے گلفام بھی اکثر
جل اٹھے شمع اک جیسے شبستانِ بہاراں میں
تمہاری یاد میں آیا ہے وہ ہنگام بھی اکثر
زمانہ کیا تری دوشیزگی پر کشتۂ جلوہ تھا
تمسخر کے بزمِ دوراں تھا دلِ خودکام بھی اکثر
بفیضِ محرمِ ہمت یوں بسر کی زندگی ہم نے
کہ چوما ہے ہمارا ہاتھ گردشِ ایام نے اکثر
چراغِ آرزو جب روشنی اپنی لٹاتا ہے
دیا سا جگمگاتا ہے مرا آلام بھی اکثر
شعورِ زندگی گھبرا اسیری کی سکت دانی سے
بجھی جل جل کے ورنہ مشعلِ الہام بھی اکثر
سروش اپنے وطن میں دور ہجوم کم نگاہی ہے
ہنر بنتا ہے ان میں معرضِ دشنام بھی اکثر

مجیب خیرآبادی

مرے ساتھیوں سے کہہ دو، یہ بجا کہ تیز خرام ہوں
مرے ساتھ ساتھ چلے چلو میں نئی سحر کا پیام ہوں
مرے نقشِ پا نہ مٹے اگر تو چمک اٹھیں گے یہ راستے
مرے قافلہ کو خبر کرو میں حریفِ ظلمتِ شام ہوں
وہی روز و شب وہی ظلمتیں وہی مرحلے وہی گردشیں
جو کبھی تمام نہ ہو سکے وہ حدیثِ نیم تمام ہوں
تجھے کچھ خبر بھی ہے، جانِ جاں ترا غم ہے آج غمِ جہاں
ترے عشق ہی کا یہ فیض ہے کہ میں ترجمانِ عوام ہوں
تو رفیقِ راہِ سفر بنے تو کچھ اور لطفِ سفر بڑھے
جو گزر گہِ مہ و مہر ہے میں وہیں پہ محوِ خرام ہوں
دلِ دردمند کو آج بھی ہے مجیب حسرتِ رازداں
میں وہ ایک نغمۂ آرزو کہ خود اپنے لب پہ حرام ہوں



اعلیٰ مشینوں سے اعلیٰ معیار کی عینکیں
بنانیوالے آپ کے شہر کے واحد مینوفیکچررس
عینک محل
چوراہا عابد روڈ حیدرآباد دکن
ارجنٹ آرڈر کی تکمیل
۲۴ گھنٹے میں
OPTICAL PALACE



زخم جو بھرنے کا نام نہیں لیتے!

● اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کہ مرہم پٹی کے باوجود زخم بھرنے کا نام نہیں لیتے اس کا سبب یہ ہوتا ہے۔ کہ خون میں فاسد مادّہ کی اس قدر بہتات ہوتی ہے جو بیرونی مرہموں کے اثر کو زائل کر دیتی ہے۔

صافی

خون سے فاسد مادّہ کو تیزی سے خارج کرتی ہے اور اس طرح زخم کے بھرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ یہ قبض کو دور کرتی ہے۔ معدہ کے دل کو درست بناتی ہے اور جسم میں تازہ خون کی لہر دوڑاتی ہے۔



ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

Hamdard

عصمت چغتائی

مدن منجری

مدن منجری نے ایک لمبی چوڑی انگڑائی لی اور کتے کی طرح منہ پھاڑ کر ہو ہو کر کے جماہیاں لینا شروع کیں پھر اونچے سُروں میں کوئی فلمی گیت الاپنے لگی۔ اس کی آواز نہایت بھدی ہے کھردری اور رادیکی۔ فلموں میں لتا جانے کیسے اس کے لئے کھنکھنانے رسیلے گانے گاتی ہے میں اسے غور سے دیکھتی رہی وہ مجھے کسی زاویئے سے خطرناک، معصوموں کو ڈسنے والی ناگن نظر آئی سیوتوں سی شکل سانولا سلونا رنگ پیلا سا جسم سپاٹ سینہ، مگر آنکھیں بلا کی چنچل بالکل ناچتی پھرتی بے کل کبوتریوں کی طرح۔ کہتے ہیں دنیا میں آنکھوں کی ہی ساری تعدہ ماری ہے۔ یہی آنکھیں کہیں چھری، کہیں کٹار بن کر دلوں کے پار ہو جاتی ہیں اور شاید ان آنکھوں کے بل بوتے پر آج مدن لوگوں کو الو بناتی پھرتی ہے

اس کے بارے میں اتنی سنا تھا کہ حسن بس حسن کہ میں سوچتی تھی وہ جانے کتنی حسین ہوگی سونے، موتیوں میں غرق جادو بھرے عطروں میں ڈوبی۔ بالکل دودھاری تلوار کی طرح تیز اور بے رحم۔ مگر مدن منجری کو دیکھ کر میری ساری قیاس آرائیوں پر پانی پھر گیا اونچی شلوار جو اگر ٹھیک مقام پر باندھی جاتی تو پنڈلیوں سے اوپر اچک جاتی۔ بیچ بیچ دامن کی لٹکتے ہوئے سستے ریشم کی قمیص اور بھدا پیلا سا دوپٹہ جو یقیناً پرانی ساڑی کو پھاڑ کر بنایا گیا تھا کیونکہ ایک طرف جھونٹے لگے کا آدھا ترچھا کام جھول رہا تھا اور دوسرا سرا سو بہرہ پے پیٹا ہوا تھا میں نے ایک نظر میں اس کو بھانپ لیا وہ کسی طرح بھی قتالۂ عالم نہیں لگ رہی تھی بالکل میونسپلٹی کے اسکولوں میں پڑھنے والی پھوہڑ ماں باپ کی لڑکی ایسی ہی سہمی اور جھینپی ہوئی

پہلے تو یقین نہ آیا کہ وہ مدن منجری ہی ہے میں سمجھی اس کی آیا دایا ہوگی ایک دن وہ استری لینے آئی اور بہت سے لوگوں کو گھر میں بیٹھا دیکھ کر جھجک گئی

"آپا سلام" اس نے بڑے ادب سے کہا "ذرا اپنی استری دیجئے ہماری استری کے تار چھوٹ گئے ہیں ابھی دے جاؤں گی۔"

"تمہاری میم صاحب کیسی ہیں؟" میں نے استری دیتے ہوئے پوچھا۔

"کون میم صاحب؟"

"مدن منجری!"

"کون میں؟"

"نہیں۔" میں نے جلدی سے بات بدلی "وہ جو آتی رہتی ہیں تمہارے ہاں"

"ہاں، وہ رینا، الو کی پٹھی ہے آپا وہ تو" وہ بھدے پن سے ہنسی۔

جب وہ استری لے کر چلی گئی تو ہم لوگ سناٹے میں رہ گئے۔ تخت بے ایمان نکلی کمبخت جو ہم لوگوں کو بے وقوف بنایا۔ ہم تو اس کے رعب کے مارے لرزے جا رہے تھے۔ اتنی پٹھی ہوئی مدن منجری تو ہے بالخصوص لڑکوں پر تو جیسے اوس پڑ گئی کھو کر رہ گئے، چڑ کر سب نے صلواتیں سنانی شروع کیں۔

"اوہ کتنی بھیانک ہے، بالکل چڑیل لگ رہی تھی!"

"لاحول ولا قوۃ" منہ کڑوا ہو گیا سالی کو دیکھ کر۔

"واہ بھئی سے تو اس کی آپا اچھی ہے"

"میری موٹی جسکلی ذرا بھی تو سکسی نہیں لگتی ہیں"

"سالی کی ایک کتنی پھولی ہوئی ہے"

"اب اتنی تو گندی نہیں۔ ہاں معمولی ہے" میں نے کہا اور لوگ کھڑے کھڑے ٹھٹھے لگا رہے ہوتے۔ "یہاں معمولی کون کمبخت دیکھنے کو بیٹھا تھا"

ہے یہاں جو رکس کی صورت نہیں ذرا ایک شکن سی ہوتی بات یہ ہے کہ فلم سٹار کی ویسے ہی دھوم ہوا کرتی ہے اور مدن سحری کے بارے میں ایسی عجیب عجیب افواہیں اڑی ہوئی تھیں کہ حد نہیں۔ زمانے کتنے سیٹھوں کا دیوالہ نکال چکی۔ ذرا باہر نکل جاتی ہے تو لوگ اسے چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں سیکڑوں دلوالے اس کے فلیٹ کے نیچے ایک جھلک دیکھنے کی آس میں ٹھٹھ لگائے کھڑے رہتے ہیں میں نے اسے بیسیوں شام موٹر میں بیٹھے دیکھا تھا رنگ برنگے کپڑوں میں لپٹی لپٹائی وہ جھٹ سے اندر بیٹھ جاتی اور سوائے ایک رنگین جھلک کے کچھ دکھائی نہ دیتا ویسے اس کی خالہ، نانی اور ممانی کبھی کوئی بیسیوں ادھار مانگنے آجایا کرتی تھیں ماماؤں کی طرح میلی کچیلی اجڑے حال کم از کم انہیں دیکھ کر تو یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ مشہور و معروف مدن سحری کے رشتہ دار ہیں

تو پھر یہ مدن سحری ہزاروں کیسے کماتی ہے؟ لوگوں کو بھلا الو کیسے بناتی ہے؟ الو کیا پیسے کے دو ملتے ہیں جو اس کی یہ درگت ہے مگر یہ دو چار موٹریں ان کا کال راز ہے فلیٹ ہی میں سارے میں سو سے کم کا نہیں مدن سحری کے گھر میں کم و بیش پندرہ تعداد رہتے ہیں [illegible] نہ کسی رشتے سے اس کے رشتہ دار تھے گھر میں بیچ، پکارتی رہتی تھی کبھی رات برات کو گالم گلوچ اور مار پیٹ کی بھی آوازیں آیا کرتی تھیں

ایک دن معلوم ہوا مدن سحری کو سردی ہو گئی دن بھر ملنے جلنے والوں کا تانتا بندھا رہا ڈاکٹر، نرس ایک اودھم مچی رہی ایک دن دوپہر کو اس کی نانی آ کر بولیں

"آپ کو بی بی بلاتی ہیں"

"کون بی بی؟" میں نے سوچا۔ کون بی بی مجھے بلانے لگ گئی پھر یاد آیا کہ مدن کو گھر میں سارے بی بی کہا جاتا ہے جو کہ نرگس بی بی اعلان ہے۔ میں نے مدن کا بھی نام بی بی رکھ دیا حالانکہ اس لفظ کے معنے گھر میں کوئی نہیں سمجھتا میں گئی اور زندگی میں پہلی مرتبہ ایک مشہور عالم کا دربار دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر رنگ برنگے صوفے مگر بھی سامان سے بھرا ہوا تھا ڈرائنگ روم میں رکابیاں پیالے ترکاری کی ڈلیا میلے کپڑے بچوں کے کھلونے، ایک کھلا ہوا پاندان اور میلے چیتھڑے بکھرے ہوئے تھے لال صوفے ہرے طوطے کے رنگ کے پردے [illegible] معلوم ہوتا تھا رنگوں کی آپس میں ٹھنی ہوئی ہے قالین پر ایک میلی سی موٹی بچے کو دودھ پلا رہی تھی پاس ہی ایک ملوٹا سا بچہ چائے کے گلاس میں چمچے سے چائے پی رہا تھا ساتھ ساتھ برابر کی مقدار ناک کی رطوبت کی سڑسڑ کرتا جارہا تھا میں سامان اور بچوں کو الانگتی پھلانگتی بی بی صاحبہ کے کمرے کی طرف لپکی کھانے کے کمرے میں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اللہ اللہ [illegible] سینٹر ٹیبل پر ایک پیلو ان جیسا رکابی کی بھنبھناہٹ [illegible] سیاہ سا میاں بیٹھے ڈنکا [illegible] لے رہا تھا۔ مدن سحری ایک اجڑے ہوئے کمرے میں ایک میلی ڈل سی پلنگ پر میلے کچیلے گدڑے میں لپٹی تھی میلا سا جیمپر کاسنی کوٹ اور کھلے گریبان کا قمیص پہنے بال الجھوائے سامنے ایک میلی سی بے قلعی کی تانبے کی پلیٹ میں انڈا اور ٹوس رکھا تھا۔

"ارے ہے آپ کو تکلیف ہوئی میں خود آجاتی۔ مگر یہ نظام ہلنے ہی نہیں دیتی" اس نے گھور کر نرس کی طرف دیکھا جو ایک تکلیف دہ کرسی پر بیٹھی تھی [illegible] اس نے میری طرف گھسا کر دیکھا اور پھر پڑھنے میں مشغول ہو گئی

"اور دیکھو تو کمبخت [illegible]" اس نے جل کر نرس کو کچوکا دیا۔ اور نرس بھی [illegible] کر اس کی شکایت کرنے لگی۔ کنگھی نہیں

کرنے دیتی، نہ ہنسی دکھلانے دیتی، دوا یہ ضد کرتی ہے پھر برس کی عورت کی تھی"

"حبیب چھنال! تجھے اپنے پیسوں سے مطلب کہ بات بات بڑبڑ کیے جاتی ہے" مدن نے ڈانٹ سنائی

کچھ عجلا اکل ہمارا اترا اور آج بیڈا اعلکوے برلی ہوئی ہے۔ حالانکہ لعنت تھا میں اسے سمجھ کر ماننا چاہتی تھی میں نے ان کے جھگڑے میں پڑنا مناسب سمجھ کر خط کا مطلب سمجھا دیا۔ اکرم نکس کے دفتر کا پتہ دیا تھا۔ مدن نے جھٹ سے ایک موٹی سی گالی دی اور خط لیکر کمر کے پیچھے مروڑ دیا

اس دن کے بعد کبھی کبھی جب اسے فرصت ملتی تو وہ مجھے اکیلا پاکر آن بیٹھتی، اور اس کی زبان چل نکلتی۔

"دیکھ پڑھ رہی ہیں؟ اللہ ہمیں کسی حرامزادے نے پڑھایا کیا مزے کی ہے کہانی؟ اللہ بتائیے کس کا لکھا ہے"

پہلے تو مجھے چڑ آتی۔ مگر جلد ہی دلچسپی لینے لگی جیسے کوئی ناول شروع کر کے پہلے پہل ذرا جی اچاٹ ہوتا ہے پھر جوں جوں ورق لوٹتے جاتے ہیں دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ مدن کے دو چار ہی ورق لوٹے ہوں گے کہ مجھے کتاب چھوڑ کر اسے پڑھنا پڑا

"آہا! اللہ ماری جوتوں سے کیسے بال چھوٹے" اس نے ذرا بے تکلف ہو کر پوچھا اور دونوں ہاتھوں سے کھسوٹنے لگی اس کے ہر جملے میں ایک گالی آ دیراں ہوتی تھی اور جلد ہی مجھے ان سہانیوں کی عادت پڑ گئی

"آپا" اس نے ایک دن ذرا تکلف کے بعد کہا۔ "مگر ٹھیک کرنے کی تھی تو ذرا سی ملتی ہیں"

"ٹھیک تو ہے تمہارا انگ"

"ارے کہاں اچھا ہے آپا، روئی رکھنا پڑتی ہے" وہ گھونٹے سے اپنے جسم پر ہاتھ پھیر کر بولی اور میں نے دیکھا کہ روئی کی مقدار ہموار نہیں اس سے اس قسم کی بات کرنے مجھے جھجک سی محسوس ہوئی مگر میں نے سوچا ناول میں بھی تو دو چار جملے ایسے آ جاتے ہیں جہاں انسان جھجک جاتا ہے چنانچہ میں نے ورق الٹ دیا

"اچھا پیڈ بھی تو ملتے ہیں"

"پیڈ" میں نے حیران ہو کر پوچھا

"ہاں آپا سب لگاتی ہیں اچھا ہمیں بھی لا دیجئے"

مجھے بڑی ذلت محسوس ہوئی یکسر مجھے کیا سمجھی ہے مجھ سے کیا الٹی سیدھی فرمائش کر رہی ہے میں نے رکھائی سے بات ٹال دی مگر وہ بیچاری مارے کا نسخہ، بنا جو اس نے بالوں الوں میں ذہن میں مروڑ کر پھینک دیا۔ وہ دیر تک بیٹھی آئینہ میں خود کو بڑے ارادے سے دیکھتی رہی کبھی دانت نکال کے دیکھتی کبھی ناک کو انگلیوں سے کھینچ کر چھوڑتی، کبھی گنگنانے لگتی اور کسی ناچ کا مدرا بنانے لگتی پھر آپ ہی آپ روٹھ جاتی قتل کر دینے والی نگاہوں سے دیکھتی اور پھر مسکرا پڑتی میں خاموش کن آنکھوں سے اس کی حرکتیں دیکھتی اور جی چاہتا کھل کر قہقہہ لگا دوں میری چار برس کی بچی تھی۔ بالکل یہی حرکتیں آئینے کے سامنے کیا کرتی ہے

ایک دن وہ آئی میں نے صرف آنکھ کے کونے سے اسے دیکھا اور بیٹھی کو لکھ کر اپنے کام میں لگی رہی۔ وہ خاموش دونوں ہاتھ گود میں ڈالے ملائی گھورتی رہی اور پھر لمبے لمبے آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے میں نے چاہا اس کی طرف نہ دیکھوں تو شاید یہ آنسو جو ایک دم آگئے ہیں چھپانے کو وہ بھاگ جائے گی اور میں کوفت سے بچ جاؤں گی مگر اس کی سسکیوں نے ہچکیوں کی صورت اختیار کر لی پوڈر کی سفید سفید لکیریں تھوڑی تک کھنچ گئیں مسکارا جو شاید اس نے پانی سے لگا لیا تھا بہہ کر پھیل گیا لپ اسٹک پونچھنے میں ساری ٹھوڑی میں لتھڑ کر چھٹ گئی اور مجھے توجہ دینی ہی پڑی اس کی اتنی لٹی کھسٹی شکل دیکھ کر میرا دل پگھل گیا مدن ایکٹنگ نہیں کر رہی تھی وہ سچ مچ رو رہی تھی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر غسل خانہ میں پہنچا دیا۔ منہ دھو کر وہ بڑی بڑی معصوم آنکھوں سے مجھے تکنے لگی گویا کہتی ہے آپ بھی نہ پوچھیں کہ میں کیوں رو رہی ہوں"

میں سمجھ گئی کسی بگڑے دل عاشق نے ٹھکائی کر دی ہوگی

"حرامی پلے ... کوڑھ ہوٹے" وہ پھر ہونٹ لٹکا کر رو پڑی اور مغلظات کی لمبی سی زنجیر کھینچنے لگی "یہ دیکھو اس نے اچھا چھوا اور مار دکھو کر دکھائے پیلی کا پنج کے اس جن پکڑا جھوما ہے ہی سرخ پڑا" میں نے پوچھا

"بلی موٹر والے نے مارا یا کراٹے سے"

"ارے ان بھڑوؤں کی کیا سی ہے جو ماریں گے سو سا سر دوں سالوں کے" وہ بالکل گلی کے لونڈوں کی طرح الفاظ چبا کر بولی اس نے اور دو چار گالیاں چاشنی کے لیے اگل دیں اور بتایا کہ پٹائی ماموں نے کی ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جالا اور ماموں میں جوتا چل گیا۔ زیادہ مردود ماموں کی تھی" اس نے ماموں نے لونڈیا کو چھیڑا۔

"کس لونڈیا کو؟" میں نے اکتا کر پوچھا۔

"جالا کی لونڈیا سو" میرا دم لوٹنے لگا یہ جالا کی لونڈیا کو ماموں نے کیسے چھیڑا۔

"ارے وہ لچا ماموں بوڑھے ہی ہے ابی نے میاں ... ہے" پھر رازداری سے بولی "چھوٹی ہے سالی ابی اس کا یار ہے یہ ماموں کا تو کہو بھلا آٹھ نو برس کی لونڈیا جو مرا جاہی تو میاں ٹنگ جاتے"

میں نے اسے گھورتے ہوئے دماغ کو کھلی ہوا پر ٹہلانے کی کوشش کی مگر دل کرینگ ہوتی جا رہی تھی

"پھر؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا

"پھر میں نے کہہ دیا کل جاؤ اسی وقت چماری جالا کا برا حال ہوگیا تھا مگر وہ سور کا بچہ اکڑنے لگا اور اس نے مجھے گالی دی میں نے بھی الٹے کے دی جوتی بس اسی میں تو بھائی میرا آڈرا ... اور ساود بھی۔ آجاتے تو ماری ڈالا ہوتا۔ اچھا ہوا ... حرامی کو پھانسی ہوتی میرا کلیجہ تو ٹھنڈا ہوتا"

مجھے ہنسی آگئی۔ "مرے کے بعد کلیجہ کیسے ٹھنڈا کریں" اور وہ بھی ہنس پڑی

"کسی سے کہا نہیں آپا" اس نے رازداری کے انداز میں کھسک کر کہا

"نہیں بھلا کس سے کہتی پھروں گی"

"قسم کھاؤ قرآن کی"

میں نے کھا لی تو ذرا کھسک کر بولی "وہ چار چوٹ کی مار دیتا ہے ابی کتیا کو کہ بلبلا کر دیتا ہے پر وہ ہے کہ گھس جاتی ہے اس کے بستر دابنے کو"

"تو بستر دابنے کیوں نہیں دیتا کمبخت" میں نے پوچھا

"ارے وہ پوچھے گا اس مردار کو اس کی ایک میم سے دوستی ہے پچاس روپیہ پاتی ہے"

"مگر پاؤں دابنے میں کیا نقصان ہے" میں نے چڑ کر پوچھا اور بدن نے مجھے ایسے دیکھا جیسے وہ مجھے تو بھولے ... وہ مسکرائی اور میں ... کہ میں ... رہی ہوں۔ اور وہ زور زور سے ہنسنے لگی پھر اپنے ابی اور بیلوں کے روماں میں مزا آنے لگا۔

"کبھی کبھی ترنگ میں آکر دونوں خوب کلیلیں کرتے ہیں سارے گھر میں بھاگا دوڑی مچتی ہے" میں نے بات ٹال دی اور بدن کے دل میں باتیں گھٹی رہ گئیں

سنا کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور وہ اسکول جا رہی تھی میں اس کے کپڑے وغیرہ ٹھیک کر رہی تھی اچانک بدن آ گئی

"سنا ہے آپا کیا ابی سی کو بورڈنگ میں ڈال رہا ہے" وہ مسکرا کر بولی۔

"وہاں پڑھائی اچھی ہوتی ہے"

"نہیں کسی حرامزادے نے پڑھایا" تھوڑی دیر بعد وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ "اللہ قسم ہم بہت پڑھتے۔ آپا؟"

"ہاں"

"اللہ قسم مجھے گود لے لو پھر مجھے بھی اسکول بھیج دینا۔"

"نہیں مہری، تو جو دو چار سال کے بچوں کو آسانی گود لے سکتی ہے۔ مجھے بھی پڑھنے کا شوق ہے" میں نے کہا۔

"اچھا تم اب کیا پڑھو گی" وحشت سے بولی

"کتابیں، قاعدہ کی کتابیں اور گوشت پوست کی جیتی جاگتی کتابیں۔ تم جیسی ضخیم جلدیں ہم سونے کی کان ہو مہر جیسے ہزار کی مشکل آسان کر سکتی ہو مگر تمھارے ماموں اور نانی اور وہ تمھاری اس وقت کی باتیں سن لیں تو مجھے کچا کھا جائیں گے۔"

"میں تو مذاق میں کہہ رہی تھی بھلا میرا آپ کا کہاں جوڑ"

"ہاں بھئی تم لکھ پتی اور ہم بیچارے"

"لکھ پتی نہیں لکھ پتی کی   کتوں کی مگر جو موٹی ترین گالی ہو سکتی ہے جوڑ لیجیے" "تم بھی کیا بچوں جیسی باتیں کرتی ہو، روپیہ کچھ مجھے مل جاتا ہے"

"تم ہی تو کماتی ہو"

"میرا نانی کا سگا تو وصول کرتا ہے" وہ چلا کر بولی "موا بیٹا کہے کا جاہا اس کی لاش چیل کوے کھائیں کوڑی کوڑی وہ وصول کرتا ہے سب اڑا ڈالتا ہے۔ کچھ نانی اور خالہ ہتھیا لیتی کچھ مار پیٹ کر گھر کے خرچ میں ملا جاتا ہے نانی کا سالا اپنی بیوی کے نام سے جمع کراتا ہے۔ کوڑی کوڑی کو ترستی ہوں گھر کہاں دیتا ہے"

"مگر تم نے تو لاکھوں کما لیے ہوں گے"

"مگر لاکھوں کا قرضہ بھی تو ہے"

"قرضہ کیسا؟"

"وہ جو ماموں کے بچے نے "انصاف کی توپ" فلم بنائی تھی۔ اس میں ڈھائی لاکھ کا نقصان آیا"

"تو تم اس کا قرض کیوں چکاتی ہو؟"

"اے ہے آپا تمھاری تو بہت عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں" اس نے چڑ کر کہا اور میں کھسیانی ہو گئی کمبخت سر پر چڑھتی جاتی ہے

"وہ ہنڈیاں تو مجھ ہی سے سائن کرائی تھیں"

"تم نے کیوں سائن کر دیں گدھی" میں نے جل کر بدلہ لیا

"مو پھر وہی گدھی ہے تو مجھ گدھی کی بچی کو کیا معلوم تھا مجھ سے کہا یہاں دستخط کر دو یہاں نام ڈال دو میں نے ڈال دیا بس"

"اور ماموں"

"وہ رائٹر ہے ظفر سانڈ بنا پھرتا ہے" یہ بد تمیز اس سے پہلے میرے دوستوں نے بھی سنی تھی۔

"مگر یہ کیا بدنگی ہے تمھارے پاس ڈھنگ کے کپڑے ہیں نہ ٹنک میں کوڑی۔ گھر تک اصطبل بنا ہوا ہے۔ پھر یوں مر کھپنے سے کیا فائدہ چھوڑ دو یہ کام"

"یہ کام چھوڑ کے کہاں مروں گی نانی جوتی مار کر نکال دے گی۔"

"گھر تمھارا ہے تم خود انھیں نکال دو"

"گھر خالہ کے نام ہے ان ہی کے نام کی رسیدیں کٹی ہیں۔"

صہب

میرا موڈ کھول گیا۔ مدن گالیاں بکتی ہے ٹھیک ہی تو بکتی ہے۔ میرا بس چلتا تو میں بھی دو چار گالیاں بر دیتی کہ ادھیڑ سارا گھر پڑھتا ہے اور ہنستا ہے سالے بنگلہ والا ہے۔ نانی کے پاس صندوقچہ ہے زیور ہیں۔ ماموں کی موٹی بینک میں روپیہ بھرا ہے اور میں نے بجری بھرتے دس بیس روپے منیسر کے لیے ہاتھ پھیلائی ہے تو وہ کبھی واپس نہیں دیتی

گھوڑوں کے لیے بھی سے باہر رہ کر آئی تو مدن کچری پہ سے سہرا ملا ہوا تھا ٹرے تھتے سے نقش حیوانی عارضی کی کامدانی کی ہوئی ساڑی ویسی ہی بلاؤز سہرا کام کیا ہوا جار رو نے والا سینڈل ڈالے ادبھارتے فیشن کا جوڑا بندھا ہوا گلے میں موتیوں کی کنٹھی روئی کا توار دہانے قاعدے سے مدہر رنگ لپ سٹک تھوپے آکر مدن سے بیٹھ گئیں اور دانہ طلب نظروں سے تکنے لگیں۔

"آج تو بڑی سج کے آئی ہو۔"

"یہ ساڑی ہاں لی ہیں اکٹھی دکھو گی ستہ لے شو۔ جواب لیے بغیر وہ چلائی اور جب ساڑیاں آئیں تو جھٹ سے اس پہنی ہوئی ساڑی کھول کر۔ دوسری پہنی وہ تو ساری ساڑیاں باری باری پہن کر دکھانی لگیں بے رکھ دیا بارہ پندرہ کی ہوں گی ایک ایک ساڑی جتنے کام کی سنہری کتنی سستی ساڑیاں

"اچھی ہیں نا؟"

"ہاں گھر میں پہننے کے لیے اچھی ہیں

"غضب کرتی ہو آپا خدا کو بہتا ہو گا ڈیڑھ ڈیڑھ سو کی ساڑیاں گھر میں اور یہ والی تو پورے ڈیڑھ سو کی،

"کون ماموں لائے۔"

"ہاں مگر نہ بدن میں موجود دکھا دیں تمہیں لاکر۔"

نہیں نہیں رہنے دو مگر تمہارے ماموں ٹھگ گئے میں نے سوچا ٹال ہی جاؤں

"ہاں ہوا ہو گا الو کا پٹھا تو ہے ہی بالکل۔"

آج سب خوش نظر آ رہی تھیں تو لاکر بار رہی ہے کہا ایک روٹی پر کباب رکھ کر لے آؤ

"میں انگریزی شروع کر رہی ہوں آپا"

"پہلے اردو تو پڑھ لو پوری طرح۔"

"نہیں آپا اردو اللہ ماری ایسی بعد کی کون پڑھتا ہے سب ہندی پڑھتے ہیں پر ہندی موئی سے نفرت ہے مجھے انگریزی پڑھنا چاہیے سب گٹ پٹ بولتے ہیں میں الو کی پٹھی سہ لگا کر رہی ہوں کوئی ماسٹر رکھوا دو

"اور تمہارے ماموں مانی،

"بولنے میں پڑیں . تم یہ کہو گی تو مان جائیں گے تم سے بہت ڈرتے ہیں۔

"مجھ سے؟" میں نے حسرت سے پوچھا

"ہاں کہتے ہیں لندن تک ہو آئی ہیں"

"کیوں میں؟ تم سے کس نے کہا میں لندن ہو آئی"

"ارے تو کہاں گئی تھیں ماموں کہہ رہے تھے گئی تو تھیں کہیں"

"چین"

"وہ ایک ہی بات ہے دوسرے تمہاری پہنچ منسٹروں تک ہے"

میں نے ماسٹر رکھوا دیا ایک مرہٹی لڑکی کو سو روپے مہینہ پر مجھے پورے دو روز کی ہنسی آئی مگر میں نے کہا چلو رعب پڑا ہے تو ہے

اسے کہا ہے کہ سادھوؤں کو میں نے مندروں کی صرف تصویریں دیکھی ہیں اور وہ بھی دھندلے کاغذ پر چھپی ہوئی اور ان کے بہی کھاتے میں میرا نام کچھ زیادہ دلچسپ جگہ نہیں۔ مجھے بدن کی حالت اور کوڑھ مغزی پر حیرت ہونے لگی دنیا کی کسی بات سے بھی تو وہ واقف نہیں۔ دنیا کہاں جا رہی ہے اسے کچھ نہیں معلوم۔ نانیوں اور ماموؤں کے چنگل میں۔ جانے کتنی بدن سحریاں کاٹھ کی پتلیوں کی طرح ناچ رہی ہیں، اور نہ جانے کب تک ناچتی رہیں گی۔ ملک آزاد ہو گیا مگر یہ ابھی سحر دلوں سے نہیں نکلیں انھیں کون سے دیوتا آن کر نکالیں گے

پھر دنیا میں کچھ اچھل پھاند ہوئی اور بدن سحری کے پاس کام کی افراط ہو گئی۔ مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ صبح آٹھ بجے ناشتہ ناسی لوالے مار کر وہ اسٹوڈیو چلی جاتی ساری رات شوٹنگ کر کے صبح ناچ کے تھکے جسم سے چور آ کر گودڑ سے بستر پر اوندھے منہ پڑ جاتی۔ صبح نو بجے مار مار کر جگائی جاتی اور پھر وہی شوٹنگ۔ کام کیا شروع ہوا نانیوں اور ماموں ہر وقت بکروں کی طرح جان کو لگے رہتے۔ نانی میک اپ روم میں جڑ کے لیا لڑتی اور ماموں باہر پہرہ دیتے رہتے اور سحری کیمرے کے سامنے ناچتی، گاتی، ہنستی روتی اور روپیہ کی بارش ہوتی اور ماموں کا دامن ہوتا۔ کبھی آتے جاتے ٹکر ہو جاتی۔ دو ایک بار تو اس نے بڑی طرح تو نظر اٹھا کر بھی۔ دیکھا میں سمجھی کہ شاید کچھ دماغ ہو گئے ہیں مگر ایک دن زینے پر چڑھتے ہوئے اس نے مجھے سوئی ہوئی آنکھوں سے دیکھا جیسے مجھے پہچاننے میں دیر لگ رہی ہو مگر وہ مجھے پہچان گئی۔

"وہ ماسٹر جی!" اس نے کھوئی کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں کیا ہوا تھا" میں نے اس کی زبانی سنا تھا۔

"وہ چلی گئی۔"

معلوم ہوا کہ سحری کو تو پڑھنے کی فرصت نہیں تھی ماموں نے سوچا سو روپیہ بیکار جا رہے ہیں اس کا کچھ مصرف ہی ہو جائے چنانچہ ایک دن جو وہ پڑھانے آئی تو وہ وصولی پر تل گئے۔ وہ لڑکی میرے پاس آئی مجھے بڑی شرمندگی ہوئی

"پیسہ برباد کرنے سے کیا فائدہ" میں نے سمجھایا

"نہیں میں ایک دن ضرور پڑھوں گی" اس نے بڑی حسرت سے کہا اور چپ چاپ نیچے چلی گئی

ایک دن سحری کے ہاں اچانک ہوا ای بار دھاوا ہوا کہ سارا محلہ ٹوٹ پڑا۔ پولیس آ گئی اور بہت ہنگامے کے بعد دو چار نوکروں کو اور ماموں کو پکڑ لے گئی۔ پیسہ بھر بھرا کے ماموں چھڑا لیے گئے اور اس کے بعد ماموں ریٹائر ہو گئے۔ بات نہ وقتی طور پر انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ اور ان کی جگہ ایک کافی مستقل قسم کے ڈیڈی آ گئے۔ بدن سحری جوش و خروش ڈیڈی کے ساتھ جھکی پھرتی۔ اس نے آ کر نطفی نظام حکومت بدل ڈالا۔ نانی کے الاؤنس میں جو وہ چپ چاپ بیکری میں کاٹ چھانٹ شروع ہو گئی مگر بدن سحری کے ذاتی مصارف کئی گنا بڑھ گئے۔ اس نے نئی نئی مارکیٹ کی ساڑیاں اور سلیپنگ سوٹ وغیرہ خرید لیے۔ اس کی پبلسٹی پر خوب روپیہ صرف کیا۔ جتنے خرچ ہوتے اب بھی تھے مگر اس میں بدن کا حصہ بھی تھا۔ بدن واقعی بڑی اسٹار ہو گئی۔ اس کی شہرت بڑھی اور اس کے ساتھ بدنامی بھی بڑھی۔ پہلے سنا اس کا عشق ایک ہیرو سے چل رہا ہے۔ پھر معلوم ہوا ایک ساتھ دو سے چل رہا ہے۔ پھر معلوم ہوا ایک کمرہ میں سے بینگ تھرو رہے ہیں جو پروڈیوسر بھی ہے اور سب ملدتا دی ہو رہی ہے۔ اور میں نے سوچا ملو سری نہیں رہی اچھا رہا جو اس نے سنبھال لیا لگی تو سوتی تھی مگر اتنی تو عقل آ گئی۔ عرصہ ہوا وہ مجھے نہیں ملی تھی مگر اچانک ایک زمانے سے بچی ہوئی مل گئی۔ وہ سب بدل گئی تھی۔ وہ پہلے جیسی گنوار نہیں رہ گئی تھی کہ بس پھٹی پھٹی سی اور بس بھی بال ڈال چور گھنگریالے ہوئے۔ ناخن صاف پالش کیے ہوئے۔ اس کی نسبت ہی بدلی ہوئی تھی۔ ذرا جسم بھی پہلے سے دبیز نظر آ رہا تھا مگر آنکھوں کے نیچے وہی سیاہ حلقے اور پاؤڈر کے نیچے وہی مردہ سی کھال اور بڑی بڑی غمگین آنکھوں میں وہی نامعلوم کی تلاش۔

صبا

ے چاہا کہ کتنی بات کر کل جاؤں مجھ سے ملنا پسند کرے نہ کرے۔ اس نے میری طرف غور سے دیکھا تھی نہیں مگر جو ہی میں نے
کے لیے قدم بڑھائے وہ لپک کر میرے پاس آ گئی۔

" کسی طرح ختم ہوئی" اس نے اپنے پرانے بھولے انداز سے کہا اور میرے بازو میں چٹکی لی۔ اس کی اس بے تکلفی سے میں کھسیانی
ا۔ میں نے بہت کہا کہ میں ٹیکسی پالیسی میں چلی جاؤں گی مگر اس نے زبردستی مجھے گاڑی میں بٹھا لیا۔ وہ کتنی بدل گئی تھی۔ مگر اس کا الٹر
ی تھا بیٹھتے ہی بڑی رازداری کے انداز میں بہت بہا کر مجھے ایک لفافہ دکھایا۔ وہ واقعی بڑی اشتہار ہو رہی تھی لفافے کے
جا لک کر بھیجے لیکن آگے اس کم زیادہ [illegible] کی صحت ختم ہو جائے گا۔ امریکی مدد گار جس آخر زہ ان کی دکان تک وہ خود ہی پہنچ گئی
سوچا یہ عورت کا مرکز حسن بھی کس قدر گھونٹا ہے ہر امریکی چیز پر مر لالی ہیں اور دیا ان کی تال میں زمین و آسمان
ے ملا دیتی ہے سو سسر کی بیٹی ان کا شہ رگ پر ملتی ہے اگر سسر کو یہ راز معلوم ہو جائے تو وقت بدا تی شدت سے کم ہوت
ے۔ مگر دیا تو ڈھلکے ڈر دینے دیکھتی ہے اصلی اور نقلی مال کو کون پہچانتا ہے

" آپا ایک بڑی ضروری بات کہنی ہے" اس نے رازداری سے کہا۔

" ایک نہیں ہزار کہو اور قسم دلانے کی ضرورت نہیں میں کسی سے نہ کہوں گی"

" کسی ڈاکٹر کو جانتی ہو"

" ہاں ایک نہیں بہت سے ڈاکٹروں کو جانتی ہوں کیوں؟"

" کوئی بھروسے کا اپنا ڈاکٹر بتاؤ؟"

" کیا وہ منہ کے چھالوں کی ساری بھیڑ عود کر آئی"

" نہیں آپا بات یہ ہے کہ میں سخت مصیبت میں پھنس گئی ہوں" اور مجھے اس کے جسم کی زیارت کا حال معلوم ہو گیا مجھے غصہ
آیا ہے اور بہت رحم آیا یہ کمبخت مجھ سے بچی ناک بٹانے کا ارادہ کر چکی ہے مگر تو رازی ہی مجھے ایسے کہ چڑھے [illegible] شرم آ گئی
ان سکڑوں [illegible] شریف اور [illegible] سہیلیوں کی اس بارے میں مدد کا اتفاق ہو چکا تھا کبھی ان کے شوہروں اور کبھی
ہروں کے پیارے دوستوں کی صلاح سے اور معاملہ کچھ اتنا گمبھیر نہ تھا مگر اب ایک کھلے طبقہ کی عورت کو اپنی اونچی سوسائٹی کی بیگموں کی
میں کھڑا کرتے ذرا جھجک گئی

" میں پھنس گئی ہوں آپا بھائی کو جب [illegible] ہو گی تو میری بوٹیاں چبا ڈالے گا۔ دوسرے وہ جو نئی پکچر کا کانٹریکٹ ہونے
ہے اس کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔

" تمہیں اپنا کام جان سے بھی پیارا ہے۔ یہ ہے اس جھگڑے میں جان کا اندیشہ ہوتا ہے"

" کام؟" اس نے اپنی پریتال آنکھیں پھیلا کر کہا "آپا کتنی قصہ [illegible] جاتی ہو۔"

" قرضہ اتنی زیادہ کمائی ہوا تھا تو مسے بڑھتا ہی جا [illegible] یہ فقرہ کیسے؟"

" میری تو سمجھ میں حساب کتاب آتا ہی نہیں کئی بار سر [illegible] ہی سے کہہ چولہے میں جائے۔"

" سنا ہے اب تو تم ایک پکچر کے پیچھے لیتی ہو۔ ادھر تمہارے رشتہ دار کوڑی نہیں کماتے۔ وہ لکھیتی بنے بیٹھے ہیں اور تم فقیر
ان پر دعویٰ کر دو۔"

" سنا ہے کا دعویٰ کرو دو تین پیپر پیا سے بچاس ہزار لیک ہوتا ہے [illegible] جو کوئی بھی پروڈیوسر ادا نہیں کرتا۔ لیکن ہی
آدھا پیشہ جاتا ہے۔"

" تو تمہارے پاس اپنی کمائی کی مقدار کا کوئی ثبوت؟"

"ناک بھی نہیں میں تو سال میں ایک بار بھی نہیں کماتی۔"
"مگر تمہارے رشتہ داروں کے پاس کہاں سے دولت آتی ہے یہ کوئی نہیں پوچھتا۔"
"میری بھابی بتا سکتی ہے لوٹی لوا سے پچیس ہزار کے زیور لے۔ اخبار میں آیا ہوگا۔ لے جسے ادا کو پچیس ہزار روپے۔ اس کا باپ طبلچی ہے۔"

اس بلیک اینڈ وائٹ کے چکر سے میرا سر گھوم گیا۔
"تم خود کیوں اپنے ہاتھ میں کاروبار نہیں لے لیتیں۔" میں نے حل کر کہا۔
"لیا تو تھا پچھلی بار،"
"پھر؟"
"پروڈیوسر کے ساتھ بازار ستے میں ڈیڑھ لاکھ کا نقصان دکھا دیا پھر ہم ارجیب سے ٹھک گئے۔"
"وہ کیسے؟"
"اے ہے آپا مجھے کیا معلوم۔ میں دیدوں پھوٹی کیا سمجھ سکتی ہوں"

تو یہ ہے وہ قتالہ جس نے ہزاروں کو دیوالیہ کر دیا ہے۔ اور کتنے پروڈیوسروں کو ناک چنے چبوا دیے ہیں میں سوچنے لگی اصل قاتل کون ہے اور مقتول کون؟

"مگر یہ مصیبت ہے کس کی ڈالی ہوئی،" آمدم برسر مطلب میں نے بات کا رخ موڑا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور ہوا میں ہاتھ ہلانے لگی

"ایک بات بتاؤں کہو گی تو نہیں۔"
"قطعی نہیں۔" میں نے اشتیاق سے پوچھا "کیا بات ہے؟"
"وہ جتو بھی تو میرا ہے"
"جتو۔ وہ کالا سا میرا مطلب ہے سانولا سا"
"ہاں وہی کلموہا۔"
"تمہاری ماں کا لڑکا۔"
"ارے اس کے باپ کے بھی لڑکا ہوا ہے؟"
"پولس والی لڑکی،"
"کہیں کال وال سے حرامی ہے بڑھاپے کے سہارے کے لیے سسر بو رہی ہے کمبخت ماری۔ ال بچہ کیا ہوگا۔" اس نے بے رحمی سے کہا۔
"تو جتو کا باپ؟"
"وہ جو سیٹھ سے ہنڈیاں لی تھیں بس وہی ہنڈی پکڑا گیا۔ کہا سات اندر کرلوں گا پر ہمدرد ہو ہاتھ پڑے گا۔"
"پھر؟" "مار دل ہائے کسی جیب کترے نے پیچ کیا تھا اور سیر اکثر تیسرا آتا تھا۔"
"پھر کہنے لگا میری بیوی کوٹھے پر سے کود کر جان دے دیگی۔ میں سسرال والے پرسش میں ساتھ ہی پیرا ہو جائے گا۔ مگر دو سو روپے پیسہ تو دیتا ہے۔"
"ملو یہ ہی رانیں۔ اور یہ" میں اس کی دبازت کی طرف اشارہ کیا۔

"پسند کیا ہے اُس کا نہیں"

"پھر پسند کیا ہے؟" میں نے دھوبیلی کے انداز میں کہا

"کہا ہے اتنا بدھی کا ہوگا یا سرور کا"

"ارے ... گر تمہیں تو معلوم ہوگا کہ ..." میں نے اکتا کر کہا اور وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسی

"سمجھ کہے ہیں اس کا نہیں اور سچ تو یہ ہے آپا مجھے خود نہیں معلوم"

"یعنی کہ بالکل نہیں معلوم" میں نے یقین نہ کرنے کی کوشش کی۔

"اوہ نک ... اب تمہیں کیسے سمجھاؤں" اور وہ کھو سی گئی۔

"حد ہے، بے اعتبار سی ... سے کہا ... جو تمہاری شادی کی خبر چھپی تھی وہ ..." میں نے سہم کر پوچھا۔

"شادی نہیں ٹھینگا ... اب تک ان کی شادی تو بیٹی کا جھگڑا لے تمہیں بہال، بی جان کو لگی ہے اور تمہیں شادی کی پڑی ہے بیا" اس نے جھلا کر مجھے ڈانٹا میں سہم سی گئی اب اس طرح سے میری جان چھڑاؤ

"تمہیں بچے پسند نہیں،" میں نے آہستہ سے پوچھا

"بچے بہت میں چھوٹی سی تھی تو خواب میں دیکھا کرتی تھی کہ سنکڑوں سارے بچے ہیں ایک دو چار آٹھ بارہ کچھ بچے بیٹھے ہیں۔ میں پتیلا بھر مٹھی دال بھات بانٹ رہی ہوں۔ وہ آپس میں کتوں کی طرح لڑ رہے ہیں اور میں ڈوئی سے انہیں مار رہی جاتی ہوں۔ بچوں کے اتار چڑھاؤ سے آتے ہیں میں ... کر ... گئی ... بچے ہیں" اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور مسکرا دی میرا گھر آگیا اترنے سے پہلے میں نے اسے ایک ستر ڈالر کا مہنگا سا دیا اس نے مشکور آنکھوں سے مجھے دیکھا بارہ بچوں اور ان کے باپ کے خواب اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں سو رہے تھے

ہاجرہ مسرور

گائے

جب اختر میاں گھنگھروں اور جھالروں سے آراستہ تکے سے اترے تو حویلی کا اونچا پھاٹک، آسمان سے گرتی ہوئی رات کے اندھیرے میں سیاہ معلوم ہو رہا تھا ۔۔۔ حالانکہ پھاٹک کے قریب، حال ہی میں لیمپ کا کھمبا دوبارہ لگا تھا۔ یوسف بھیا نے ٹاؤن ایریا کمیٹی کا ممبر ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اس حویلی سے رشتے داری کے باعث یہاں روشنی کا انتظام کروا دیا۔

"سالے لیمپ میں مٹی بھی ڈلوانے آئے" اختر میاں نے پھاٹک سے گزرتے ہوئے کسی اینٹ سے ٹھوکر کھائی تو بڑبڑائے۔ ان کے قدموں کی مانوس چاپ سن کر احاطے کے کونے میں قطار سے بندھی ہوئی بھینسیں اور بیلوں نے زور سے سوں سوں کر کے تھوتھنے اٹھایا اور زنانہ ڈیوڑھی سے لٹکی ہوئی لالٹین کی مردہ روشنی میں سر اٹھا کر انھیں دیکھا۔ زنانہ ڈیوڑھی کے قریب ٹوٹی ہوئی خالی ناند سے منہ پھیرے بوڑھی مریل گائے، کسی خیال میں مست آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ اختر میاں کے جوتوں کی آواز سے یوں بے تابی سے لڑکھڑا کر اٹھی جیسے پوچھ رہی ہو پہنچا آئے؟ مگر اختر میاں کی بے رخی دیکھ کر وہ دوبارہ خالی ناند پر منہ مار کے مراقبے میں چلی گئی۔

احاطے والے برآمدے کے آگے دادا اپنے بھیگے کھرّے پلنگ پر لیٹے حقہ پی رہے تھے اور رمضانی کا چھوکرا ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔

"پہنچا آئے؟" دادا نے بھیگے کھرّے پلنگ پر اپنی سگی پیٹھ رگڑتے ہوئے پوچھا ۔۔۔

"ہاں" اختر نے شیروانی کے بٹن مروڑ کر جواب دیا۔ وہ دو ایک منٹ رکے۔ مگر دادا نے اور کچھ نہ پوچھا۔

"بس اب اور کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت پڑی ہے؟" اختر میاں اندر ہی اندر جلے بھنے، تب چاپ مڑے اور ڈیوڑھی کی طرف چل دیے۔ اندھیرے میں ڈیوڑھی میں پڑی ہوئی کھاٹ سے گھٹنا ٹکرایا تو ان کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر گالیاں بکنے لگیں۔ مگر دادا جو موجود تھے۔ بہرحال دادا نے اس بڑھاپے میں بھی اپنے ہاتھ سے کسی کو کوئی اختیار نہ دیا تھا، حتیٰ کہ گالی تک بکنے کا اختیار۔ پھر بھلا کسی کی کیا مجال کہ اونچی آواز سے بھی گھر کے اندر بول سکے۔ اختر میاں نے گھٹنے کی چوٹ سہلاتے ہوئے دانت اور منہ زور سے ہونٹوں سے بھینچے اور وہیں کھاٹ پر ٹک گئے۔ ڈیوڑھی کے اندھیرے میں جھینگروں کی تانیں سی ان کے کانوں میں بج رہی تھیں۔ اور ان کے دل میں عجیب سی مایوسی، عجیب سی جھلاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔

"لعنت ہے دنیا ۔۔ یہ دنیا کچھ بھی تو نہیں کسی کا بھروسہ نہیں لعنت ہے" انھوں نے گھٹنا پکڑ کر سوچا اور ان کا گلا بھر نے لگا۔

چند منٹ بعد وہ ہلکا سا لنگڑاتے آنگن میں داخل ہوئے۔ آنگن میں ہمیشہ کی طرح پرانی چوکی پر دستی لالٹین کی روشنی جل رہی تھی [illegible] باورچی خانہ والے دالان کے سامنے کرسیوں کے باورچی خانے کی [illegible] کے تیل کی [illegible] بدبو اور مدھم روشنی دے رہی تھی۔

[illegible] تھیں۔ وہ دونوں کی دیواروں اور طاقوں میں لگے ہوئے چراغوں
کی روشنی ہمیشہ کی طرح تھرک رہی تھی ـــ اختر میاں دھم سے کمرے کے پلنگ پر گر پڑے۔ ڈربے میں مرغیاں
کڑکڑا رہی تھیں۔ جیسے وہ بھی پوچھ رہی ہوں۔ پہنچ آئے انھیں جو ہمیں صبح صبح باسی روٹی مل کر کھلاتی تھیں۔

"بیٹے میرے لال پہنچ آئے؟" ان کی اماں باورچی خانے کی ننھی سی دیوار کے پیچھے سے ابھر کر نکلیں اور ایک دم ناک سڑ سڑا کر رونے لگیں۔ پھر روتے روتے قریب کے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ ماں کا رونا اختر میاں کے اوپر ہی اوپر سے گزر گیا ان کی ناک میں صرف ماں کے پسینے کی بو آئی۔ انھوں نے بڑی اجنبیت سے اپنی ماں کو دیکھا جو لالٹین کی مدھم روشنی میں بڑی دبلی پتلی نظر آ رہی تھیں۔ چوڑی دار پاجامہ ان کی پنڈلیوں پر جھریوں کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ اور سونے کی کیل والی لمبی ناک نزلے سے وہ بار بار ناک پونچھ رہی تھیں۔

"گھر کیا کھانے کو دوڑتا ہے میرے اللہ۔" ان کی اماں نے بین کیا اور ستاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا جیسے وہ اللہ میاں سے شکوہ یاد کر رہی ہوں کہ بیٹی بھی دی تو ایک اور اسے بھی اپنے ہاتھوں سے جدا کر کے دوسروں کو سونپنا فرض بنا دیا۔ جوانی کا رنڈاپا دو بچوں پر کٹا۔ اے اللہ کیا بگڑتا تیرا جو رنڈاپے سے پہلے دو چار دے دیتا۔ آج کلیجہ یوں نہ پھٹا کرتا۔ جو گھر میں اور بھی کوئی بچی ہوتی۔

تاروں بھرے آسمان کے تلے سے ایک چمگادڑ پنکھ پھیلائے پروں کا سناٹا بکھیرتی گزر گئی۔ ان کی اماں نے سر جھکا کر پاندان کھڑکھڑایا۔ اور دو تین لمبی لمبی ٹھنڈی سانسیں لیں۔

"کھانا کھا لو اختر میاں ـــــ اچھا پہلے منہ دھو لو، سفر سے لوٹے ہو۔" ان کی اماں نے پاندان چھوڑ کر اٹھتے ہوئے کہا اور لکڑی کی گھڑونچی پر سے لوٹے میں پانی انڈیل کر چوکی پر رکھ دیا۔

اختر میاں کی بھوک اڑی ہوئی تھی۔ دل میں کوئی کانٹا کھٹک رہا ہو اور انسان میٹھے کرارے نوالے اتارے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کچلے ہوئے پاؤں میں کوئی نیا جوتا پہنے بیٹھ جائے۔

"مجھے بھوک نہیں" اختر میاں نے بھاری آواز میں کہا۔

"کیوں بیٹا کیا بات ہے" اماں بے تاب ہو گئیں۔ "لے اب میں نہیں روؤں گی تو رنج نہ کر۔"

ماں کے یہ خوشامد بھرے الفاظ اختر میاں کے کانوں کو چھیل کر دماغ میں پہنچے۔ سنسنا کر سارا جوش دماغ میں محسوس ہو گیا۔ انھیں شدید غصہ آیا کہ اماں انھیں ابھی تک بچہ ہی سمجھتی ہیں جو ماں کے آنسو دیکھ کر خود بھی رونے لگتا ہے اور اس وقت تک چپ نہیں ہوتا جب تک ماں کے آنسو خشک نہیں کرا لیتا۔

"میں جوان ہوں عقلمند ہوں سب سمجھتا ہوں۔" اختر میاں نے جھلا کر جی ہی جی میں خود کو اطمینان دلایا۔

دراصل یہی تو ساری مشکل تھی کہ اب وہ اپنی گرہ سے سوچنے سمجھنے لگے تھے۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر ان کے حساب کم نہ تھی اور پھر قصبے بھر میں کون تھا جو انھیں نہیں جانتا تھا۔ دادا کی پھیلی ہوئی زمینیں ضبط ہو گئیں۔ مگر پھر بھی وہ گھرانے بھر کی رئیسی اور حویلی والے اختر میاں تو تھے ہی۔ لوگ بڑی تعداد میں پاکستان چلے گئے مگر ان جیسے بھی بہت سے جو یہیں رہ گئے۔ وہ اب بھی جب قصبے کے بازار میں پان منہ میں دبائے نکلتے تو پرانے ماسٹر صاحب "اختر میاں سلام" ضرور پکار دیتے اور نئے لوگ پلٹ پلٹ کر دیکھتے۔ نئے آنے والے بھی انھیں مانوس نظروں سے دیکھنے لگے ـــ کچھ ڈھنگ ہی ایسا تھا۔ اختر میاں کا کہ خواہ مخواہ لوگ مرعوب ہوتے۔ بزرگوں جیسی باتیں۔ بڈھوں جیسے مشورے۔ قصبے میں کوئی ان سے مشورہ لے یا نہ لے مگر یہ موقع پا کر مشورہ ضرور دیتے۔

"میں تو کہتا ہوں کہ ——" اختر میاں دیہات ہمیشہ اس شان سے شروع کرتے کہ خود ان کی نظروں میں اپنی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ علمیت اور معاملے میں تجربے آخر کہہ دینے کی صلاحیت بھی خداداد تھی۔ اسکول تو خیر انہوں نے آٹھویں جماعت سے چھوڑ دیا تھا بلکہ دادا نے کمزور صحت کی بنا پر چھڑوا دیا تھا۔

"میں سب سمجھتا ہوں۔ یہ یوں ہی نہ تھا۔" اندھیری اسی ہوئی رات میں ستاروں بھرے آسمان تلے پلنگ پر پڑے پڑے انہوں نے پھر سوچا اور ان کا دل گہرے درد اور ناقابل فہم افسوس سے بھر گیا۔

"یہ عقل میں نے تجربوں سے سیکھی ہے۔ واللہ گھاس کھود کر نہیں لی۔" اختر میاں نے آنکھیں بند کر کے اپنی زندگی کی ٹیڑھی ترچھی پگڈنڈیوں پر پلٹ کر نظریں ڈالیں۔ جن پر طرح طرح کے پھول قسم قسم کے کانٹے سر نہوڑائے پڑے تھے۔ دادا جنہوں تھے۔ وہ اپنی نسل کو اپنی زندگی میں کوئی بھی اختیار بخشنا گناہ سمجھتے تھے۔ مگر کوئی کہاں تک کسی کی موت کا انتظار کر سکتا ہے اختر میاں اپنی بیوہ ماں کے ایک ہی بیٹے تھے۔ قصبے کے مڈل اسکول کے زمانے میں ہی وہ سیانے تھے۔ انہیں پیسے دو اماں الگ اور اماں دبی دبائی رقمیں نکال کر ہاتھ پر رکھ دیتیں۔ قصبے کا بازار ننھا سا سہی۔ مگر ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ——

فرض کرو بازار میں اپنے کام کی چیز نہ ملی تو پھر گھر لے ہی نہیں گئے۔ کبھی کبھی ضرورت پر لوگ گھر کی چیز بھی اٹھا کر اونے پونے بیچ دیتے ہیں۔

لیکن اختر میاں اپنے گھر اور خاندان کی روایتوں کے معاملے میں ہمیشہ سے بہت پکے تھے۔ مگر میں جب وہ اپنی مرجھائی سی بڑی بہن کو چاروں طرف سے بند آنگن میں چلتے پھرتے دیکھتے تو انہیں عجیب سا اطمینان ہوتا۔ جیسے کسی نقب زن کو اپنی دیوار میں محفوظ دیکھ کر خوشی ہو سکتی ہے۔

"آپا کہاں چلیں؟" اختر میاں بہن کو ٹوکری اٹھائے بوڑھی کی طرف جاتے دیکھ کر چلاتے —— بہن ٹھٹھک کر کھڑی ہو جاتی۔ اور اپنی بڑی بڑی گائے جیسی معصوم آنکھوں سے بھائی کو دیکھتی ——

"گائے کو بھوسہ نہ ڈالوں؟" وہ دھیرے سے پوچھتی؛ "وہ بوڑھی گائے کو خود ہی چارہ ڈالتی۔

"ہوں اچھا —— یہ بات ہے ——" اختر میاں سگریٹ جلا کر مطمئن ہو جاتے۔ لیکن آج —— آج انہیں یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے ان کے گھر میں بھی کہیں ضرور نقب لگ گئی —— واپسی میں راستے بھر وہ اپنے آپ سے لڑتے آئے۔ توبہ توبہ —— مگر ثبوت جو تھا۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنا منہ پیٹ ڈالیں۔

"بیٹا رنج نہ کر۔ لو ذرا سا کھا لو" اختر میاں کی اماں سینی میں روٹی اور سالن کا کٹورا اور پانی کا گلاس رکھ آئیں۔

"میں نہیں کھاؤں گا" اختر میاں تقریباً چلا اٹھے۔

"اے بیٹا اتنا رنج نہیں کرتے۔" اماں کا دل خون ہونے لگا۔ انہیں پہلے کیا معلوم تھا کہ اختر بہن کو رخصت کر کے اتنا رنج کریں گے نہیں تو سسرال والوں کے ہاتھ پاؤں جوڑتی کہ لڑکی کو جلدی بھیجیں

"اے بیٹا خط لکھواؤں گی بہن کو جلدی بھیجیں۔ لو اب کھاؤ ——" ماں نے پچکارا۔

"مجھے نہ چھیڑو —— وہ کبھی نہ آئے مجھے کیا غرض؟" اختر میاں چلائے اماں کھسیا کر رہ گئیں۔

"کھانا نہیں کھاؤں گا۔ مجھے بھوک نہیں ——" اور اختر میاں نے بازو میں منہ چھپا کر کروٹ بدل لی۔ شیروانی تلے ان کو اپنے جسم پر پسینے کے قطرے رینگتے محسوس ہوئے —— اور وہ ایک دم اٹھ کر دالان میں چلے گئے۔

ماں نے پریشان ہو کر کھانا پلنگ پر رکھ دیا اور خود دوسرے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ گھٹنے پر کہنیاں ٹکا کر ٹھوڑی ہتھیلی پر جما کر وہ لالٹین کی ہلکی روشنی میں بیٹے کو دیکھنے لگیں جو دالان میں کھونٹی پر شیروانی لٹکا رہا تھا ——

بیٹا جوان کا بھی کسی طرح آتا ہی نہ تھا ـــ جب تک بہن گھر سے رخصت نہ ہوئی تھی، بڑی بہن کو یوں سخت نظروں سے دیکھتا جیسے بڑا بھائی ہو ـــ اور اب بہن کو رخصت کر کے آیا ہے تو بہنوں کی طرح رنج کر رہا ہے ـــ کھانا بھی نہیں کھاتا اور نہ کوئی بات کرتا ہے ـــ تو بھی نہیں بھی سدا ابھی کسی کے گھر بیٹھی رہی ہیں ـ اللہ نہ کرے کبھی کسی بدنصیب کا نصیب اس کا ہم سہے ـ پاکستان سے لڑکی کے سسرال والوں کا خط جو آیا دلوں پر آتا تو دل میں ہول پڑ جاتی ـ نکاح کر کے ہی تو وہ لوگ پاکستان گئے تھے کہ ٹھکانا کر کے پھر رخصتی کرائیں گے ـ بہنوں کا سنا کہ پاکستان جا کر ایسے بدلے کہ دلہن کی صورت دیکھے بغیر طلاق لکھ کر بھیج دی ـ سنا ہے پاکستان میں ایک سے ایک صورت شکل اور دولت والے رشتوں کی بھرمار دیکھ کر لوگوں کی نیت بدل جاتی ہے لڑکوں کے دماغ جو ہیں آسمان پر ہو جاتے ہیں ـ اپنے خاندان اور ذات برادری کی لڑکیاں پسند ہی نہیں آتیں ـ اے ہمارے داماد کے بڑے بھائی نے آخر پاکستان ہی میں شادی کی نا ـ کیا گوری چٹی سی ہے، سنا ہے بڑی پڑھی لکھی ہے ـ کیا اپنے ـ بورے سے گٹ بٹ گٹ بٹ کرتی بھی ـ جو بات کہوں گی ـ میری بٹیا سے صورت شکل میں کچھ اچھی ہے ـ اللہ کا شکر ہے اسرد دولہا پاکستان جا کر ہمیں بھولے نہیں ـ دور سے سہی مگر آ تو گئے آ ہی دلہن رخصت کرا لے ـــ نہ آتے تو ـــ ؟ پاکستان جانے والوں کا بھروسہ ہی کیا ـــ نہ اختر میاں خود رات دن دوڑے پھرے تھے اور اب بہن چلی گئی تو مارے رنج کے کھانا نہیں کھاتے ـــ اماں بیٹھے بیٹھے سوچ رہی تھیں اور انہیں اپنے بیٹے کی اس ادا پر پیار بھی آ رہا تھا ـ

اختر میاں دالان سے نکلے تو اپنی دری اور تکیہ لئے ـ ماں نے جھٹ کر بستر بچھا دیا ـ اختر میاں ایک گلاس پانی چڑھا کر بستر پر پڑ رہے ـ ماں نے لالٹین کی بتی اور نیچی کر دی ـــ

" گھر کیا سونا ہو گیا ـ تم نے اسے سمجھایا تھا کہ روئے نہیں ـ" ماں نے ڈلی کترتے ہوئے گھر کے سناٹے سے اکتا کر پوچھا ـ

" نہیں " اختر میاں نے زور سے جواب دیا ـ اور ان کے سامنے اپنی بہن کی بڑی بڑی سیدھی ڈلوں والی آنکھیں آ گئیں ـ جو بار بار اپنے میاں کی طرف اٹھتی اور جھک جاتی تھیں ـ

" ہاں بیٹا بہن کو سمجھاتے بھی کیا خود ہی غم سے کلیجہ منہ کو آ رہا ہو گا ـ میں نے کہا تھا دلہے سے اسے پھل اور مٹھائی دلا دینا ـ دلا دی تھی ؟" ماں نے آنسو پونچھ کر پوچھا ـ

" ہوں " اختر میاں نے جواب دیا ـ اور ایک زوردار سانس لی ـ

" اللہ ایسی گرمی دیکھو اور وہ برقعے میں عورتوں کی وجہ سے سمجھی نہ کھول سکی ہو گی ـ"

ماں نے بڑے درد سے تصور کیا اور بانس کا پنکھا اٹھا کر اپنے اوپر جھلا ـ

اختر میاں تڑپ کر اٹھ بیٹھے ـ

" کیا بات ہے کھانا کھاؤ گے ؟" اماں چونکیں ـ

اختر میاں کا جی چاہا کہ وہ پٹاخے کی طرح دھماکے سے پھٹ کر دھواں ہو جائیں ـ تو گویا اماں سمجھ رہی ہیں کہ انہیں دفعتاً بھوک لگ آتی ہے ؟

" یا اللہ یہ اماں ایسی سادہ کیوں ہوتی ہیں ؟ اگر میں انہیں بتا دوں تو ؟" اختر میاں نے بات اپنے کلیجے میں گھونٹ لی ـ اور دوبارہ تاروں بھرے دہکتے آسمان تلے اپنے پلنگ پہ چپ پڑ گئے ـ ان کے جی میں چنگاریاں سی اڑ رہی تھیں بیٹے کی خاموشی سے تنگ آ کر اماں کمرے سے پلنگ پر بیٹھ لوٹا پانی چھڑک کر چپ لیٹ گئیں ـ اور پنکھا جھل جھل کر اپنی بچی کو یاد کرنے لگیں ـــ جب وہ پیدا ہوئی تھی تو باپ نے کیا جشن منایا تھا ـ کتنے دن تک پلٹ کر صورت نہ دیکھی تھی جب

ذرا ہاتھ پاؤں چلانے لگی تھی تو ماں نے اس کے ہاتھوں پیروں میں ننھی ننھی گھنگھروؤں والی چوڑیاں اور پازیبیں پہنا دیں۔ ہلتی تو چھن چھن گھنگھرو بولتے۔ جلد ہی دن میں باپ بھی گود میں اٹھا کر چومتے لگے — جب باپ مرے تو وہ چھوٹی ہی تھی مگر ماں کو روتے دیکھ کر ایک مرتبہ کو بھی ماں کا پلو نہ چھوڑا اور اس کے بعد وہ اس گھر میں اپنی ماں کا ایک چھوٹا سا نمونہ بن کر رہی۔ یہاں تک کہ وہ اس گھر سے پچیس سال کی عمر میں روتی دھوتی رخصت ہو گئی۔

وہ دن بھر گھر کا کام کرتی۔ لیکن جب سے وہ جوان ہو گئی تھی کئی بار ماں اسے بوجھ سمجھ کر خواہ مخواہ جھڑک بھی دیتا مگر وہ کیسی گائے جیسی بھولی بھولی آنکھوں سے ماں کو دیکھتی کہ دوسرے لمحے ماں تلافی کر دیتی — اور اب وہ اپنے گھر کی ہو گئی۔ اس کا گھر بھی کتنی دور تھا — ایک اور ملک — ماں کا دل رو رہا تھا — وہ چاہتی تھیں کہ اختر میاں تفصیل سے سفر کی ساری بات بتائیں۔ مگر اختر میاں تو جب سے چپ تھے —

اماں نے ماتھے کا پنکھا ہاتھ بڑھا کر اختر میاں پر جھلا۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ اماں نے سوچا تھکا ہوا تھا سو گیا۔

مگر اختر میاں سوئے نہیں تھے۔ وہ تو سوچ رہے تھے اور اندر ہی اندر اذیت سے تڑپ رہے تھے۔

رات گزرتی گئی۔ باہر آوارہ کتا رویا تو انہوں نے آنکھیں کھول کر ہر طرف دیکھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں سارا گھر انہیں بڑا پراسرار معلوم ہوا۔ جیسے ہر دیوار پر سے بھوت گردن جھکائے اندر جھانک رہے ہوں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے سامنے کی دیوار پر گیند کی طرح سمٹی ہوئی بلی باہر کو دگئی۔ ان کا دل دھڑک رہا تھا اور پسینہ روئیں روئیں سے پھوٹ پڑا تھا۔

اختر میاں نے سوچا کہ اگر وہ چپ رہیں گے۔ تو تمام دیوار کے پورے پسینے میں بہہ جائیں گے۔

"اماں سو گئیں۔" اختر میاں نے آواز دی

"آں — نہیں بیٹا۔" اماں کا دبلا پتلا جسم برابر کے پلنگ پر تہہ ہو کر بیٹھ گیا۔

"اماں آپ کیا سننا چاہتی تھیں — سنیئے — باجی ریل میں مردانے ڈبے میں بیٹھی تھیں —" اختر میاں نے ایکدم کہا۔ ماں نے نظر اٹھا کر بیٹے کو دیکھا "اچھا اور سنئے ریل چلی تو ان کی حرامزادی بھابی نے کہا برقعہ اتار دو دلہن جب ورنا تو یہیں لٹا —" اختر میاں کی آواز بلند ہو گئی۔ ڈربے میں ایک مرغی کڑکڑائی۔ ماں نے سر جھکا کر پنکھے کی ڈنڈی منہ میں لے لی۔ "اماں باجی کو آپ نے ہر وقت نگاہ میں رکھا تھا نا؟" اختر میاں نے سوال کیا اور ماں نے تکیے پر ہاتھ رکھ کر بیٹے کو دیکھا —

"بولیے میں سب سمجھتا ہوں، میرے آگ لگ گئی آپا بت بنی ہوئی تھیں"۔ اختر میاں نے اور اونچی آواز سے کہا۔

"کیا کہہ رہا ہے تو تیری زبان میں کیا کیڑے پڑ گئے ذرا سوں تو سہی؟" ماں کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔

"میں کہنا نہیں چاہتا مگر آپ سن لیجئے۔ باجی نے اتنے مردوں میں برقعہ اتار دیا — سنا کچھ — ؟

"تو جیسے اس کی سسرال والوں نے کہا کیا، ہمیں کیا؟" ماں نے دھیرے سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں — یہ میں جانتا ہوں مگر اماں آپا ذرا نہ شرمائیں۔ آنکھیں بھی نہ جھکائیں — آپا کیسی تھیں اماں؟" اختر میاں پھٹی ہوئی آواز میں چلائے — مگر ماں اسی طرح بیٹھی رہیں۔ ان کی کوئی خیال نہ کر کے اختر میاں نے مایوس ہو کر لیٹ جانا مناسب سمجھا —

یا اللہ یہ مائیں اتنا سادہ کیوں ہوتی ہیں۔ اختر میاں کیا سوچ رہے ہیں۔ آخر وہ یہ سمجھتی کیوں نہیں — اختر میاں کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہہ کر تکیے میں جذب ہو گئے۔ کانٹا ابھی تک کھٹک رہا تھا۔ ماں [illegible]

ــــ کرتی ہوئی سماعت میں جو اکا یک ٹھنڈا جھونکا ہلکورے سا دے گیا۔ باہر احاطے میں دادا زور سے ہانپے اور اتنے ہی زور سے تھوکے۔

اور ان سے پرے بھوسے کی خالی ناند پر بوڑھی مرجھلی گائے منہ مار کر ڈکرائی ــــ جیسے آج کسی نے بھوسہ نہیں ڈالا تھا ــــ

”اس کمبخت کو کوئی نہیں خریدتا قصائی تک نہیں۔“ اختر میاں نے اپنا دھیان بٹانے کو سوچنا شروع کیا۔ مگر یہ نہ سوچا کہ وہ گئو رکھشا والے جو جان پر سوار ہیں۔

مہندر ناتھ

قتل گاہ

منوہر ایک وسیع پھیلے ہوئے میدان میں کھڑا تھا۔ رات بے حد تاریک تھی۔ اور آکاش پر ابھی تک چاند نمودار نہ ہوا تھا۔ میدان کے چاروں طرف اونچے اونچے مکان ایستادہ تھے اور اُن کھڑکیوں سے قمقموں کی روشنی اُس کی طرف جھانک رہی تھی۔ بجلی کے کھمبے اس خاموشی میں پہرے داروں کی طرح کھڑے تھے اور دور سمندر آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔ سمندر کے کنارے جو تالاب سا ہوا تھا۔ اس کی سطح خاموش اور ساکن تھی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے لیکن سڑکوں پر ابھی تک آمدورفت تھی۔ منوہر اس وسیع میدان میں اکیلا کھڑا تھا۔ اور کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس کے خوابوں کی ملکہ اُرونا ابھی تک نہ آئی تھی۔

شاید اُرونا آج نہ آئے لیکن اس وسیع میدان کا ہر ذرہ پکار رہا تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔ آج تک وہ اپنے وعدہ پر قائم رہی ہے۔ جس جگہ منوہر نے اُرونا کو آنے کے لئے کہا، وہ ضرور آئی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ گھنٹہ دیر کر کے بھی ہو۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ وعدہ کر کے نہ آئی ہو۔

محبت کی رات عجیب پیاری اور دلکش ہوتی ہے دل بیکار دھڑکتا رہتا ہے جیسے اس محبت کے اور کچھ کام نہیں سب کچھ پانے کے بعد بھی ٹکٹکی لگائیں اس پھیلے ہوئے میدان کے دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ سارا میدان اندھیرے میں ملبوس تھا۔ ایک اُداس سناٹا اُس کی رگ و پے میں سما رہا تھا۔ کبھی کبھار کسی کُتے کے بھونکنے کی آواز آجاتی یا سڑک پر دوڑتی ہوئی بسوں اور کاروں کے پہیوں کی آوازیں اس سناٹے کو چیر دیتیں لیکن پھر وہی سناٹا، وہی خاموشی میدان کے آخری حصے پر ایک کلب تھا۔ اب اُس کے دروازے بھی بند ہونے لگے تھے۔ اُرونا نے کہا تھا کہ وہ ساڑھے گیارہ بجے تک اس میدان میں پہنچ جائے گی۔ کیونکہ اسی میدان سے گزر کر اسے ہر روز اپنے گھر جانا ہوتا تھا۔ اُرونا کی ناٹک کی ریہرسل ساڑھے گیارہ بجے ختم ہوتی ہے۔

اُس نے سوچا اُرونا عجیب سی لڑکی ہے تقریباً ہر عاشق کے لئے اُس کی محبوبہ عجیب سی ہوتی ہے وہ سب سے نرالی ہوتی ہے۔ اُرونا کو ناٹک میں کام کرنے کا بہت شوق تھا کئی بار تو یہ شوق جنون کی صورت اختیار کر لیتا۔ بھلا ناٹک میں کام کرنے سے کیا ملتا ہے۔ یہ کوئی پروفیشنل تھیٹر تو تھا نہیں کہ ہر مہینے کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا۔ کچھ لڑکے لڑکیاں مل کر ڈرامہ کی ریہرسل کر لیتیں۔ اور پھر ڈرامے کو تیار کر کے مزدوروں کی چالوں میں چلے جاتے۔ اور انہیں ہنسا کر یہ لوگ خوش ہو جاتے۔ انہیں اچھی باتیں سنا کر انہیں تسلی دیکر اُن کی تھکی ہوئی اداس زندگیوں میں نئی اُمنگوں اور خواہشوں کا اضافہ کرتے۔ یہ دیکھ کر کہ انہوں نے مزدوروں کو ہنسا دیا۔ اُن کے دلوں کو گرما دیا۔ یہ لوگ ناٹک ختم کر کے گھروں کی طرف رخ کرتے۔ کئی بار رات کے دو بجے گھر پہنچتے تھکے ماندے بھوکے پیاسے پیدل چل کر، صرف چائے کا ایک کپ پی کر یا بھجیا اور ڈبل روٹی کھا کر یہ لوگ سو جاتے ان لوگوں کا خیال تھا کہ اس طرح مزدوروں اور کسانوں میں کام کر کے وہ ان میں جاگرتی پیدا کر سکیں گے۔ انقلاب کی مبہم سی تصویر جس کے لئے انکی روحیں تڑپ رہی تھیں۔ وہ ان لوگوں میں جنم لیں گی اور ایک دن ——

لیکن وہ دن دور جا رہا تھا۔ زندگی میں تلخی، بھوک اور بیکاری بڑھتی جا رہی تھی۔ اور یہ لوگ جن میں اُرونا بھی شامل تھی۔ اپنی دھن کے پکے تھے۔ والدین کی مخالفت کے باوجود ان کی رگوں میں انقلابی جوش کی کمی نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک طوفان کی طرح آگے بڑھ رہے تھے۔ وہی جنون وہی آگ۔ وہی تپش ان کے سینے میں موجزن تھی۔ وہ دن ضرور آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ ایک دن مزدوروں کے ہاتھ میں جو [illegible] اور اسی امید میں جلد جلد وہ زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ اُرونا اور منوہر

صبا

کہاں ملاقات بھی ہاں ماحول میں ہوئی۔ ہائے وہ آجائے۔ تاکہ اس کے دل کی دھڑکن تو کم ہو جائے۔ کیا ہوا اُسے۔ سوہر نے آکاش کی طرف دیکھا اُسے کہیں چاند نظر نہ آیا۔ سمندر اسی طرح ہانپ رہا تھا۔ وہ کہاں غائب ہو گئی تھی اس کے دل میں کیوں ایک تلاطم برپا تھا۔ یہ رات اتنی اندھیری کیوں تھی۔ چاند ابھی تک کیوں نہ نکلا تھا۔ کیوں ساحل کے قریب لہریں آہیں بھر رہی تھیں۔ آکاش کے تارے کیوں اداس نم دیدہ تھے۔ آج ناریل کے درخت کیوں چپ چاپ کھڑے تھے کیا ساری کائنات نے اس کے خلاف ایک سازش کر رکھی تھی۔ آہستہ آہستہ سڑکوں پر آمد و رفت کم ہو رہی تھی۔ یہ لمحات کتنے دلکش تھے یہ گزرتی گھڑیاں کتنی پیاری تھیں۔ یہ انتظار کی گھڑیاں کیوں اس کے دل کی رفتار کو برقی رو کی طرح آگے دھکیل رہی تھیں۔ کیوں اس کی ہر سوچ نفس پر موج سا کسی کے انتظار میں نگاہیں بچھا رہی تھی۔ یہ کیسی ارونا تھی۔ یہ کیسی لڑکی تھی۔ جسے اسے والدین کی پرواہ نہیں اپنی زندگی اپنے مستقبل کے متعلق کیوں نہیں سوچتی۔ بس ایک ہی دھن۔ بس ایک ہی خواہش، بس ایک ہی سماں۔ ناٹک میں کام کئے جاؤ۔ اور جنتا کی سیوا کرو یہ کس قسم کی انقلابی آگ تھی، جس میں انسان خود ہی پس جاتا ہے کبھی تو راحت کے لمحات سے ہمکنار ہو جاؤ۔ کبھی تو سوچو کہ تم کیا کر رہے ہو، کیا ہو گئے، اس کے بعد کیا ہوگا۔ یہ گرمی یہ آگ یہ تڑپ کب تک سینے میں لاوے کی طرح تڑپتی رہے گی۔ کیا یہ آگ کبھی ٹھنڈی ہو گی۔

اب تو ہوا بھی سرد ہو چلی تھی۔ ناریل کے درختوں نے سرگوشیاں شروع کر دی تھیں۔ یہ کس کی آمد تھی کائنات کے سناٹے میں ایک ہلچل مچا دی تھی۔ گھروں کی کھڑکیاں بند ہونے لگی تھیں لیکن چاند ابھی تک نہ ابھرا تھا۔ رات اور تاریک ہو رہی تھی۔ اور وہ اکیلا اس میدان میں کھڑا تھا۔ اپنی خواہشوں کا شکار ہو کر اس کی روح میں کوئی سا کرب تھا۔ اس کے دل کے نہاں خانے میں کوئی خلش تھی جو اس سے ہر روز ارونا سے ملنے کے لئے کہتی تھی یہ کس کی پکار تھی۔ کیا جذبہ تھا جو اسے ہر روز اس جیسے ہوتے ہیں لے آتا تھا یہاں وہ کب تک کھڑا رہے گا۔ کوئی سپاہی آ کر پکڑے تو وہ کیا جواب دے سکے گا۔ وہ چھ مہینوں سے ارونا سے مل رہا تھا۔ بالکل اسی طرح اسی جذبے کے زیر اثر۔ ارونا سے الگ رہتے ہوئے بھی وہ اس کے قریب رہتا تھا۔ اگر ایک دن وہ ارونا سے نہ مل پاتا۔ تو رات کی نیند حرام ہو جاتی۔ جب کبھی وہ دیر کر کے آتی۔ تو وہ سوچنے لگتا کہ ارونا اسے چھوڑ کر چلی جائے گی وہ کسی امیر کے لڑکے سے محبت کرنے لگی ہے۔ اسے ارونا پر بھروسہ کیوں نہ تھا۔ کیا وہ چھ مہینوں سے اس کے ساتھ جھوٹ بول رہی تھی۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ آئے گی۔ وہ ضرور آئے گی لیکن انتظار کرتے کرتے وہ تھک سا گیا تھا۔ اگر وہ آج نہ آئی تو وہ اس سے کبھی نہ ملے گا۔ نہ جانے کیا ہوا۔ وہ ایک گھنٹے سے ارونا کا انتظار کر رہا تھا۔ نہ جانے انتظار کی گھڑیاں کب ختم ہوں گی اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا، بدن کی نسیں کھنچ سی گئی تھیں۔ اور ذہن میں عجیب و غریب باتیں چکر لگا رہی تھیں کہیں ارونا کسی بس یا موٹر کے نیچے تو نہیں آگئی چلتے ہوئے وہ آگے پیچھے نہیں دیکھتی۔ بس سر پر قدم اٹھائے ہوئے وہ آگے بڑھتی جاتی ہے نہ بائیں کی پروا۔ نہ دائیں نگاہ ڈالنا — ہو سکتا ہے وہ کسی ہسپتال میں اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہی ہو۔ اور وہ یہاں کہاں انتظار کر رہا تھا۔ ارے۔ کسی غنڈے نے پکڑ لیا ہو تو۔ اکیلی لڑکی۔ نڈر۔ بیباک۔ یہ غنڈے تو بری طرح پیچھا کرتے ہیں ہو سکتا ہے وہ کسی اور لڑکے کے ساتھ سمندر کے کنارے بیٹھ کر کہیں تاک رہی ہو۔ ایسی لڑکیوں پر کیا بھروسہ۔ لیکن وہ ایک عام سی لڑکی نہ تھی۔ ایک ذہین دماغ کی مالک تھی اور کافی سوجھ بوجھ کی باتیں کر لیتی تھی۔ اُسے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ سیاست پر اچھا خاصا عبور تھا۔ بحث کرتی تھی۔ اسے غصہ آگیا۔ بیکار سیاست کی باتیں۔ نہیں آتی تو نہ آئے۔ ایسی لڑکیوں کو موت آجائے تو بہتر تھا۔ بھلا یہ کیا انتظار کہ دل دھڑکتے دھڑکتے بند ہو جائے۔ سانس رک رک کر آنے لگے۔ دماغ کی نسیں تن جائیں۔ سینے میں آگ بھر جائے اور منہ سے ایسی سانسیں نکلنے لگیں جیسے آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ پھٹ پڑا ہو

لیکن اگر ایسی محبت کرو۔ آئے تو ابھی، وہ ایسی باتیں سنائے گا کہ مزاج ٹھکانے لگ جائیں گے اب اور انتظار نہیں ہو سکتا

آج کے بعد وہ اُس سے کبھی نہ ملے گا۔ وہ یوں موت کے منہ میں جانا نہیں چاہتا۔ یہ محبت کی آخری رات تھی۔ یہ جنون اور دیوانگی کی آخری آزمائش تھی اُس نے محبت میں ایک بیکار سا روگ لگا رکھا تھا۔

اور چاند ابھی تک نہ ابھرا تھا۔ ستاروں کی روشنی میں وہی اندھیرا تھا۔ ناریل کے درخت اُسی طرح استادہ تھے بنگلوں کی کھڑکیاں بند ہو گئی تھیں۔ سڑکوں پر سناٹا چھانے لگا۔ اور اب ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان سڑکوں پر اب کوئی نہیں چلے گا صبح کبھی نہ ہو گی۔ یہ کیسی ویرانی تھی۔ یہ کہاں کا صحرا تھا۔ ان سڑکوں پر چلنے والے کہاں مر گئے یہ گھما گھمی کیسے غائب ہو گئی۔ موت کیوں اپنا دامن پھیلائے ہوئے چاروں طرف سے آ رہی تھی۔ سمندر کی آہیں کیوں اس سناٹے کو چیر رہی تھیں۔ یہ دل کی دھڑکن کیوں اتنی تیز ہو گئی تھی اس کے دل و دماغ میں اتنا ہیجان کیوں برپا تھا۔ یہ کیسا زہر اُس کی روح میں سما گیا تھا۔ کانوں میں توپوں کے چلنے کی آوازیں کیوں گونج رہی تھیں۔ یہ کس کی آمد کی سلامی اتاری جا رہی تھی۔ اگر اس کا دل اسی رفتار سے کچھ عرصہ اور دھڑکتا رہا تو یقیناً دل کی رگیں پھٹ جائیں گی اور خون کا چشمہ نکلے گا۔

انتظار کرتے کرتے اُس کی نگاہوں میں جلن ہونے لگی اب وہ مایوس ہو گیا تھا۔ شاید وہ اب نہیں آئے گی۔ لیکن اس کے قدم اپنی جگہ پر جامد ہو گئے تھے۔ نگاہیں میدان کے دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ واپس چلا جائے ان خواہشوں اور امنگوں کو یہیں دفن کر دے۔ تاکہ یہ میدان اس کی محبت کا قبرستان بن جائے۔ اور پھر کبھی وہ اس منحوس میدان کی طرف رخ نہ کرے۔ اُس کی نگاہیں پھر میدان کے گیٹ کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ دور سے ایک سایہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ سایہ اُس کے قریب آ رہا تھا۔ ہاں وہی چال۔ سست سست قدم۔ سر آگے کی طرف جھکا ہوا۔ ہاں وہی سفید سی میلی سی ساڑی۔ ہاں وہی تو ہو گی۔ اور کون ہو سکتا ہے۔ اس وقت کیا ایک رات اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ سارا شہر سو رہا تھا لیکن یہ لڑکی جاگ رہی تھی۔ اُس کی دل کی دھڑکن اور تیز ہوتی گئی — ٹھہر اے دل بے قرار — ٹھہر۔

ہاں اُرونا ہی تھی۔ پگلی اُرونا۔ بیوقوف اُرونا۔ اپنی دھن کی پکی اُرونا۔ بدصورت اُرونا۔ موٹے موٹے ہونٹوں والی اُرونا! بکھرے بالوں والی اُرونا۔ اس اندھیرے میں اُسے پہچاننا کتنا آسان تھا۔ اُرونا جس کو دن اور رات کا دھیان نہیں۔ محض ایک جنون۔ ایک انقلابی جنون۔ یہ کہاں کا انقلاب تھا کہ رات کے ایک بجے تم ناٹک کی ریہرسل ختم کر کے گھر واپس لوٹو۔ تمہارے پاس بس کا کرایہ نہیں ٹیکسی کے لئے روپیہ نہیں۔ لیکن ناٹک کی ریہرسل ضرور ہو گی۔ سورج اِدھر سے اُدھر چل سکتا تھا لیکن تمہاری ناٹک کی ریہرسل نہیں ٹل سکتی

آگ لگے اس ناٹک کو — وہ نہ صرف اپنی زندگی کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ بلکہ منوہر کی زندگی کو لٹکا رکھا تھا سولی پر لٹکا دیا تھا

وہ اس کے قریب آ گئی۔ منوہر کے دل کی دھڑکن اب ذرا سست پڑ گئی تھی۔

ہاں اُرونا۔ منوہر نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھ کر سوچا۔ یہی اُرونا تھی وہی نیند سے مدہوش آنکھیں جن کی پلکیں نیند کے بوجھ سے دبی جا رہی تھیں۔ ہاں وہی پریشان بال۔ جن میں وہ تیل لگانا بھول جاتی تھی۔ ساڑھی میلی سی۔ نہایت ہی بے ڈھنگے انداز میں پہنی ہوئی۔ ساڑی تو ڈھنگ سے نہیں پہن لیا کرو۔ نہ کانوں میں بندے۔ نہ ہاتھوں میں چوڑیاں۔ نہ ہونٹوں پر لپ اسٹک نہ ماتھے پر زلف پریشاں۔ اندھیرے میں مانگ بھی نظر آتی تھی۔ بس بالوں کو پیچھے کھینچ کر باندھ دیا تھا۔ اور چپل پھٹی ہوئی۔ کریم نہیں تمہارے پاس اتنا کیوں اتراتی ہو۔ کس اُمید پر زندہ ہو۔ وہ کونسا عاشق زار ہے جو تمہیں یوں مل جانے پر سہارا دے گا

اُرونا نے اس کی طرف دیکھا۔ بڑی احسان مند نگاہوں سے جیسے وہ اُسے دیکھ کر منزلِ مقصود پر پہنچ گئی ہو۔

"خفا ہو مجھ سے" وہ رک رک کر بولی۔

نہیں۔ بہت خوش ہوں۔ بے حد خوش ہوں۔ تم دنیا کا عظیم الشان کام کر کے آ رہی ہو نا۔ اگر تم اسی طرح انقلاب کی مشق

صبا

ہیں۔ تم ایک دن میری لاش اس میدان میں تڑپتی ہوئی دیکھو گی'' منوہر نے جوشیلے انداز میں یہ الفاظ کہے۔

وہ ہنس پڑی۔ کتنی درد بھری پھیکی تھی یہ ہنسی۔ نہ جانے کیوں۔ جب تک وہ اُس سے دور تھی۔ اس کا سینہ غصے سے جل رہا تھا ایکا ایک اسے دیکھ کر اس کے دل میں ایک قرار سا آ گیا تھا۔ اُس کے غصے کی آگ دھیمی پڑ گئی تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" اُرونا نے گھاس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کم چلانا خوب آتا ہے" "بیٹھ کر کیا کروں" اُس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ یہ کیسی ملاقات تھی۔ نہ کلب نہ تھیٹر، نہ ڈرائنگ روم، نہ رنگین پردے، نہ صوفہ سیٹ، نہ ہوٹل، محض ایک میدان، اندھیری رات، ٹھنڈی رات سناٹا۔ یہاں نہ کافی تھی، نہ چائے کا پیالہ، نہ ٹوسٹ نہ جام، نہ چھنکتی ہوئی چوڑیاں، نہ مہندی سے بھرے ہوئے ہاتھ، نہ سہیلیوں کی مسحور ہنسی، نہ ڈھولک، نہ گیت، نہ گرم سانس۔ صرف لہروں کا مدھم گیت تھا۔ وہ کیا کہے اُس سے، اس انتظار میں اس پر کیا گذری۔ انتظار کی گھڑیاں اُس نے کیسے کاٹیں۔ وہ اُس کے سامنے بیٹھی تھی۔ ایک گنہگار بن کر۔ اس کے تمام دعوے اور وعدے بیکار تھے وہ کسی اور لڑکے سے محبت نہیں کرتی۔ اگر وہ کسی اور سے محبت کرتی تو اس گھنٹہ بھر بستہ رات میں وہ اکیلی کبھی نہ آتی۔ کس قدر بھروسہ تھا اُرونا کو اُس پر۔ یہ کیسی لڑکی تھی جسے دنیا کی پروا نہ تھی۔ اپنی زندگی کی پروا نہ تھی، سماج کی پروا نہ تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو" اُس نے اپنے موٹے موٹے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"سننا چاہتی ہو" اُس نے تلخ لہجے میں کہا۔

"جی"

"تو سن لو۔ میں آئندہ تم سے یوں نہیں مل سکتا۔ میں یوں پاگلوں کی طرح تمہارا انتظار نہیں کر سکتا۔" منوہر نے دل کو کڑا کر کے کہا۔

یہ جواب سن کر اُرونا کا نچلا ہونٹ دانتوں تلے کٹ سا گیا۔ اور ایک ہلکی سی چیخ اُس کے لبوں سے نکل گئی۔ آنکھوں کی پلکیں لرز لرز سی گئیں۔ اور ناک کے نتھنے پھیل سے گئے اور آنکھوں میں ایک نمی سی آ گئی۔ اُرونا کی آنکھیں بے حد خوبصورت تھیں، ذہانت سے بھری ہوئی آنکھیں۔ جن کے اندر اس اندھیری رات کے راز پوشیدہ تھے۔ لیکن منوہر کا دل پتھر کا ہو گیا تھا۔ وہ آج اس لڑکی کو بتا دے گا کہ وہ محض الو نہیں تھا۔ اُس کی محبت فرہاد اور مجنوں کی طرح نہ تھی۔ وہ مجنوں کی طرح صحرا میں مارا مارا نہیں پھر سکتا۔ نہ فرہاد کی طرح کوئی پہاڑ نہیں کاٹ سکتا۔ وہ اس طرح کسی لڑکی کا انتظار نہیں کر سکتا۔ چاہے وہ حسن و جمال کی شاہکار کیوں نہ ہو۔

"تم نہیں جانتے منوہر۔ میرے پاس بس میں آنے کے لئے پیسے نہ تھے پیدل چل کر آئی ہوں نا۔ یہ دیکھو میرے پاؤں۔" اُس نے چپل اُتارتے ہوئے کہا، "پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں ایک دو کانٹے پاؤں میں چبھ گئے ہیں۔ اور ان سے خون بہ رہا ہے" اور یہ کہکر خاموش ہو گئی۔ "اور تم نے یہ حالت خود بنا کر رکھی ہے کس نے کہا تھا۔ یہ کام کرو۔" منوہر نے کڑک کر کہا۔ "کیا تم ۔۔۔ تم تو پڑھی لکھی ہو نا۔ کیا تم اور کوئی کام نہیں کر سکتیں" اور وہ یہ کہکر خاموش سا ہو گیا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" وہ بولی۔ اُس نے ساڑھی کے پلو کو سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "تم ۔ تمہیں کیا۔ تمہیں صرف میرا انتظار کرنا پڑتا ہے نا۔ اور کچھ نہیں۔ مجھے۔ مجھے گھر جانا ہے۔ ماں کی گھرکیاں سننی ہیں، باپ سات سال سے اختلاج قلب کی بیماری میں [illegible] ہے۔ اور لڑکی یہاں بیٹھی ہوئی تم سے عشق کر رہی ہے جانتے ہو، میرے پاس ان کے علاج کے لئے روپیہ نہیں۔! [illegible] کو سیکر [illegible] رہتا ہے۔ چھوٹا بھائی اسکول میں پڑھتا ہے مجھ سے بڑی بہن دفتر میں نوکر ہے جو کچھ وہ کماتی ہے [illegible] ہو جاتا ہے پھر بعد میری شادی کے لئے ایک نئے لڑکے کا انتخاب کیا جاتا ہے ۔۔ میں ۔۔ میں" اس کی آواز ذرا [illegible] دو سال سے کام کی تلاش میں گھوم رہی ہوں۔ کام نہیں ملتا۔ میری عمر ستائیس برس کی ہے [illegible]

شادی ۔۔۔ نہیں کی ۔۔۔ اور میں ناٹکوں میں ریہرسل کرتی ہوں۔ تم سے ملتی ہوں۔ کوئی ڈھنگ کا کام نہیں۔ جانتی ہوں۔ اپنا غم ہے اُس کو بھولنا چاہتی ہوں۔ اور تم ۔۔۔ تم صرف میرا انتظار کرتے رہتے ہو۔ بہت کام کرتے ہو۔ تمہیں کیا معلوم ۔۔۔ کہ میں نے ۔۔۔ دن بھر سے کچھ کھایا نہیں تھا ۔۔۔ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کے لئے رک گئی۔ اور پھر ہچکچا کر کے بولی "ہاں کھانا گھر میں نہیں تھا۔ راشن کے کیلئے روپے نہ تھے۔ میری بیوہ بہن بھی ہمارے ہاں رہتی ہے۔ اُس کی ایک بچی ہے۔ اس کے لئے دودھ نہیں تھا۔ بازار میں دودھ بہت ہے لیکن دودھ کے لئے پیسے نہ تھے۔ اور میرے پاس بھی پیسے نہ تھے۔ بیوہ بہن نے میری طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو اُتر آئے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں اُس گھر میں کیسے رہوں کیسے کھاؤں۔ اس لئے دن بھر مجھے بھٹکنا پڑتا ہے۔ اور تمہیں میرا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہی نا۔ دو وقت کا کھانا کھا کر دوستوں سے ملنے کے بعد، گپیں ہانکنے کے بعد تمہیں میرا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اور تم اپنی محبوبہ سے ملنے کے لئے یہاں آجاتے ہو۔ یہی نا"

یہ باتیں سن کر اس کا سارا غصہ کافور ہو گیا۔ اُسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔

"مجھ سے روپے مانگ لئے ہوتے"

"تم میرے کیا لگتے ہو۔"

"میں تمہارا کچھ نہیں لگتا۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔" "اپنے گریباں میں منہ ڈال کر دیکھو۔ میں تم سے روپے مانگتی ہوئی اچھی لگتی ہوں۔ تمہیں ۔۔۔ جیسے میں ایسا سب کچھ دے چکی ہوں۔ میری اور تمہاری ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔ تم سے روپے مانگوں۔ میں نے آج صرف ایک کپ چائے پی تھی۔ اور کچھ نہیں۔ گھر میں راشن نہیں" یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

منوہر نے اپنی جیب کی تلاشی لی۔ اُس کی جیب میں دس روپے کا آخری نوٹ تھا۔ منوہر بھی ایک عرصے سے بیکار تھا۔ حال ہی میں کچھ کام ملا تھا۔ اور وہ اپنا پچھلا قرضہ چکا کر ذرا اپنے آپ کو آسودہ محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن یہ نوٹ اس کی ساری پونجی تھی اُس کی ساری کائنات تھی۔ اگلے ماہ کام ملے یا نہ ملے۔ لیکن سوچنے کا وقت نہ تھا۔ اُس کی انگلیاں دس کے نوٹ پر جمی ہوئی تھیں شیر کے پنجے کی طرح۔ اس کے دل کا ہر گوشہ رہ رہ کر پکار رہا تھا۔ کل کیا ہوگا۔ تمہارا کیا ہوگا۔ کافی جدوجہد کے بعد اس نے دس کا نوٹ نکال لیا۔ اور اُروما کو دیتے ہوئے کہا۔ "لو دس کا نوٹ راشن کے لئے۔"

"اسے اپنے پاس رکھو۔ میں تم سے روپے لینے نہیں آئی۔ اور نہ ہی آؤں گی۔ مر جاؤں گی۔ لیکن تم سے روپے نہ لوں گی"

"میں ایک دوست کی حیثیت سے روپے دے رہا ہوں۔ اسے محض قرض سمجھو۔ اور جب تم کمانے کے قابل ہو جاؤ گی۔ واپس کر دینا" اس نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"نہیں لوں گی۔" اُس نے بچوں کی طرح سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مر جاؤں گی۔ تم سے روپے نہ لوں گی۔ بہن نے کھانا کھایا نہیں۔ بچی شاید روتے روتے سو گئی ہوگی۔ اب مجھے جانے دو۔ رات بہت بیت چکی ہے" وہ اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ آنکھوں سے آنسو خشک ہو گئے تھے۔

"یہ رات کتنی حسین ہے، منوہر" وہ رک رک کر کہنے لگی۔ "میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی۔ لیکن تم میرا انتظار نہیں کر سکتے۔" اُروما نے منوہر کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ "مجھے بھولنا نہیں۔ میں تمہیں زندگی بھر نہ بھول سکوں گی" اُس کی نگاہیں پھر جھک گئیں۔

منوہر کا گلا رندھ سا گیا۔ سانس اندر ہی اندر گھٹنے لگی۔ یہ کیسی محبت ہے اس نے سوچا۔ یہ کیسی بھیانک بات ہے ہم کس جگہ کے رہنے والے ہیں کس جگہ جانے والے ہیں کہ ہمارے دلوں میں خون نہیں سہما ہوا [illegible] ہے۔ منوہر نے سوچا اُروما کے کہنے [illegible] آج شادی کر لیں۔ لیکن یہ کیسی شادی ہوگی۔ تاریک بیابانوں میں ملفوف نہ آنگن نہ باجا، نہ شہنائی، نہ ماتھے پر جھومر [illegible] [illegible] یہ کیسی شادی ہوگی۔ وہ کیا کر سکتا۔ لیکن شادی کر کے۔ یہ سب فضول ہے [illegible] سوچا [illegible]

لیکن یہ آپ کو دھوکا دینا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ پہچانتے ہیں۔ میں کچھ نہیں کرسکتا۔ اس کی کانپتی ہوئی انگلیوں کو اپنے ہاتھوں میں تڑپتے ہوئے دیکھ کر کچھ نہیں کرسکتا۔ اُسے ڈھارس نہیں دے سکتا۔ زندگی پانے کے لئے ترس رہی ہے۔ بولو کچھ تو کہو۔ وہ اس سے کیا کہدے۔ وہ رو بھی نہیں لے گی۔ وہ اُس کی بیوہ بہن کا خاوند کہاں سے واپس لے آئے۔ وہ اس کے باپ کے مرض کا علاج کیسے کرائے۔ اُس کی بہن کی بچی کے لئے کہاں سے دودھ لے آئے۔ اس ساری رات کی سیاہی کو کیسے نوچ کر رکھ دے۔

"مجھے جانے دو۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

منوہر نے پھر روک دینے کی کوشش کی۔

"میرا مذاق نہ اڑاؤ"، اس نے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

رات کی نس رگ سے خون بہہ رہا تھا۔ سارا میدان ایک قتل گاہ بن گیا تھا۔ دور چاند نکل آیا تھا لیکن چاندنی خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

"وہیں نہیں رک جاؤ۔ میرا گھر قریب ہے۔ کہیں کوئی میرے ساتھ نہ دیکھ لے۔ تم یہیں کھڑے رہو اسی اندھیرے میں۔"

وہ اُسی اندھیرے میں کھڑا رہا۔ اور امرت اپنے ساڑی کے پلو کو سنبھالتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ وہ ایک پتھر کی مورتی کی طرح جامد۔ ایک سایہ کی طرف تکتا رہا۔ وہ خود ایک سایہ بن گیا تھا۔ جیسے اندھیری رات نے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ دو بے قرار روحیں ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے الگ ہو رہی تھیں۔ رات اور تاریک ہوگئی۔ لہریں اور خاموش ہوتی گئیں۔ ناریل کے پتوں پر چاند کی کرنیں سوگئی تھیں۔

ہنس راج رہبر

چوپال کی بات

ہیرا سنگھ میرا پڑوسی ہے۔ جب موڈ میں ہو تو بڑی مزیدار باتیں سناتا ہے۔ وہ مغربی پنجاب سے آیا ہے۔ تقسیم سے پہلے ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ اس علاقے کے کھیت، ندی، نالے، لوگ اور اُن کے رواج اُس کے ذہن میں اس قدر رچ بس گئے ہیں۔ کہ کبھی بھولتا ہی نہیں۔ اب تو پھر بھی دہلی کی آب و ہوا اُسے کچھ موافق آگئی ہے۔ کاروبار بھی جم گیا ہے۔ اور وہ پہلے کی طرح اکھڑا اکھڑا محسوس نہیں کرتا۔ لیکن چار پانچ سال پہلے وہ بہت پریشان رہتا تھا اور اس پریشانی کو دور کرنے کے لئے وہ اپنے دیہات کے لوگوں کی باتیں سنایا کرتا تھا۔ ایک تو باتیں مزیدار ہوتی تھیں دوسرے اُسے سنانے کا ڈھنگ آتا تھا۔ اور میں بڑے شوق سے سنا کرتا تھا۔

ہیرا سنگھ اب اپنے کاروبار میں اس قدر الجھا رہتا ہے۔ کہ اُسے اب میرے پاس بیٹھنے اور باتیں سنانے کی فرصت کم ملتی ہے۔ لیکن چار پانچ سال پہلے اُس نے جو باتیں مجھے سنائی تھیں۔ اُن میں سے ایک بات ایسی ہے جو اکثر یاد آتی ہے اور جب یاد آتی ہے۔ میں دل ہی دل میں اُسے دہرایا کرتا ہوں لیکن جو مزا ہیرا سنگھ کی زبان سے سننے میں آتا ہے وہ خود دہرانے میں کہاں۔"

"کہو سردار جی کیا حال ہے" کل ہیرا سنگھ نے میرے قریب چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"حال اچھا ہے۔ تم سناؤ تمہارا کاروبار کس منزل پر ہے۔؟" میں نے جواب دیا۔

"کاروبار چل نکلا ہے۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ یہ ہماری ہی ہمت ہے۔ کہ محض ہاتھ پاؤں کے بل پر لڑ رہے ہیں اسی سلسلہ میں آپ کو ایک نئی بات سناؤں۔"

"وہ نئی بات میں پھر سنوں گا۔ پہلے وہی پرانی بات سناؤ۔"

"کونسی؟"

"کڑملی والی"

ہیرا سنگھ مسکرایا اور بولا۔ "تمہیں وہ بات بہت پسند ہے؟"

"بے حد"

"اچھا تو سنو"

اُس نے پاؤں اوپر کئے اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ آخری کش لگا کر سگرٹ باہر پھینک دیا اور کھنکار کر گردن سیدھی کرتے ہوئے بولا۔"

"آپ جانتے ہیں کہ شیخوپورہ کے جنگلی لوگ بڑے قدآور ہوتے ہیں۔ بات کے دھنی اور لڑنے میں شیر۔ دوست کے دوست اور دشمن کے دشمن۔ ان میں پرانے قبائلی رسم و رواج اب بھی قائم ہیں۔ اگر کسی خاندان کا فرد

بات سمجھتے ہیں۔ تو باقی لوگ اس کا انتقام لینا اپنا فرض سمجھیں گے۔ جب تک وہ انتقام نہیں لے لیتے گردن اونچی اٹھا کر نہیں چل سکتے۔ ان کے لئے یہ عزت اور ناموس کا سوال بن جاتا ہے۔ جس طرح دوب کی جڑیں اساڑھ کی سخت شدت کے باوجود زمین میں زندہ رہتی ہیں۔ اور ساون کا چھینٹا پڑتے ہی ہری ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ان کے دل میں بھی انتقام کا شعلہ نازک سے نازک حالات میں بھی سرد نہیں ہوتا۔ ذرا ہوا لگتے ہی بھڑک اٹھتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ لڑائی میں کبھی کوئی پیٹھ نہیں دکھاتا۔ موت سے مقابلہ آ پڑنے پر بھی جوانمردی سے لڑتے ہیں۔ ان کے متعلق کئی لطیفے مشہور ہیں۔ مثلاً

"تم ان لطیفوں کو چھوڑو مجھے صرف کرٹلی کی بات سناؤ۔"

"ایک تو سن لیجئے ورنہ مزا نہیں آئے گا۔"

میں جانتی ہوں کہ جب ہیرانند اپنے علاقہ کی بات کہتا ہے تو جانگلیوں سے متعلق لطیفے بھی ضرور سناتا ہے۔ اس سے اس کی روح کھل اٹھتی ہے۔ اس کے بیان میں تازگی اور شگفتگی پیدا ہوتی ہے لہذا صورت حالات کو سمجھ کر میں نے کہا۔ "اچھا سناؤ"

"ایک جانگلی اپنے گھوڑے پر سوار کہیں جا رہا تھا۔" ہیرانند نے لطیفہ کہنا شروع کیا۔ "گرمی کا مہینہ تھا اور راستے میں ایک ندی پڑتی تھی۔ گھوڑا جب منجدھار میں پہنچا۔ تو ندی کے پانی سے جسم میں ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ اور گھوڑا بیٹھنے لگا۔ جانگلی نے بہتیری ایڑ لگائی۔ مگر گھوڑا جھٹ سے بیٹھ گیا۔ اب سوار نے ٹانگیں ڈھیلی چھوڑ کر جانور سے کہا۔ اچھا بیٹا بیٹھ جاؤ۔ ہم تو کپڑے سکھا لیں گے۔ لیکن تمہیں غازی مرد کوئی نہیں کہے گا۔"

لطیفہ ختم کر کے ہیرانند کھلکھلا کر ہنسا۔ اور "غازی مرد" کا جملہ ٹیپ کے مصرع کی طرح پھر دہرایا۔

"واہ گھوڑا اور غازی مرد کیا زندہ دلی ہے" میں نے اس کی ہستی سے متاثر ہو کر داد دی۔

"ایسے ہیں ہمارے جانگلی لوگ۔ ان کے لطیفے بہت ہیں۔ اور بڑے مزیدار ہیں۔ مگر آپ کرٹلی کی بات سننے۔"

"ہاں سناؤ"

"کرٹلی ہمارے گاؤں کا ایک جانگلی تھا۔ چھ فٹ لمبا جوان۔ بڑا بہادر اور بڑا ہی لڑاکا۔ اس کے دادا کے ہاتھوں کسی دوسرے جانگلی خاندان کا ایک بزرگ قتل ہوا تھا۔ اس لئے دونوں خاندانوں میں کئی پیڑھیوں سے عداوت چلی آتی تھی۔ اور وہ کرٹلی سے اپنے بزرگ کا انتقام لینے کے درپے تھے۔

ایک مرتبہ ہمارے گاؤں سے جانگلیوں کی ایک برات قریب کے گاؤں میں جا رہی تھی۔ اس میں کرٹلی بھی شامل تھا اتفاق سے راستہ میں اس کی گھوڑی نے بچہ دیا۔ اور کرٹلی برات سے پیچھے رہ گیا۔ جس طرح قدیم زمانے میں زندگی خطرے سے اس قدر گھری رہتی تھی کہ جو کارواں سے بچھڑا سمجھو لٹ گیا۔ اسی طرح ان جانگلیوں کے لئے بھی کارواں سے بچھڑ جانا موت سے خالی نہیں تھا۔ کرٹلی گھوڑی کے نوزائیدہ بچے کو گردن پر لادے چل رہا تھا۔ اور ذرا پتہ ہلنے پر چونک اٹھتا تھا۔ جانے دشمن کہاں گھات لگائے بیٹھا ہو اور کب اچک کر دھاوا بول دے۔

آخر جس بات کا خدشہ تھا وہ سچ ثابت ہوئی۔ کرٹلی ابھی تھوڑی ہی دور چلا تھا۔ کہ اس نے دیکھا پانچ نوجوان لاٹھیاں ہاتھ میں لئے راستہ روکے کھڑے ہیں۔ وہ پانچوں بھائی تھے۔ اور اسی خاندان کے افراد تھے جس کے بزرگ کا قتل کرٹلی کے دادا کے ہاتھوں ہوا تھا۔ ان کا بوڑھا باپ بھی ساتھ تھا وہ ایک جھاڑی کے قریب پیچھے کھڑا تھا۔

"شیرو! دیکھتے کیا ہو۔ شکار سامنے ہے۔ آگے بڑھو" کرٹلی کو دیکھتے ہی باپ نے بیٹوں کو للکارا۔

کرٹلی نے سمجھ لیا کہ موت سامنے ہے اب ان کے ہاتھ سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ لیکن وہ گھبرایا نہیں۔ گھوڑی کے

بچے کو زمین پر رکھ کر اُس نے ایک نگاہ ڈرے سہمے بیٹوں پر ڈالی ۔ پانچوں کے چہرے تنے ہوئے تھے اور آنکھوں سے انتقام کے شعلے نکل رہے تھے ۔

"مرد بچے ہو تو مردوں کی طرح لڑو"۔ کرڑلی نے تہبند کو لنگوٹ کی شکل دیتے ہوئے کہا ۔

"تم لڑنے کو تیار ہو" ؟

"ہاں تیار ہوں" ۔

"تو پھر کیا چاہتے ہو" ؟

"ایک لاٹھی مجھے دے دو ۔ اور اکیلے اکیلے مقابلہ پر آؤ ۔ تاکہ پتہ چلے کہ کس نے اپنی ماں کا کتنا دودھ پیا ہے"

بات معقول تھی ۔ وہ بھی بزدل اور اوچھے نہیں تھے ۔ بہادر جانگلی تھے ۔ علاقہ کی روایت کے مطابق نہتے دشمن کو گھیر کر مارنا شان کے خلاف سمجھتے تھے ۔ ایک لاٹھی کرڑلی کو تھما دی اور منجھلا بھائی مقابلہ پر نکل آیا ۔ دونوں طرف سے وہ لاٹھیاں چلیں کہ دیکھنے والے عش عش کر گئے ۔ منجھلے بھائی نے بہادری کے لاکھ جوہر دکھائے مگر کرڑلی کے سامنے اُس کی دال نہ گل سکی ۔ وہ ایک کاری چوٹ کھا کر کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گر پڑا ۔ دوسرا بھائی مقابلہ پر آیا تو اُس کا بھی یہی حشر ہوا ۔ اب ان مخالفوں کو کرڑلی کی طاقت کا کوئی اندازہ ہو چکا تھا ۔ اس لیے سب سے بڑا بھائی مقابلہ پر آیا جو علاقہ بھر میں لٹھیت اور شہ زور مشہور تھا ۔ جانگلی لوگ کھیتی باڑی تو کرتے ہیں مگر دوسرے کے مویشی ہانک لے جانا اور نقب لگانا بھی ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے ۔ ان پانچوں بھائیوں کا علاقہ بھر میں دبدبہ تھا ۔ اور بڑا تو دس بیس کا اکیلا مقابلہ کرتا تھا ۔ کرڑلی نے بہت داؤ پیچ لڑائے مگر ایک بغلی چوٹ وہ نہ سنبھال سکا ۔ لاٹھی لگتے ہی زمین پر گر پڑا ۔ ایک اور لاٹھی سر پر پڑنے والی تھی اور یہ لاٹھی موت کا پیغام تھی ۔ مگر کرڑلی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا ۔ "ذرا ٹھہرو"

مخالف نے وار روک لیا اور وہ سب کرڑلی کے قریب آ گئے ۔ کرڑلی نے نظر گھما کر پانچوں بھائیوں کو اور اُن کے بوڑھے باپ کو دیکھا اور پھر بولا ۔ "تم نے بدلہ لیا ۔ اچھا کیا ۔ لیکن مرتے وقت میری ایک خواہش ہے اور امید ہے کہ تم اُسے پورا کرو گے"

"ہاں کہو"

"میری موت کو چھپانا نہیں ۔ چوپال میں بیٹھ کر باتیں کرنا ۔

اور واقعی باپ بیٹوں نے اس بات کو چھپایا نہیں ۔ انہوں نے چوپال میں یہ بات اکثر سنائی اور میں نے انہیں اپنے کانوں سے سنا کہ کرڑلی نہ بھاگا نہ گڑگڑایا ۔ بلکہ بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا ۔

میں ہیرآنند کو پچھلے پانچ سال سے ناسازگار حالات میں کاروبار میں کامیابی حاصل کرتے دیکھ کر اس کی ہمت اور قوت ارادی کی داد دیا کرتا ہوں جس سے خوش ہو کر وہ مجھے نئی نئی باتیں سنایا کرتا ہے اور اُن میں سے ہر بات کا موضوع یہ ہوتا ہے کہ اُس نے اپنے کاروبار کے سلسلہ میں مخالفوں پر اپنی ہمت اور حوصلے سے کیسے عبور حاصل کیا ۔ اب بھی اُس نے کرڑلی کی بات ختم کرنے کے بعد ایسی ہی نئی بات سنائی اور مسکراتا ہوا چلا گیا ۔ مگر میں دیر تک سوچتا رہا ۔ کہ اصل بات وہی ہے جو میں نے چوپال میں سنی تھی ۔ باقی سب اُس کی شاخیں ہیں اور یہ سوچتے ہی جانے کیوں پستہ قد ہیرآنند مجھے کرڑلی کے مانند طویل اور قدآور نظر آنے لگا ! ۔

انور عظیم

طوفان کے پر

میرے دل پر اس شام، اداسی یوں چھائی جا رہی تھی جیسے کسی گہری جھیل پر شام کا دھندلکا برستا ہے۔
آسمان کا رنگ بے ڈھب تھا۔ ایک طرف دور جھیل کی موجوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں چھوٹی چھوٹی جگمگاتی ہوئی جھینگوں کے پاس زرد اور سرخ مچھلیوں کی طرح تڑپ رہی تھیں، دوسری طرف آکاش کی نیلاہٹ پر کالے اُجلے بادل آہستہ آہستہ بڑھتے آ رہے تھے، عجیب عجیب شکل کے بادل تھے۔ اونٹ کی طرح گردن اونچی کئے، ہاتھی کی طرح چنگھاڑتے اور ریچھوں کی طرح مسکراتے بادل۔ ایک جگہ تو سورج کی کرنوں کی پچکاری ایسا دور باندھ رہی تھی کہ لگتا تھا کمان سے سرخ اور نارنجی رنگ کے تیر نکل کر چاروں طرف آسمان میں تیر رہے ہیں۔
شہر کے بعد لوگوں کے تھکے ہوئے جلوس ادھر سے ادھر گزر رہے تھے لیکن ان سب چہروں سے بے نیاز تھا۔
سورج کی طرح میرا دل بھی ڈوبا جا رہا تھا۔ "اگر میں نے روپے کا انتظام نہیں کیا تو بھائی کا نام اسکول سے کٹ جائے گا۔" اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں میری آنکھوں میں ابھریں اور بجھ گئیں۔ میرا گلا بھینچتا ہوا محسوس ہوا اور آنکھیں بھر آئیں۔ "یہ عورت پڑھتی آ رہی ہے کہ اس کی صبح ہی نہ ہوگی۔" یکایک مجھے پیر تھیوش یاد آیا اور مجھے لگا کہ میرے کٹتے ہوئے دل پر کسی نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ رکھ دیا ہے۔ پرتیوش کی ٹھنڈی مسکراہٹ میری روح میں تیرتی چلی گئی۔
میں اپنی باڑی کی طرف تیز تیز بڑھنے لگا۔ شاید پرتیوش میرا انتظار کر رہا ہو۔ آج اتوار ہے اور وہ پچھلے اتوار کو آیا بھی نہیں تھا۔ وہ آج تو ضرور ضرور آئے گا۔" میرے قدم اور تیز ہو گئے۔
جب میں گھر پہنچا تو بارش شروع ہو گئی تھی اور جیسے ٹھنڈی ٹھنڈی بوندیں کھڑکیوں پر برس رہی تھیں۔ تجارتی دفتر میں ایسی آوازیں ٹائپ رائٹر سے ابھرا کرتی ہیں۔
بارش کی وجہ سے میں مایوس ہو گیا۔ "اب پرتیوش نہیں آئے گا"
میں نے اپنے بھائی گوکل کو بلایا۔ وہ کہیں باہر سے گھس کر آ رہا تھا۔ اس کا بنیان بھیگ کر چپک گیا تھا۔ میں نے اس کی چھوٹی چھوٹی مسکراتی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ اس کے چوڑے چوڑے چمکدار دانت نکل آئے۔ میں نے اس پر رعب جماتے ہوئے پوچھا "گوکل تو اس طرح بھیگتا کیوں پھرتا ہے۔ بیمار کہیں کا۔"
اس نے میری اس بات کے جواب میں اپنے بنیان کو نچوڑنا شروع کر دیا۔ اور پھر اپنے لمبے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "واہ واہ — پرتیوش دا آئے تھے۔ تم کو بہت پوچھ رہے تھے۔ دیدی سے کچھ کہا اور چلے گئے۔"
دیدی نے اس کے سوا اور کچھ نہ بتایا کہ پرتیوش بہت گمبھیر تھا۔ اور مجھ سے ملنے کو بہت بے چین تھا۔
بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ دیدی مجھے باہر جانے سے روک رہی تھی۔ کھانا تیار تھا لیکن میں نے اپنی پریشانی اور پرتیوش سے ملنے کے لئے چل کھڑا ہوا۔ میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ اس لئے سواری پر جانا ناممکن تھا۔ اور [illegible] کی طرف شہر کے باہر ٹرام نہیں جاتی تھی۔ میں لپک کر آگے بڑھتا رہا۔ چالیس منٹ کا راستہ۔۔۔۔۔

بیس پچیس منٹ میں طے ہو گیا۔ درختوں کے پاس پریتوش کی چھوٹی سی باڑی تھی جو اس نے اپنے بازوؤں کی محنت سے بنائی تھی۔ اس باڑی میں ٹین کی چادروں اور نئے قسم کے کھپروں سے چھپر تیار کیا گیا تھا۔ اس میں دو چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تھیں اور ایک اس سے بھی چھوٹا باورچی خانہ۔ اندر سے لالٹین کی روشنی نظر آ رہی تھی۔

"پتہ نہیں پریتوش ہو گا بھی یا نہیں۔ مگر چلو اسی سے کچھ تو حال معلوم ہو جائے گا۔" میرا دل دھک دھک کر رہا تھا، "کیا بات ہے؟ بات کیا ہے آخر؟"

پرانی چھتری میری حفاظت میں ناکام رہی تھی اور میں کمر تک تو اچھی طرح بھیگ گیا تھا۔

ہوا کے ایک تیز جھونکے سے دروازہ کھل گیا۔ سامنے لالٹین کی مریل سی اور سہمی ہوئی روشنی میں پریتوش بیٹھا کاغذ پر جلدی جلدی کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے بال آگے کو جھکے ہوئے تھے اور وہ اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

میری آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ میں بھیگا ہوا تھا لیکن وہ اچھل کر مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ بڑے جوش میں ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس نے کاغذ کے ورق کو سرسری نظر سے دیکھا اور پھاڑ کر پھینک دیا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے گھور کر دیکھا۔ لیکن وہ دوڑ کر الگنی پر سے ایک سفید کرتا اور دھوتی اٹھا لایا۔ "بدھو کپڑے بدل لو۔ زکام ہوا تو کھانستے پھرو گے اور ایک خوراک دوا نہ مل سکے گی۔"

میں اس انتظار میں تھا کہ وہ کوئی بم اور اچنبھے میں ڈال دینے والی بات کہے گا۔ اور پھر میرے دل میں ایک سنسنی سی دوڑ جائے گی۔ لیکن وہ کمبخت، میرے دل کی ہیجانی کیفیت سے بالکل بے پرواہ، خلاف معمول، ایک ہی فلم کے متعلق بکواس کئے جا رہا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ میں اپنی غربت کی وجہ سے فلم کا کوئی خاص شوق پیدا نہیں کر سکا تھا اور مجھے شبہ ہوا کہ وہ مجھے جلا رہا ہے۔ جب ہی تو سب کچھ جان بوجھ کر وہ ترنگوں، سنگیتوں اور تصویروں کی باتیں کر رہا تھا۔ یہ باتیں مجھے عجیب معلوم ہوئیں جیسے میں ساحل پر کھڑا ہوں اور دور سمندر میں چمکدار روشنیوں کے چھوٹے چھوٹے جزیرے ابھرتے ہیں اور تھوڑی دیر تیر کر رنگ برنگے بلبلوں کی طرح سمندر کے طوفان میں چھپ جاتے ہیں۔

میرا جی چاہا کہ میں اسے بتا دوں کہ اس وقت کیا محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن میں ان پروں کی طرح ہلا کر رہ گیا جو بھیگ جانے کی وجہ سے آہستہ سے سانس لے کر رہ گئے۔

وہ مسکرایا۔ اس کی آنکھیں جھکے ہوئے بالوں کی چھاؤں میں چمک اٹھیں۔ وہ بولا "بور ہو گئے؟ مر بیدار آدمی ہوشیار" اس نے میرے کندھے کو جھنجھوڑ دیا۔ "اچھا بتاؤ گوکل اسکول جا رہا ہے نا؟"

میں جیسے ٹھہرا بیٹھا تھا۔ میں نے اپنے دل کا سارا غم سنا دیا۔ آخر میں میں نے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، "میرا جی چاہتا ہے کبھی کبھی کہ خودکشی کر لوں۔"

"ڈرپوک!" اس نے پوری نفرت سے کہا۔

وہ خاموش رہا۔ کھانا کھاتے وقت بھی خاموش رہا۔ ماسی کی کمر جھک گئی تھی اور وہ ہمیں کھانا دیتے ہوئے کافی فکرمند معلوم ہو رہی تھی۔ لالٹین کی مریل روشنی میں بھی ان کے پتلے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر ایک پراسرار اور دل آویز مسکراہٹ کو دیکھ سکتا تھا۔ میں پریتوش کی خاموشی سے بہت گھبرایا ہوا تھا۔ جب بار بار اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ لیکن وہ سر جھکائے ہوئے کھانا نگل رہا تھا۔ اس کا ماتھے کا سارا رنگ اور گہرا ہو گیا تھا اور وہ اس بات سے بھی بے نیاز تھا کہ بوڑھی ماسی کتنی گہری نظروں سے اسے گھور رہی ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد جب ہم دونوں باہر نکلے تو بارش رک چکی تھی اور آسمان پر بادلوں کے درمیان چاند چمک رہا تھا [illegible]

... سگریٹ ... کبھی کبھی دھواں بھی اڑاتا جاتا ہے۔ اس سے دل کا اندھیرا بھی دھواں بن کر اڑ جاتا ہے" مجھے ڈپلوک
... کے بعد پرتوش نے یہ بات مجھ سے کی تھی۔

"اچھا بتاؤ تمھاری نوکری بچی تو ہو جائے گی نا۔ کوئی گڑبڑ تو نہیں" دھوئیں کا ایک زوردار کش لیتے ہوئے اس نے کہا۔

"ہاں ۔۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ منیجر مجھ سے خوش نہیں"

"منیجر کو مارو گولی۔ ڈٹ کر کام کئے جاؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا"

ہم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے تاریک اور نیم تاریک سڑکوں پر سے گذرتے رہے۔ سڑک پر لوگ تیزی سے چل رہے تھے۔ بارش کا نام و نشان نہیں تھا۔ لیکن کچھ لوگ ابھی تک چھتری لگائے ہوئے تھے۔

"کس قدر فضول خرچ ہیں یہ لوگ ۔۔ ڈرتے ہیں کہیں چاندنی سے بھی بھیگ نہ جائیں۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر وہ مجھے کہاں کھینچے لئے جا رہا ہے۔ اتنی رات گئے لیکن جب گلیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور گندھول کا پانی جوتوں میں گھسنے لگا تو مجھے خیال آیا کہ یہ پر پیچ گلیاں شوبھا کے گھر پر جا کر ختم ہوتی ہیں۔

"دوست میں نے فیصلہ کر لیا ہے" اس نے یکایک کہا اور اس کے بعد کے الفاظ میرے کانوں میں گولیوں کی طرح جھپٹ پڑے

"میں گوا جا رہا ہوں۔"

"گوا ؟" میں لیمپ پوسٹ کے نیچے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ میری سگریٹ بجھ چکی تھی لیکن میں اسے کش لگائے جا رہا تھا

"دیکھو میں اکیلا شوبھا کے یہاں نہیں جانا چاہتا۔ تم بھی چلو۔"

شوبھا کا نام سنتے ہی میری ٹانگیں کانپ گئیں اور میرے دل کو ایک جھٹکا لگا پچھلے کئی مہینے سے میں تارون بابو کے ہاں نہیں گیا اور راستے میں شوبھا کی ایک آدھ جھلک دیکھنے کے سوا میں اس سے ٹھیک طرح ملا بھی نہیں تھا۔ اس سے ملنے کے خیال سے ہی دل ڈوبنے لگا۔ پرتوش نے جھپٹ میرا بازو پکڑ لیا اور ہم اندھیرے نکڑ کی طرف مڑ گئے مگر

ہر طرف ایک دھیمی اور گھٹی ہوئی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس روشنی میں دھواں پھیل رہا تھا۔ اندھیرے زینے پر سے ہوتے ہوئے ہم گیراج کے اوپر والے کمرے کے دروازے پر پہنچے پرتوش نے دستک دی تھی دیر میں دروازہ کھلتا میرے دماغ میں یہ سوال بھی بجلی کی طرح کوند گیا۔ "اچھا پرتوش گوا جانے سے پہلے شوبھا سے ملنے آیا ہے؟" اس کے بعد میرے دل میں جس طرح جلن اٹھی اور پیشانی پر جس طرح پسینے کی ٹھنڈک محسوس ہوئی غالباً اسی کو رقابت کی آگ کہتے ہیں پرتوش نے پڑوسی کی کھڑکی سے آتی ہوئی میلی روشنی میں مجھے مسکرا کر دیکھا۔ کیا میرے دوست کا دل بھی اس کی مسکراہٹ کی طرح صاف ستھرا ہے؟ "لیکن اس سوال کا جواب ملنے سے پہلے تارون بابو نے دروازہ کھول دیا۔ نمسکار کے بعد ہم جب اندر داخل ہوئے تو فرش پر ہارمونیم رکھا نظر آیا۔ ایک تھالی میں چند سفید اور گلاب کے پھول رکھے تھے۔ تارون بابو کی پیشانی پر لکیریں اور زیادہ گہری ہو گئی تھیں اور وہ اس وقت صرف دھوتی پہنے کھڑے تھے اور اپنی انگلی میں چاندی کے چھلے کو گھما رہے تھے۔

انہوں نے مجھے دیکھا اور بڑے زور سے قہقہہ لگایا اور اپنی پاٹ دار آواز میں کہا" تم کو پرتوش نے گرفتار کیا ہوگا۔ آجاؤ قیدی ۔ تم یہاں بیٹھو" میں کھسیانا سا ہو گیا اور ایک مجرم کی طرح بیٹھ گیا۔ میرے پاس ہی پرتوش بھی فرش پر ہارمونیم اور پھولوں کی تھالی کے پاس بیٹھ گیا۔ کمرہ کافی گھٹا ہوا تھا۔ لیکن ایک بڑی بھینی خوشبو کہیں سے اڑ رہی تھی۔ میں نے سوچا" کتنا اچھا ہوا کہ شوبھا یہاں نہیں ہے۔ ابھی ابھی وہ اپنے بابا کو بھجن سنا کر گئی ہوگی۔ اس نے ان پھولوں کو چھوا ہوگا۔ اور اس کی انگلیاں ہارمونیم پر تیزی سے چلی ہوں گی اور ہونٹوں سے پھوٹتے ہوئے نغمے کے ساتھ اس کی آنکھوں کی پتلیاں چوکڑیاں بھر بھر کر تھک گئی ہوں گی...

"ستلے تمہارا دماغ کچھ چل گیا ہے پرتوش؟" تارون بابو کی گمبھیر آواز ایک عقاب کی طرح جھپٹی اور کمرے کی دیواروں

سر کھجاتی رہی۔ ان کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اور پریتوش انہیں حیران اور کھلے ہوئے منہ کے ساتھ تکے جا رہا تھا۔ "میرا دماغ ؟"
"تمہارا نہیں تو کیا میرا ؟" پریتوش خاموش رہا۔ انہوں نے حقے کا ایک کش لیا اور پھر خود ہی بولے "عجیب زمانہ ہے۔ چھوکروں کو مرنے کے لئے بھی نئے نئے میتھڈ ایجاد کرنا پڑتے ہیں۔ جیسے پتلون کوٹ کے نئے ڈیزائن ایجاد ہوتے ہیں"

پریتوش سر ہلاتے ہوئے پہلی بار مسکرایا۔ اس مسکراہٹ میں بڑی شرارت اور طراری تھی۔

جب تارون مالوے اپنے پرانے اسکول ماسٹر کے سے انداز میں آنکھیں نکالتے ہوئے ذرا گرم گرم ڈانٹ پلانے کا ارادہ کیا تو پریتوش سہم گیا۔ اور اس نے ان کا دھیان ہٹانے کے لئے کہا "ماں جی کہاں ہیں ؟"

"وہ تو جاڑا بخار سے ابھی ابھی اٹھی ہیں۔ بہت کمزور ہو گئی ہیں"

پریتوش اٹھا اور ان کو دیکھنے کے بہانے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اب تارون مالوے اپنی عینک آنکھیں میچتے ہوئے اپنا رخ میری طرف رجوع کیا۔

"تم سمجھدار ہو۔ برا بھلا سمجھتے ہو۔ اس پگلے کو سمجھاتے کیوں نہیں ؟"

"آپ تو جانتے ہیں وہ کسی کی سنتا نہیں۔ جو من میں سما گئی سما گئی۔"

"سما گئی ـــ ہونہہ" انہوں نے ٹھنڈی چلم کو زبردستی کریدتے ہوئے اپنے نقلی دانتوں کو اپنی زبان کی مدد سے ایک دو بار ہلایا اور اپنے سفیدی مائل سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "آخر ہم بھی تو نوجوان تھے۔ مگر یوں کتے کی موت مرنے کا شوق نہیں تھا"

جانے نہیں کیوں میرا دل غصے سے بھر گیا۔ "اس میں کتے کی طرح مرنے کی کیا بات ہے۔ کیا آپ کے زمانے میں لوگ انگریزوں کی گولیوں سے نہیں مرتے تھے"

"مرتے تھے، ضرور مرتے تھے، مرتے بھی کیوں نہیں" تارون مالونے ہارمونیم کی پٹریوں پر انگلیاں دوڑاتے ہوئے کہا۔ "تب اور بات تھی۔ ہم غلام تھے"

"لیکن اگر ہمارے کچھ بھائی غلامی کی زنجیروں میں ابھی جکڑے ہوئے ہوں تو ان کی زنجیروں کو توڑنے میں ..."

"بکواس !" انہوں نے اپنی انگلی کو ہوا میں نچاتے ہوئے بڑی بے رحمی سے کہا۔ "تم پر بھی اسی کا جادو چلتا ہے۔ آج کے نوجوان اتنے بیوقوف اور پاگل کیوں ہوتے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا ماں باپ اسی لئے پالتے ہیں کہ ..."

میرے کان جل اٹھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تارون مالوے سے الجھوں جو ایک پرانے پنشن یافتہ اسکول ماسٹر تھے اور جن سے میرے تعلقات طالب علمی کے زمانے سے تھے لیکن اس وقت ان کی ضدی قسم کی بات چیت نے میرے اندر بھی ضد کی آگ کو بھڑکا دیا۔ میں اڑ گیا۔

"تارون مالو آپ بیکار چلاتے ہیں۔ پریتوش کیا ہر نوجوان کو اپنے خون سے زیادہ اپنی دھرتی کو پیار کرنا چاہئے" میں نے یہ بات بالکل کتابی سبق کے انداز میں کہی۔

"بکواس ـــ" انہوں نے ایک بار پھر اپنی چلم کو کرید کر زندگی کی چنگاریوں کی تلاش شروع کر دی۔ "میں نے تمہیں ڈنڈے مار مار کر پڑھایا ہے۔ تمہیں سوجھ بوجھ دی ہے اور اب تم مجھے سکھانے چلے ہو۔ ہونہہ حد ہو گئی" حسب معمول جذبات میں ان کے منہ سے تھوک کی پھلجھڑیاں چھٹنے لگیں۔ میں سامنے سے ہٹ گیا۔

"تم جانتے ہو کوئی بھی اپنی مٹی کا چمن ایسے آدمی سے نہیں بندھ سکتا جو اپنا سر ہتھیلی پر لئے ہوئے پھرتا ہو۔ ایسا چراغ جو صرف آندھی کا منہ چڑانے کو جلتا ہو، اندھیرے گھر میں اجالا نہیں کر سکتا۔"

میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ تارون مالونے پریتوش کی نہیں بلکہ میری ذلیل بے عزتی کی ہے۔ آخر ایک سرکاری اسکول کے وفادار اور پنشن یافتہ ماسٹر جو ٹھہرے۔ کتنے بوڑھے اور قدامت پرست۔ ان کے دماغ میں عجیب عجیب

تم کے کالے بتوں کا بازار سا لگا رہتا تھا۔ لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں چپ رہا۔

"پرتیوش اور شوبھا کا رشتہ بڑا نازک ہے ــــ میں اور آپ ــــ" میں نے دبی زبان سے کہا لیکن انہوں نے میری بات کاٹ دی۔

"میں پرتیوش کو چاہتا ہوں۔ اچھا لڑکا ہے۔ میں ذرا جہیز بھی نہیں دے سکتا۔ اس لڑکے کو جہیز نہیں تو بھا جائیے۔ یہ بھی میں جانتا ہوں۔ پھر بھی اگر وہ میری بات نہیں مانتا تو میں شوبھا کو ــــ میں کہتا ہوں اگر میں تم سے ہی کہوں تو کیا تم ــــ" انہوں نے اپنی بات پوری نہیں کی۔ اور مجھے شبہ کی نظروں سے گھورنے لگے۔

ٹھیک اس وقت دوسرے کمرے کا دروازہ آپ ہی آپ ذرا سا کھل گیا اور دراڑ سے مجھے شوبھا کا گندمی پیارا چہرہ نظر آیا۔ اس کے تیکھے نقوش پر ایک حیران سی گمبھیرتا پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے گال اس کی ہتھیلیوں میں تھے اور بادام سی آنکھیں پرتیوش کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے۔ جب وہ کسی گہرے خیال میں ہوتی تو اس کی آنکھوں میں بھی حیرانی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آتی تھی۔ ہونٹوں پر آگ اور دل میں دھواں!

میرا جی چاہا کہ شوبھا کو پکار کر اپنے پاس بلالوں۔ پھر میں اپنے اس خیال پر بڑا جھنجھلایا۔ اس طرح سوچنے کا کیا تک ہے۔

"دیکھئے میں تو سمجھتا ہوں کہ پرتیوش کو ضرور جانا چاہئے" یہ بات غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گئی اور میں سوچ رہا تھا "یہ بڈھا ماسٹر مجھے پرتیوش کا رقیب سمجھتا ہے"

انہوں نے چھوٹتے ہی کہا "ہاں تاکہ تمہارا راستہ صاف ہو۔"

"جی نہیں ــــ آپ شاید نہیں جانتے کہ میں پرتیوش کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

میں نے بے ساختہ کہا اور جب تارون بابو کا منہ اتر گیا، آنکھیں جھک گئیں اور منہ سے حقے کی نے چھوٹ کر فرش پر لیٹ گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میں نے سا سوچ سمجھے کیا کہہ دیا تھا۔

تارون بابو بڑبڑائے "تم دونوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں نے تمہاری بھلائی کے لئے کہا تھا ــ میں بوڑھا ہوں۔ اپنے بڑے بوڑھوں کے بارے میں سوچو۔ کوئی بھی مالی اپنے خون پسینے سے لگائے ہوئے پھولوں کو آگ میں جھونکنا نہیں چاہتا"

دروازہ کھلا اور پرتیوش تیزی سے باہر والے کمرے میں آگیا۔

تارون بابو نے بہت روکا لیکن ہم وہاں سے نکل آئے۔ آدھی رات ہونے کو آئی۔ اور کون جانے کب بادل موسلا دھار برسنے لگیں"

"جانتے ہو شوبھا نے خوشی خوشی اجازت دے دی۔"

پرتیوش بہت خوش تھا۔

"اچھا سنو آج اکٹھے تین تین ٹیوشن سے مجھے روپے مل گئے۔ اور ایک کتاب کے گرد پوش کا ڈیزائن بھی آج ہی بک گیا۔ قیمت اچھی ملی۔ ایک کام کرو" اس نے اپنے کرتے کی جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر میرے ہاتھ میں پکڑا دیا "گوکل کا نام اسکول سے نہیں کٹنا چاہئے۔"

میں نے جب لینے سے انکار کیا تو اس نے جھٹ ڈپٹ کر کہا "میں کوئی احسان نہیں کر رہا ہوں۔ تمہارا قرض تھا

سوچ رہا ہوں ۔ ،،

میں چپ ہو گیا۔ ایسے موقع پر میں پرتوش سے بحث نہیں کر سکتا تھا۔ اور اس کا فائدہ کیا تھا۔ جیت ہمیشہ اس کی ہوتی ہے
چلتے چلتے اس نے کہا " اب میں گوا سے واپس آکر لوٹوں گا۔ شوبھا بیاہ کے لئے تیار ہے ۔ "

میرا دل دھک سے ہو گیا۔ رات اندھیری تھی اور پرتوش کی ہنسی میں تحلیل ہو رہا تھا۔

میں دیر تک فرش پر کروٹیں بدلتا رہا۔ کچھ تو کھٹمل خون چوس رہے تھے۔ اور کچھ آنکھوں سے نیند بھی بھاگ گئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور دماغ بول رہا تھا۔

" شوبھا اور پرتوش کا بیاہ ہو جائے گا۔ اور اگر پرتگالیوں کی گولی پرتوش کے کانوں میں سما یا ہوا جسم آہستہ آہستہ سانس لیتا ہوا ابھرا ،، نہیں نہیں ۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ،، اس وہم نے خود مجھے اپنا دشمن بنا دیا۔ میں اٹھ بیٹھا کہیں کتے رو رہے تھے اور دور کہیں سے جھانجھ کے بجنے کی آواز آ رہی تھی۔

جب شروع شروع میں مشرقی پاکستان سے سینکڑوں کی تعداد میں لوگ کلکتے آ رہے تھے ایک دن پرتوش سے میری ملاقات اچانک ایک بڑی سی فرم میں ہو گئی تھی جہاں ہم دونوں نوکری کے سہارے کے لئے گئے تھے۔

پرتوش کی بھیگی بھیگی سی قہقہہ ریز آنکھیں اتنی سچی تھیں، اتنی روشن کہ میں اپنی مدہاتی گھٹن کے باوجود پہلی ملاقات میں اس کا دوست ہو گیا۔ اس کی باتیں بے جھجھک اور بڑی ہمدردانہ تھیں۔

" دیکھو بات صاف ہے یہاں اتنے امیدوار۔ اور جگہیں صرف تین ہیں ہم سب تو لئے نہیں جا سکتے۔ زیادہ لوگوں کو مایوس ہونا پڑے گا اور ہم زیادہ لوگوں میں ہوں گے ،،

رفتہ رفتہ پرتوش نے مجھ اس اندھیرے خول سے نکال لیا جس میں زندگی کی الجھنوں اور ناکامیوں نے مجھے اسیر کر لیا تھا۔

میرے ساتھ ہی وہ تاروں ماں کے یہاں آنے جانے لگا۔ وہ میری طرح کبھی ہمت نہ ہارتا۔ ہمیشہ قہقہہ لگا کر مایوسی کا غبار نکال دیتا۔ اس نے طرح طرح کے کام کئے وہ دن بھر میں چار یا پانچ جگہ ٹیوشن کرتا۔ شام تک اس کی جیب میں ٹراموں کے ٹکٹ جمع ہو جاتے۔ رات کو سونے سے پہلے وہ کبھی گیت لکھتا، کبھی اخبار کے لئے کوئی مضمون لکھتا۔ کبھی صرف موٹی موٹی کتابیں پڑھتا ہوا امید کی آغوش میں چلا جاتا۔ اور جب میں بھی اس کے گھر موجود ہوتا تو وہ اپنی ماسی کو چھیڑتا، ان سے پرانے زمانے کی کہانیاں سنتا۔ اور میری طرف مغرور آنکھوں سے دیکھتا، ہنستا، آنکھ مارتا اور کہتا " اچھا بتاؤ میری ماسی سے زیادہ سندر ماسی اور کس کی ہوگی ؟ ،،

میں فوراً ہی میں سر ہلا دیتا۔

اور ماسی ناراضگی کا نور سا کر اپنی مسکراہٹ کو ہونٹوں میں دبائے ہوئے اور آنچل میں بندھے ہوئے کنجیوں کے گچھے کو کندھے کے پیچھے پھینکتے ہوئے ہمارے پاس سے چلی جاتی۔ اور پکار کر کہتیں ،، بیٹے اپنے چہیتے کو روک لینا۔ میں نے اس کے لئے بھی بھات پکایا ہے ،،

ہم ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے تھے۔ لیکن پرتوش میرا سہارا زیادہ تھا۔ ان ہی دنوں مجھے ایک دھکا لگا۔ ایک دن پرتوش بہت خوش خوش آیا " تمہارا خیال ہے کہ شوبھا بھی مجھ سے خوش ہے۔ میرا مطلب ہے وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے ،، اتنی سی بات کہنے میں اسے پسینہ آگیا۔ میں خود ایک زمانے سے شوبھا کو خاموشی سے پوجتا آیا تھا۔ لیکن مجھے اپنے اوپر بھروسہ نہیں تھا۔ لیکن اس وقت پرتوش کے اس جوش نے مجھے اس کا شاکی بنا دیا۔ لیکن وہ اسی طرح جوش و خروش سے اپنے دل اور جذبات کی نازک نازک کلیاں کھلاتا رہا۔ پھر ہم نے ایک ساتھ ہی چائے پی۔ بہت دیر کے بعد ...

پھر صرف اتنا کہا " پرتوش تم کتنے خوش نصیب ہو۔ تم پر رشک آتا ہے ،، اس کی مسکراہٹ ختم ہو گئی۔ کچھ سوچتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ سچ سچ بتانا کیا تم بھی شوبھا کو چاہتے ہو۔،، میں نے تیزی اور تندی سے کہا " نہیں۔ پاگل۔ بیوقوف۔،، پھر وہ میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر دیر تک دٹ مال کے میدان میں ٹہلتا رہا۔ " سوبھا کی پڑھائی ختم ہونے کے بعد ہی بیاہ ٹھیک رہے گا ، . کتنا اچھا ہو تمہارا بھی بیاہ ہو جائے . . اور ہم کہیں اکھٹے رہیں ،، وہ پوری شام شوبھا ہی کی بات کرتا رہا۔ جدا ہونے ہوئے اس نے زور سے میرا ہاتھ دبایا اور میں نے اونچے مینار پر نظریں گاڑے ہوئے دوبارہ کہا " تم بڑے خوش نصیب ہو۔ تم پر رشک آتا ہے ۔،، اب کے اس نے زور سے قہقہہ بلند کیا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے چلتی ٹرام میں غائب ہو گیا۔

اس رات میں سونے کی کوشش کر رہا تھا اور سب تمام باتیں یاد آ رہی تھیں — اور پھر دروازے کی دراز سے شوبھا کا چہرہ نظر آیا۔ ہتھیلیوں پر رکھا ہوا، آنکھوں میں اداسی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ میں اپنی آنکھیں کھول دیتا اور دور سے اونچی اونچی عمارتوں کی کھڑکیاں ہوا میں معلق سنہرے آئینوں کی طرح چمکتی نظر آئیں۔

چند ہی دن قبل پرتوش مجھے اپنے ایک ساتھی کو دیکھنے لے گیا تھا — اس کا تصور اس وقت یوں ابھرا کہ میں تقریباً چیخ پڑا۔ اس کے چہرے پر گہری خراش تھی۔ جیسے چاقو سے خون کی نہریں کھودنے کی کوشش کی گئی ہو۔ اس کے ہونٹ سوجے ہوئے تھے۔ اور انگلیوں سے ناخن کھینچے ہوئے تھے۔ اس کے زخم پڑ گئے تھے اور آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا اور گویا — گویا جھنڈا — خون — سورج —،، ان باتوں کے ساتھ اس کی مٹھی بھینچ جاتی تھی۔

میرا خون کھولنے لگا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ اندھیرا پگھلنے لگا تھا۔ اور کارخانوں کی طرف جاتے ہوئے مزدوروں کے زور سے بات کرنے کی آواز آ رہی تھی —،،

کارخانے کا منافع ہمارا خون پسینہ ہے آج تھو ،،

میں نے طے کر لیا صبح ہی صبح دیدی اور گوکل کو اپنا فیصلہ سنا دوں گا۔ دیدی رو دیں گی۔ لیکن میں انہیں منا لوں گا۔ . .،،

۲

انجن زور سے سانس لے رہا ہے۔ دوستوں نے ہمارے گلے میں ہار ڈال دیئے ہیں سب مسکرا رہے ہیں۔ ہاتھ دبا رہے ہیں اور جیسے لگا رہے ہیں مجھے ایسا لگتا ہے کہ لاکھوں کا۔ ماؤ کھڑ بصب نہ ہو گا۔ ہم یہ بیتے پھر نہ سن سکیں گے۔ دل دھڑک رہا ہے۔ میں اس کی آواز سن سکتا ہوں۔ ہونٹ خشک ہو رہے ہیں۔ کیا ان پر پپڑیاں جم رہی ہیں۔ لیکن پرتوش کے ہونٹ پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی نے ناک شگفتگی پر تھکن کی وادی گر رہی ہیں۔ اس کے سفید دانت چمک رہے ہیں۔ اور وہ اپنی آنکھیں پھیلا کر پلیٹ فارم کے دوسرے سرے پر دیکھتا ہے کہ اسے کسی کا انتظار ہے۔ دھوپ کتنی مسرت سے اترا چلا جا رہا ہے۔ انجن کے منہ کا دھواں کالا تھا اور گاڑھا، کالا اور کالا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ چند ہی لمحوں کی چلمن بیچ میں ہے پھر یہ گاڑی ہمیں اس عظیم الشان، گونجتے دھڑکتے شہر کی گود سے چھین لے گی۔ دیدی اس وقت رو رہی ہوں گی۔ گوکل اسکول چلا گیا ہو گا۔ اچھا کیا میں نے اسے پرتوش کے دیئے ہوئے روپے دے دیئے۔ اتنا چھوٹا ہے لیکن سمجھدار ہے گوکل۔ پرتوش کی ماسی کی آنکھیں جو آنسوؤں کو اپنے اندر دبائے تڑپ رہی تھیں اب چھلک گئی ہوں گی اور ان کے سفید آنچل سے بندھا ہوا کنجیوں کا آنچل کے ساتھ زمین پر پڑا ہو گا۔ پرتوش کی آنکھیں کیوں چمک اٹھیں اور اس کے ہونٹ اس طرح کیوں [illegible]

[illegible]

اور میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ پرتیوش چلتی ہوئی گاڑی میں اچھل کر اندر آگیا ہے۔ وہ اب بھی اپنا دھڑ باہر نکال کر جھانک رہا ہے۔ میں بھی جھانکتا ہوں۔ شوبھا آہستہ آہستہ اپنا آنچل ہوا میں لہرا رہی ہے اس کا گندمی چہرہ کتنا دمک رہا ہے کتنے ہاتھ ہوا میں اٹھ گئے ہیں آنچل، رومال، ہاتھ ــــ کتنی گاڑیاں، کتنی عمارتیں ــــ اور بھاگتے ہوئے پیڑوں اور کھمبوں سے آگے اونچی اونچی دیواروں اور کھیتوں کے اوپر گردن اٹھائے ہوئے چمنیوں کا تیرتا ہوا دھواں۔ لیکن اس دھوئیں میں اب بھی شوبھا کے دمکتے ہوئے چہرے کو دیکھ سکتا ہوں جس کے بالائی ہونٹ کے اوپر پسینے کے موتی چمک رہے ہیں۔ آنچل اڑ رہا ہے ــــ لیکن دھواں ہے کہ اس کے بالوں کی طرح لہراتا ہی چلا آرہا ہے۔

"شوبھا تمہارے لئے بھی پھول لائی تھی"، پرتیوش کے بال بکھر گئے ہیں۔ میں اس کے ہاتھ سے پھول لے لیتا ہوں یہ پھول کتنے کومل اور نرم ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پھول اوس میں نہیں بلکہ آنسوؤں میں بھیگے ہوئے ہیں۔ اور ان کی خوشبو شوبھا کے سانس کا رس چرالائی ہے لیکن میں بھی عجیب دیوانہ ہوں۔ میرے ساتھی زور شور سے گپ کر رہے ہیں پرتیوش ان کی باتیں سنا رہا ہے اور سستی پھیپھسی سگریٹ کے کش اڑا رہا ہے۔ ہوا بہت تند ہے۔ ہمارے جذبات ان جھونکوں سے بھی زیادہ تند ہیں۔ اگر میں اسی طرح سوچتا رہا تو میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہنس بول سکوں گا۔ میں ایک اجنبی بن جاؤں گا دور افق پر شفق کے انگنت پھول دھیمی ہوتی ہوئی زرد روشنی کے دریا میں بہہ رہے ہیں۔ جل تھل کھیتوں میں سیال آگ سانس لے رہی ہے۔ کسان اپنے کندھوں پر ڈنڈا رکھے۔ ہاتھ ہلا ہلا کر کوئی گیت گا رہے ہیں۔ شاید کہہ رہے ہیں۔

دھرتی ــــ تیرے سینے سے ابلنے والا سونا
ہمارے خون پسینے کا جادو ہے۔

سورج کا تارہ لہو افق پر پھیل گیا ہے۔ رات آنے والی ہے رات آگئی ہے۔ لوگ اونگھ رہے ہیں۔ بھیڑ بہت زیادہ ہے اور ہر شخص سونے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن میرے چند ساتھی تاش کھیل رہے ہیں۔ ایک ساتھی ابھی حسن کی میں پینگ رہی ہیں اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے، پلک جھپکائے بغیر، باہر اندھیری رات کی وسعتوں میں اپنے سپنوں کو تلاش کر رہا ہے۔ وہ مسکراتا ہے اور اپنے ہونٹ بھینچ لیتا ہے۔ شاید وہ پہلی مرتبہ اتنے لمبے سفر پر جا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں آنے والے کل کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ تب ہی وہ اتنا پھیل گئی ہیں۔ پرتیوش نے اپنی کتاب ــ اور آنکھیں بند کر لی ہیں۔ وہ گا رہا ہے۔ اس کی روح کی آواز میں سن رہا ہوں۔

تم انتظار کر رہی ہو۔
اور مجھے طوفان کے پر الٹی سمت میں اٹھائے جا رہے ہیں۔
تم ہجر کی آگ میں جل رہی ہو۔
لیکن جلد ہی میرے سانس کی شبنم
تمہارے جلتے ہوئے ہونٹوں کو نم کر دے گی۔

چاند کا رنگ پھیکا ہو گیا ہے اندھیرا مٹ رہا ہے۔ گاڑی کے ڈبے میں زندگی نے ایک ہنگامہ پیدا کر دیا ہے کوئی کھانس رہا ہے کوئی سورج کے سامنے سر جھکائے ہوئے آنکھیں بند کئے آہستہ آہستہ ہونٹ ہلا رہا ہے۔ میرے ساتھی کھڑکیوں سے باہر جھانک رہے ہیں۔ کھیت، جنگل، چشمے، گاؤں، مویشی، دیہاتی عورتیں، گھونگھٹ نکالے، گاگر پر ... سب ہوا کے زوردار جھونکوں میں اڑتے چلے جا رہے ہیں۔ دن اسی طرح گذرتا ہے۔ اسی طرح افق پر ... پھر پھیلتا ہے جنگل سائیں سائیں کرنے لگتے ہیں اور یہ ہوا وہ ہوا نہیں جو ہر بار گذرتے ہوئے ... رات ...

صبا :

ں کا رنگ بھی سردی کے سبب ، سرخ سے سبزا ہوتا جاتا ہے۔ ریت اڑتی ہے اور اندھیرے میں چھپ جاتی ہے۔
تی تاش کھیل کھیل کر تھک چکے ہیں۔ کتابیں اور رسالے ختم ہو چکے ہیں گیتوں اور لطیفوں کا خزانہ بھی خالی ہو چکا ہے
اکر لوگوں نے اپنی آواز بٹھالی ہے میرے سینے میں ایک درد اٹھتا ہے میں اپنے ہم سفر ساتھیوں کی طرف دیکھتا ہوں
ب خاموش ہیں اور ان کے چہرے بھی جھلس گئے ہیں اسی درد کی جو میرے سینے میں آگ لگا رہا ہے۔ یہ درد ہے
ہ پرایوں سے دوری کا۔ اپنے شہر اور گاؤں سے بچھڑنے کا، اپنے رشتوں اور محلوں سے دور ہوتے چلے
ے کا۔ اب ہماری تعداد بڑھ گئی۔ اور کئی اسٹیشنوں پر سے لوگ ہمارے ساتھ آ گئے ہیں۔ اور انہیں کسی ان دیکھی طاقت
ہمارا گہرا دوست بنا دیا ہے ان دوستوں میں بڑا جوش ہے، بڑی طاقت ہے بڑی آگ ہے۔ یہ سب ہر لمحہ اپنی سوت
ر دھرتی کی آواز کی طرف کھنچ رہے ہیں۔ خون دے کر جو چیز حاصل کی ہے بڑی قیمتی ہوتی ہے اس قیمتی چیز کے تصور سے
ان کے چہرے دمک اٹھتے ہیں۔ لیکن وہ تھک چکے ہیں۔ سفر نے نڈھال کر دیا ہے۔ ان کے کپڑے سیاہ ہو چکے ہیں
ن رات ان کپڑوں سے بھی زیادہ سیاہ ہے۔

ہم اسٹیشن بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے اس چھوٹے سے گاؤں میں ٹھیر گئے ہیں۔ اندھیرے کو
ن چار چراغ داغدار بنا رہے ہیں۔ ہمارے آس پاس بچے، عورتیں اور مرد جمع ہو گئے ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں ان میں کوئی
ی چہرہ نہیں نہ ان میں کوئی عمرہ دلشگفتہ ادا ہے۔ کالے کالے لوگ، جوان اور بوڑھی عورتیں اور دبلے پتلے چھوٹے چھوٹے
پران بچے ، ننگے ، اور قریب آتے ہوئے اور دور جاتے ہوئے سے، ہم یہ دھو رہے ہیں، بیار رہے ہیں۔ تھکن آہستہ آہستہ
چھلکے کی طرح اتر رہی ہے اور اب ہم قہقہے لگا رہے ہیں بحثیں کر رہے ہیں، کچھ لوگ ایک جگہ اس طرح بیٹھ گئے ہیں جیسے ان کا
سفر ختم ہو گیا ہو۔ ان میں ایک نوجوان کی داڑھی اور گھنی پلکوں اور بھاری پگڑی کے بیچ دو سحر انگیز آنکھیں چمک رہی ہیں۔
وہ پانچ دریاؤں کے دیس سے آیا ہے، ان پانچ شہر رنگوں کی دھرتی سے جن کو چاقو سے کاٹا نہ جا سکا۔ وہ بہت اچھا گاتا
ہے۔ میں اس کی زبان سمجھ نہیں سکتا۔ لیکن جب وہ جلیانوالہ باغ کا نام لیتا ہے تو میرے کانوں میں گولیوں کی بوچھاڑ کی آواز اٹھنے
لگتی ہے اور لگتا ہوں ہیں خون کے پانچ دریا، جن میں میرا سر کٹے اور مرا احساس کا عشق بہہ رہا ہے، امڈ آتے ہیں اور بڑی
بڑی سیاہ چٹانوں کو بہالے جاتے ہیں۔ میرے دل میں ایک عجیب قسم کی گرمی پیدا ہوتی ہے ایسی گرمی پہلے تو کبھی پیدا نہیں
ہوئی تھی۔ میں ٹائٹانیڈ کا تھکا رہوا کہاں سے بھی ہیں۔ کیا جلیانوالے باغ کے شہیدوں کے دل میں بھی ایسی ہی گرمی پیدا ہوئی تھی؟

" ایک آدمی ! '' بہتوس کا ہاتھ میرے کندھے پر تھم گیا ہے جس طرح تھکا ہوا پرندہ طوفانی جھونکوں میں اڑتی ہوئی شاخ
پر بیٹھ جاتا ہے، '' دیکھتے ہو ستارے۔ اب ہمیں کوسوں پیدل چلنا ہوگا۔ یہاں سے کوئی سواری نہیں ملے گی۔ رکاوٹ
رکاوٹ ، رکاوٹ ''

" یہ تو بہت برا ہوا '' میں کھڑا ہو گیا۔
" برا ہوا تو ہونے دو ۔ ہم بھی دیکھیں گے چڑھتے دریا کو یہ تنکے کیسے روک سکتے ہیں؟ ''

رات اندھیری ہے آسمان میں ستاروں کا غبار جھلملا رہا ہے۔ جنگل کے درختوں میں ہوا چیخ رہی ہے۔ مٹی کی سوندھی
مٹی سے فضا بسی ہوئی ہے۔ بھیگے ہوئے درخت تالاب سے نہا کر نکلتی ہوئی عورتوں کے بال کی طرح چمک رہے ہیں، جھڑ تلے
[illegible] اجالیاں ، سب ہمارے منہ چڑھتے ہیں اور آگے بڑھتے ہوئے قافلے کو حیرت بھری نظروں سے گھورتے رہتے ہیں
یہ کتنا عجیب قافلہ ہے اور اس میں کیسے کیسے لوگ ہیں دھوتی کرتے ہیں، شلوار اور قمیص ہیں، پتلون اور بش شرٹ
[illegible] ٹولیاں بن گئی ہیں۔ ان ٹولیوں میں زور زور سے گیت گانا جاری ہے۔ بعض ٹولیاں گیت گا رہی

بتے اور گیت دلدل پر سے یوں گذر رہے ہیں جیسے پیپر میں سے چھری کی دھار۔

میں نے پریتوش کا ہاتھ پکڑ لیا ہے وہ ایسا بڑا سا تھیلا کندھے پر رکھتے ہوئے ہے اور میں دیکھ رہا ہوں۔ بہت رستے وہ اسی طرح چلا آ رہا ہے یعنی اس کا شانہ دکھ رہا ہوگا۔ خود میرا ہاتھ دکھ رہا ہے میں اپنی گٹھری دوسرے ہاتھ لینا چاہتا ہوں۔ لیکن دوسرا ہاتھ پریتوش کے ہاتھ میں ہے اس کا ہاتھ بہت گرم اور مضبوط ہے آگے پیچھے، شانہ سا نہ سائے گر رہے ہیں۔ بولتے اور ہنستے ہوئے لوگ اور پریتوش خاموش ہے اور سوچ رہا ہے۔ کیا سوچ رہا ہے؟ تھا ــــ مایوسی ــــ کل ــــ! میں یہ ہی باتیں سن رہا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ چند صالوں کا قافلہ ہے جو سقراط کی طرح موت کا جام پینے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ اس قافلے میں تو سارا ہندوستان چل رہا ہے۔ گیت گاتا ہوا یار اور قربانی کی کہانی سنا رہا ہوا۔

منزل دور تھی اور رات اندھیری ستاروں کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ لیکن رہیں کے ستارے اسی طرح گیت گاتے ہوئے دلدل اور جنگل سے گذر رہے ہے۔ اور لو یہ گاؤں بھی آ گیا۔ ہماری منزل آ گئی ہے۔

صبح ہونے والی ہے۔ ہوا ایک پراسرار گیت گا رہی ہے۔ اس ہوا میں چنگاریاں سی اڑ رہی ہیں نیند کی سرحد سے ہم آگے نکل آئے ہیں اور ہم اس سرحد کی طرف لوٹ نہیں سکتے۔ ہمارے قدم جب بھی اٹھیں گے آگے کی طرف اٹھیں گے صبح روشنی کے ساتھ ہم اس اندھیری سرحد کو پار کر جائیں گے۔ جہاں اس وقت ہمیں آسیبی سایوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا ہے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ہم بنگال سے سینکڑوں میل دور نکل آئے ہیں لیکن یہ پورا گاؤں بنگال کیسے بن گیا ہے رتیں ہمارے لئے کھانا اور پانی لا رہی ہیں۔ وہ کہتی ہیں منزل کڑے کوسوں دور ہے۔ اور بڑا بھاری طوفان آنے والا ہے ہم دل کے ٹکڑوں کو بھوکا اور پیاسا کیسے جانے دیں۔ ان کی معصوم آنکھوں نے ہمیں اپنی پناہ میں لے لیا ہے تو اب بجھاؤ راغ۔ ہا ہا ہا لیکن یہ چراغ پھونکوں سے بجھنے والے نہیں۔ یہ چراغ گا رہے ہیں اور ناچ رہے ہیں۔ صبح کی پہلی کرن ایک مقدس تہوار کا اجالا لائے گی۔ اس کا خیر مقدم ناچ کر گا کر، اپنی روح کے تمام پھول کھلا کر ہی کیا جا سکتا ہے۔

میرا خون گنگنا رہا ہے اور میں پریتوش سے بات کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ چراغ کی روشنی میں کچھ لکھ رہا ہے۔ اس کے ہونٹ کھلے ہوئے ہیں اور چہرہ کسی اندرونی نشاط سے دمک رہا ہے جیسے دوسرے ہی لمحے میں وہ ساری دنیا کی مسرتوں کو اپنے دل میں چھپا لیگا۔

جب وہ چراغ کی پھڑپھڑاتی لو حد دیکھنے کے لئے سر اٹھاتا ہے تو مجھے دیکھ کر ایک بڑی سریلی سی مسکراہٹ اس کے بند ہوتے ہوئے ہونٹوں میں دب کر رہ جاتی ہے

"چوری پکڑی گئی دوست" میں زور سے قہقہہ لگاتا ہوں۔ اتنا زوردار قہقہہ تو میں نے پہلے نہیں لگایا تھا۔

چراغ بجھ گیا۔ دوستوں نے نہا کر کپڑے بدل لئے۔ اپنے سب سے اچھے کپڑے۔ سات کی تیاری دھوم دھام سے ہو رہی ہے شیو کرنے کے بعد پریتوش کا رنگ اور نکھر گیا ہے "یار تم تو آج دولھے کی طرح خوبصورت نظر آ رہے ہو"

"ہاں کیوں نہیں۔ میری دلہن تو کب کو میرا انتظار ہے اور میں ۔" وہ آہستہ سے ہنستا ہے۔"

لوگ باہر قطار بنا کر جمع ہو گئے ہیں۔ پندرہ اگست کا سورج بہت شوخ ہے درختوں کی ہریالی پر بہار آ گئی ہے ہوا زیر لب گا رہی ہے اور گاؤں کی عورتیں تھالی میں پھول لئے کھڑی ہیں۔ ہم ان کے پاس سے گذر رہے ہیں۔ پریتوش کے بعد میرے ماتھے پر صندل کا تلک لگا دیا گیا ہے۔ اور میں آگے بڑھ رہا ہوں اور ایک بوڑھی عورت کی آواز بار بار ایک چیخ کی طرح میرے دل سے اُبل رہی ہے،، میرے تین بیٹے بدیسیوں کی گولی کھا کر مر چکے ہیں۔ تم کتنی خوش نصیب

میرے بیٹوں کا اتنا بڑا قافلہ قاتلوں کی قبر کھودنے کے لئے آگے بڑھ رہا ہے!

یہ ایک خیال ہے یا تلوار جو اچانک بے نیام ہو گئی ہے۔ ایک سورج کی کرن مجھے آخری بار چوم رہی ہیں؟ کیا درختوں کی چمک پھر نظر آئے گی؟ کیا ہوا کے گیت پھر سن سکوں گا۔ اور یہ عورتیں، یہ عورتیں" پر جوش پلٹ کر مسکرا رہا ہے۔ اس کے لب ہلتے ہیں لیکن میں سن نہیں سکتا۔ میرے کانوں میں ہزاروں پروں کی سنسناہٹ ابھر رہی ہے۔ چند لمحے اور، چند لمحے اور ــــ یہ نعرے اور گیت یہ پرچم اور مٹھیاں سب سرحد پار ہوں گے۔ سرحد پار ایک خاموش گاؤں ہے جس کے پیڑ خاموش ہیں شاید انہی میں کوئی اسکول ہو۔ شاید انہی میں کوئی ڈاک خانہ ہو۔ مجمع کی رگیں تن گئی ہیں۔ آنکھوں میں ایک آہنی عزم چمک رہا ہے۔

قافلہ آگے بڑھ رہا ہے۔ مٹھیاں اور بھی تن گئی ہیں۔ رگیں اور بھی ابھر آئی ہیں۔ اور ہمارے سینے سے گونج کر نکلتی ہوئی گرج کتنی بلند ہو رہی ہے۔ درختوں پر سے چڑیاں اڑ گئی ہیں۔ کبوتروں کا ایک جھنڈ ہمارے سر پر سے گزر گیا ہے۔ اور ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور اب ہر چیز میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹ گئی ہے۔ میں صرف خاکی وردیوں میں کتے کی طرح دم ٹانگوں پر بیٹھے ہوئے پرتگالی سپاہیوں کو دیکھ رہا ہوں۔ ان کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو سور کی طرح سہم کر دیکھتے ہیں اور پھر وہ اچانک پتھر کی طرح سخت ہو جاتے ہیں۔ ہوا اور سنک گئی ہے۔ دھوپ ڈھل کر گرم ہو گئی ہے اور میں اب کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ میری نگاہوں میں ایک نہیں کئی جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ یہی جھنڈے ہیں اور درختوں کے جھنڈ ہیں، جھاڑیاں ہیں اور ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہم گلاب کے دریا میں سے گزر رہے ہیں ــــ ایک چہرہ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ یہ اسی داڑھی اور پگڑی والے نوجوان کا چہرہ ہے جس کی آنکھیں جل رہی ہیں جو اب بھی شاید ہیر رانجھے اور مرزا صاحباں کے عشق کی داستان سنا رہی ہیں۔ نعروں کے بیچ سے ایک گیت ابھرنے لگا ہے۔ کیا یہ گیت "ان دو جلتی ہوئی آنکھوں سے پھوٹ رہا ہے؟

یکایک درختوں میں ایک قہقہہ پھڑپھڑا کر سو گیا۔ دو تین جھنڈے ہوا میں پرندوں کی طرح پر تول کر ذرا جھک سے گئے۔ ٹھیک اس وقت مجھے پرتوس نظر آیا۔ اس نے جھپٹ کر سکھ نوجوان کے ہاتھ سے جھنڈا لے لیا تھا۔ ہم سب زمین پر لیٹ کر رینگ رہے تھے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ اور پھر ایسا معلوم ہوا کہ "ٹڈی دل پکی ہوئی فصل پر ٹوٹ پڑے ہیں" درخت کے پاس پرتگالی سپاہی کرسی پر بیٹھا مشین گن کی لبلبی دبا رہا تھا۔

یہ جنگ ایک گھنٹے سے بھی کم جاری رہی ہے لیکن ایک صدی، کئی صدیاں گزر گئی ہیں۔ زخمیوں اور شہیدوں پر گاؤں کی عورتیں آنسو بہا رہی ہیں۔ اور بچے بوڑھے پھول نچھاور کر رہے ہیں۔

تیز دھوپ سے میری آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہے۔ پرتیوس گھاس پر لیٹا مسکرا رہا ہے اس کا خون میں نہایا ہوا سینہ پھولوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ سفید کنولوں میں سے خون جھانک رہا ہے۔ اس کی آنکھیں نیم وا ہیں۔ اور پیشانی پر خون کے ستارے چمک رہے ہیں۔

میں اس کی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالتا ہوں جو خون میں رنگ گیا ہے اور جس کی تحریر نہیں پڑھی جا سکتی۔ بس اتنا نظر آتا ہے "... صبح بڑی خوبصورت ہے اور میرا دل تمہاری یاد کے رس میں ڈوبا ہوا ہے ... سفر اور انتظار......"

میری آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہے اور اس اندھیرے میں لہو کے چراغ جل رہے ہیں۔ ایک نہیں، دو نہیں [illegible] چراغوں کا یہ کارواں آگے بڑھ رہا ہے۔

۳

پھر میں اسی شہر میں واپس آگیا ہوں۔ اپنے دیار میں وہی دریا موجزن ہے۔ اس کے سینے پر ڈوبتے سورج کی قوس قزح اسی طرح ناچ رہی ہے لوگ گا رہے ہیں۔ اور میں آہستہ آہستہ سنتھالوں کی بستی کی طرف جا رہا ہوں۔ رفتہ رفتہ سارا شہر اندھیرے میں غرق ہو گیا ہے لیکن آج میں کتنا اکیلا ہوں اور میرا دل پھر اداس ہے لیکن اسے اس اداسی میں ایک آگ سی دہک رہی ہے پرتیوش کی کٹیا میں اندھیرا ہے دروازے پر میرے قدم تھم گئے ہیں۔ کٹیا کا دروازہ کھلتا ہے۔ ماسی دروازہ کھولتی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک لالٹین کانپ رہی ہے۔

وہ خاموش کھڑی مجھے دیکھ رہی ہیں۔ ان کے آنچل میں کنجیوں کا گچھا اسی طرح لٹک رہا ہے۔

"بیٹے —" یہ آواز درختوں میں پھنسی ہوئی ہوا کی چیخ تو نہیں۔

میں اخبار کو نہیں کھولتا ہوں۔ یہ موت کی خون میں گندھی ہوئی سرخ قمیص بوڑھے ہاتھوں میں اٹھ رہی ہے۔ ماسی کے ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہے ہیں۔ جیسے خون میں ڈوبی ہوئی قمیص بہت بھاری ہو، جیسے وہ پرتیوش کا جسم ہو اور یہ پرتیوش کی بنائی ہوئی ٹیگور کی ادھوری تصویر ہے لگتا ہے بوڑھے شاعر کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑیں گے۔ اور یہ خط ہے جس سے ادھ کھلے پھولوں کی خوشبو آ رہی ہے۔

"یہ کیا ہے؟"

"سودھا کے نام پرتیوش کا خط"

"ماسی کی آنکھیں چمک اٹھی ہیں۔"

"صبح بڑی خوبصورت ہے   اور میرا دل تمھاری یاد کے رس میں ڈوبا ہوا ہے   . .   سفر . . . . .
اور انتظار   "

اور اب قمیص اور خط کا عکس ماسی کی بوڑھی آنکھوں میں گھل رہا ہے

اور اب ان آنکھوں میں لہو کے چراغ جل رہے ہیں۔ اور جب میں اندھیرے میں پلٹ رہا ہوں تو دور سے اپنے دوست کی آواز آ رہی ہے۔

"تم انتظار کر رہی ہو۔
اور مجھے طوفان کے پرانی سمت میں اٹھائے لئے جا رہے ہیں۔
تم ہجر کی آگ میں جل رہی ہو۔
لیکن جلد ہی میرے پیار کی شبنم
تمھارے جلتے ہوئے ہونٹوں کو نم کر دے گی۔"

اقبال متین

دامِ ہر موج

باورچی خانہ کی چوکھٹ پر کھڑا علی احمد کھانستا رہا۔ اور اس نے بھنی ہوئی بٹری بڑے پیار سے سلمیٰ پر دے ماری جو اس کی بکھری ہوئی لٹوں میں اٹک گئی۔

سرخ مرچیں ہانڈی میں ڈال کر سلمیٰ نے ہانڈی پر ڈھکن ڈھانک دی اور اپنا آنچل منہ میں ٹھونس لیا لیکن اس کے بعد بھی وہ اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ علی احمد برابر کھانستا رہا۔ سلمیٰ نے ڈھکن ہٹا کر دو ایک سرخ مرچیں ہانڈی میں اور ڈال دیں اور اطمینان سے شرابور آنچل منہ سے نکال کر ہنسنے لگی۔ ہانڈی میں چھر چھر کی آوازیں گویا دال کے زور دار بگھار کا پروپیگنڈہ کر رہی تھیں۔ اور اپنی کامیابی پر سلمیٰ قہقہے لگا رہی تھی۔ کیوں کہ علی احمد مسلسل کھانس رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو ابھر رہے تھے۔ علی احمد جب کھانس کھانس کر نڈھال ہو گیا تو ہانڈی کی چھر چھر کی آوازیں ختم ہو گئیں اور سلمیٰ کی بے طرح ہلتی ہوئی باچھیں درآنا سمٹ گئیں اور اب لبوں پر صرف نرم نرم مسکراہٹ باقی رہ گئی۔ علی احمد کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ جست لگا کر باورچی خانہ میں کود پڑا۔ سلمیٰ اٹھی اور ہرن کی طرح تڑپ کر ایک گوشے میں کھڑی ہو گئی۔ اپنے دونوں ہاتھ اس نے آگے کی طرف مزاحمت کے لئے بڑھا دئے اور کھلکھلا کر ہنستی رہی۔ اپنی دانست میں وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ مزاحمت کے لئے آگے بڑھے ہوئے اس کے نازک ہاتھ کسی خونی شیرنی کے پنجے ہیں جنہیں دیکھ کر علی احمد جھجک جائے گا۔ لیکن علی احمد فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھتا گیا اور تڑپ کر صحن کی طرف بھاگی لیکن صحن میں پہنچتے پہنچتے تک اس کی اوڑھنی اس کے سینے پر سے سانپ کی طرح رینگتی ہوئی علی احمد کی مضبوط گرفت میں آ چکی تھی۔ اور اس نے نہایت اطمینان سے اس سانپ کو اپنی گردن میں لپیٹ رکھا تھا۔ سلمیٰ صحن میں تھی۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ اس نے صحن میں ادھر ادھر دیکھا۔ بوڑھی دادی اماں پان کے بیڑے میں لونگ لگانے میں مگن تھیں۔ پھر یکایک اس کی نظریں جھکیں۔ سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے علی احمد اس سے انتقام لے رہا ہے۔ ہانڈی سونی گھر میں خاموش پڑی تھی لیکن وہ ابال وہ اتھل پتھل جو لمحہ بھر پہلے ہانڈی میں مرچیں ڈال کر سلمیٰ نے پیدا کر دی تھی کچھ ایسی ہی کیفیت علی احمد نے اس کے سارے بدن میں پیدا کر دی تھی۔ وہ کچھ زیادہ نہ سوچ سکی اور اس سے پہلے کہ دادی اماں کی نگاہیں پان کے بیڑے سے ہٹ کر اس پر پڑتیں وہ دبے پاؤں پھر باورچی خانے میں پہنچ گئی تھی۔ علی احمد کی مضبوط گرفت میں اس کی ساری ہستی اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے علی احمد اس کے جسم میں سرخ سرخ مرچیں بھر رہا ہے۔ یہاں تک کہ بگھاری ہوئی دال کی ہنڈیا کی طرح وہ بھی بالکل خاموش ہو رہی۔ علی احمد نے اپنی گرفت سے اس کو آزاد کیا تو اس کے گال سرخ ہو رہے تھے۔ سرخ گالوں کو تھپ تھپاتے ہوئے علی احمد نے [illegible] گال پیلا کر کہتی جاؤ۔

[illegible]
کھانسنے لگو"۔

لیکن سلمیٰ نے کہا کہ
"او بالم - روزانہ اسی طرح دال بگھاروں گی کہ تیری کرٹیل جوانی کھانستے کھانستے میری نظروں کے سامنے بوڑھی ہو جائے"۔

سلمیٰ نے یہ باتیں علی احمد کی بینچ کے باہر ہو کر کی تھیں اور وہ اب صحن میں تھی۔ اس کا دوپٹہ اس کے سر اور سینے پر پھیلا ہوا تھا۔ اب کی بار تلخی علی احمد نے باورچی خانے میں کھڑے کھڑے زبان چڑا نے پر ہی اکتفا کیا۔ امرود کے درخت کی ایک پتلی سی ٹہنی کو ہاتھ سے چھو کر سلمیٰ نے علی احمد کو اس طرح دیکھا کہ وہ سمجھ گیا کہ آج کے کا جواب اس کو اس چھڑی سے ملنگا اور آج سلمیٰ ہار جائے تو جیت اسی کی رہیگی۔

آج سلمیٰ بہت خوش تھی۔ ننھی کو ہاف بائلڈ انڈا کھلانے کے بعد اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے کوئی بڑا انعام حاصل کر لیا ہے۔ وٹامن سے بھرپور انڈا اس کی تعریف میں گوالیار پولٹری فارم کے مالک نے سلمیٰ کے سامنے ایک گھنٹہ تقریر کی تھی۔ اس نے حساب جوڑ کر کہا تھا کہ ایک مرغی واقعی ایک سال میں سونے کا ایک انڈا ضرور دیتی ہے۔ اس کے تجربے میں بوڑھیوں کا یہ مقولہ سو فیصد بلکہ ایک سو پانچ فیصد صحیح ثابت ہوا ہے۔ اس نے قفس میں پھرتی ہوئی سفید سفید مرغیوں کو اور بروڈر میں سہمے ہوئے ننھے ننھے چوزوں کو بڑی حسرت سے دیکھا تھا۔ لیکن سونے کا انڈا پیدا کرنے والی یہ ننھی منی چلتی پھرتی خوبصورت مشینیں اس کی دسترس سے باہر تھیں۔ فی الوقت تو اس کو روزانہ صرف ایک انڈا چاہیئے تھا۔ وٹامن سے بھرپور۔ ایک سلیٹ جس پر معقول مالک گوالیار پولٹری فارم اللہ میاں نے اپنے ہاتھ سے "سیل" کیا تھا۔ اونلی وٹامن (ONLY VITAMIN) نو ڈاوٹ فل آف وٹامن — (NO DOUBT FULL OF VITAMIN) صرف دو آنے ہیں۔ لیکن روزانہ صرف دو آنے کا فکر سلمیٰ کے لئے بہت اہم تھا۔

ڈاکٹر نے بڑے پیار سے ننھی کے ملائم گالوں کو چھوتے ہوئے کہا تھا۔ "اس کو کچھ بھی تو بیماری نہیں ہے بس ذرا سی کمزور ہے بے بی۔ مگر بہت جلد پاؤں پاؤں چلنے لگے گی۔ بہت جلد ٹرم ٹرم لگائے گی۔ سردیاں شروع ہو رہی ہیں۔ روزانہ ایک ہاف بائلڈ انڈا دے دیا کرو۔" اور سلمیٰ نے اس طرح سر ہلا کر ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا تھا جیسے انہوں نے ننھی کو میٹھا ٹھنڈا پانی پلانے کے لئے کہا ہے یا پھر انڈے بھی تو نلکی کھول کر بالٹی لگا دینے سے لبالب بالٹی میں بھر جاتے ہیں۔

ننھی کو سینے سے چمٹاتے ہوئے وہ بچوں کے وارڈ کی سیڑھیاں اترنے لگی تو ایک عجیب و غریب خیال اس کے دماغ میں گھس آیا۔ اللہ میاں نے ماں کی دونوں چھاتیوں میں دودھ ہی دودھ بھر دیا ہے۔ ایک طرف انڈے کی زردی اور سفیدی بھر دیتے تو ——— اس نے ننھی کو سینے سے چمٹا لیا تھا۔

راستے بھر سلمیٰ سوچتی رہی۔ روزانہ دو آنے وہ کس مد سے نکال سکتی ہے۔ فوراً اس کو ایک ترکیب سوجھی کہ گھر کے اجالوں کو ننھی پر سے قربان کر دیا جائے۔ یعنی رات کو گھر کی لائٹ بہت کم جلائی جائے اور لائٹ کے بل کا بچت سے ننھی کو انڈے کھلائے جائیں۔ لیکن ننھی اس کو اندھیروں میں رینگتی نظر آئی۔ اور اپنے اس خیال سے گھبرا کر اس نے پھر ننھی کو چوم لیا۔ اس کو ننھی ہی کے لئے تو روشنی کی بھی ضرورت تھی۔ وہ سارے گھر میں دیکھ

پھرتی۔ ننھی ننھی آوازیں نکالتی۔ ہونٹوں سے پھڑ پھڑ کرتی گھر بھر کی چیزیں بجاتی پھرتی۔ سوئچ پر ہاتھ رکھ کر سلمیٰ ننھی کو دیکھا کرتی۔ کھٹکا دباتے ہی سارا ماحول منور ہو جاتا اور ننھی کا چہرہ پورے چاند کی مانند کھل اٹھتا۔ سلمیٰ کو کچھ یوں محسوس ہوتا جیسے یہ ساری روشنیاں اسی ہنستے ہوئے ننھے منے چہرے کی بدولت ہیں ——— منٹ دو منٹ کے لئے فیوز ہی اُڑ جاتا تو ننھی ہنگامہ برپا کر دیتی ——— میاں علی احمد لاکھ سمجھاتے۔ ننھی یہ تیرا بابا ہے سلمیٰ کہتی "ننھی یہ رہی ہیں تیری امی"۔ لیکن ننھی کو اندھیروں سے جیسے نفرت ہے۔ وہ اپنے بابا اور امی کو کسی خاطر میں نہ لاتی۔ اُس کا ایک ہی مطالبہ رہتا۔ رات ہوئی ہے تو بابا اور امی کے ساتھ روشنی بھی چاہیئے لہٰذا سلمیٰ سوچتی رہی۔ لائٹ کے بل سے وہ کچھ بھی پس انداز نہیں کر سکتی۔ ننھی کو اندھیروں سے نفرت ہے۔ ننھی کو اجالوں سے پیار ہے اور اُس نے سوچا کہ ننھی مستقبل کی نقیب ہے تو وہ اجالوں سے پیار کرے گی ہی گھر پہنچتے پہنچتے اُس نے مہینے بھر کے سارے اخراجات کا جائزہ لیا۔ زندگی کی ہر ضرورت نے اپنی اہمیتوں کو اس پر واضح کیا۔ وہ بالکل اسی طرح ہر ضرورت کی منت سماجت کرتی رہی جیسے ساری کی ساری ضرورتیں مجسم ہو کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی ہوں ——— اناج اور غلے کی شہزادی سے اس نے بہت الگ رہ کے کہا کہ بھئی تم کو ملکی سے مہینے بھر کے لئے راضی ہو جاؤ۔ لیکن اس کو بالکل ٹکا سا جواب مل گیا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوا جیسے سفید سفید چاولوں کی قاب، پھولی ہوئی چپاتیوں کی پلیٹ اور بگھاری ہوئی دال کا کٹورا سب کے سب اُس سے گلہ شکوہ کر رہے ہیں کہ بھئی تم نے ہمیں گوشت کی بوٹی بوٹی کے لئے ترسا دیا۔ علی احمد گوشت بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ دسترخوان پہ گوشت ہوتا ہے تو وہ مزے لے لے کر ہمیں سراہتے ہیں۔ لیکن تم نے ہمیں تعریف و توصیف کے قابل ہی نہ رکھا۔ اب تو وہ بیچارے بس اس طرح ہمیں زہر مار کرتے ہیں۔ جیسے یہ کھانے پر انہیں سزا بھگتنی پڑے گی۔ دال کے کٹورے نے بڑھ کر کہا کہ بھئی ہم نے تو تمہارے پاس سوائے سرخ مرچوں کے اور کچھ نہ دیکھا۔ یہ دال ہمیشہ کی دال ہی رہی کبھی دالچہ نہ بن سکی۔ اب ہمارے لئے باقی ہی کیا ہے جو تم اس میں سے بھی بچت کی سوچ رہی ہو۔ سلمیٰ بدقت مسکرا سکی اُس نے ننھی کو پھر چوما۔ ننھی کے سر سے سرکتی ہوئی ننھی سی کیپ کو برابر کرتے ہوئے وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ لیکن اس کا ذہن اس کو اور ننھی کو سڑک پر چھوڑ کر پلک جھپکنے تک گھر کے کمرے کے ایک کونے میں دھرے ہوئے صندوق تک جا پہنچا۔ لیکن یہ صندوق بھی تو آدھے سے زیادہ خالی تھا۔ سلمیٰ کی دو تین ساڑیاں۔ علی احمد کے ایک دو قمیص اور پتلون۔ ان ساڑیوں اور قمیصوں نے جیسے اس کے کان میں آہستہ سے کہا کہ سلمیٰ بی بی تم ہمیں گھر میں بھی تو دھو سکتی ہو ——— دیکھو نا۔ اب ہم میں اتنی سکت ہی کہاں رہ گئی ہے کہ تمہارے دھوبی کے مظالم سہہ سکیں بڑی بے دردی سے وہ ہمیں پتھر پہ پٹک پٹک کر پیٹتا ہے۔ ذرا غور سے دیکھو تو ہمارا کیا حال ہو گیا ہے تم اگر اسی طرح ہمیں گھاٹ گھاٹ کی ہوا کھلواؤ گی تو تمہاری یہ حسرت بھی دل ہی دل میں رہ جائے گی کہ تم کتر بیونت کے ہمیں ننھی کے خوبصورت فراکس میں تبدیل کر سکو۔ بس بھئی آج سے ہم تمہارے نرم ہاتھوں ہی سے اشنان کریں گے اور پھر اس طرح تمہارے ماہانہ چار روپے بھی تو بچ سکتے ہیں ——— بات سلمیٰ کی سمجھ میں آ سکتی تھی۔ وہ کھل کر مسکرائی اور اُس نے طے کر لیا کہ آئندہ ماہ وہ دھوبی کو جواب دے دے گی۔

وہ گھر پہنچی۔ تو ولی محمد لانڈری والا اُس کا منتظر تھا۔ ولی محمد کی دو پیسے کی کوئی لانڈری نہ تھی۔ وہ کپڑے دھو کر خود گھر گھر پہنچاتا پھرتا۔ خود نہ جا سکتا تو اس کی بیوی یہ کام کر دیتی۔ لیکن اپنے نام کے ساتھ اس کو دھوبی کا استعمال گوارا نہ تھا۔ وہ جب بھی کسی کے گھر جاتا تو کہلا بھیجتا کہ ولی محمد لانڈری والا آیا ہے۔ کبھی کبھی زیادہ خوش رہتا تو کہتا ولی محمد

لانڈری والے آتے ہیں ۔ لانڈری میں بھیجنے کی حسرت اس نے دل ہی دل میں بہت زمانہ سے رکھی تھی ۔

سلمیٰ پہنچی تو ولی محمد لانڈری والے نے اس کو جھک کر سلام کیا ۔ ولی محمد کی غیر متوقع آمد پر سلمیٰ سٹپٹا سی گئی جیسے اس کے فیصلے کی اطلاع ولی محمد کو ہوگئی ہو لیکن اس نے فوراً ہی خود کو درست کر کے ولی محمد سے پوچھا تم کس طرح آ نکلے ہو لانڈری والے بیٹھے ۔ آج کپڑے لے جانے کی تاریخ بھی تو نہیں ہے ۔ لیکن ولی محمد بجائے اس کے کچھ جواب دیتا ، ننھی پر نظریں جمائے ہوئے رونے لگا ۔ سلمیٰ نے دلجوئی کرتے ہوئے سبب پوچھا تو اس نے بھر آئی ہوئی آواز میں کہا کہ بی بی میرا بچہ شدید بیمار ہے ۔ دواخانہ میں شریک کر کے گھر گھر پھرتا رہا ۔ ہر جگہ سے مایوس ہو چکا تو آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں ۔ اس بار میری تنخواہ پیشگی دے دیجئے بی بی اور دعا کیجئے کہ میرا لال جلد اچھا ہو جائے" ——

سلمیٰ کی قوت گویائی جیسے سلب ہو چکی تھی ۔ وہ زبان تک نہ کھول سکی ۔ کچھ سنبھل کر آنسو چھپاتے ہوئے اس نے کہا فکر نہ کرو ولی محمد تمہارا بچہ بالکل اچھا ہو جائے گا ۔ اس کے آگے کچھ کہنے کی سلمیٰ میں ہمت نہ تھی ۔ کچھ سوچ کر وہ پچھلے پاؤں واپس لوٹ گئی ۔ پڑوس سے دو روپیے قرض لا کر اس نے ولی محمد کو دے دیئے اور نہایت ہی لجاجت سے کہا ۔ اس سے زیادہ مجھ سے کچھ نہ ہو سکا ولی محمد تم جانتے ہو تنخواہ کے لئے ابھی دو دن باقی ہیں لیکن تم فکر نہ کرنا ۔ وہ آنے ہی میں انتظام کر کے انہیں کے ہاتھ تمہارے گھر بھجوا دوں گی" ۔ ولی محمد نے کچھ اس انداز سے سلمیٰ کو دیکھا کہ وہ اس کی آنکھوں کی زبان صاف پڑھ سکے اور سلمیٰ نے اس کی آنکھوں کے پیام کو سمجھ کر کہا کہ میں تمہیں تمہارا حق ہی تو دے رہی ہوں اس میں شکریہ کیا ، مہربانی کیسی" ۔

ولی محمد جا چکا تو سلمیٰ نے محسوس کیا کہ ننھی کی انڈوں سے بھری ہوئی ٹوکری بھی وہ اپنے ساتھ لے گیا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود سلمیٰ خوش تھی اور اس نے طے کر لیا تھا کہ ولی محمد کی علیحدگی سے بھی کو انڈے مل سکتے ہیں تو پھر ننھی کو انڈے نہیں ملتے لیکن ڈاکٹر نے گویا اس کے دل کے قریب نشتر چبھو کر یاد دلایا کہ ننھی بہت جلد پاؤں پاؤں چل سکتی ہے اس کو صرف ایک انڈا روز کھلا دو ۔

علی احمد گھر آیا تو سلمیٰ نے اس کو کپڑے بدلنے نہ دیئے ۔ ولی محمد کے لئے سلمیٰ کی بے چینی سے علی احمد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ۔ اور اس نے بڑی محبت سے سلمیٰ کے گالوں پر چپت لگاتے ہوئے کہا کہ میں ابھی انتظام کئے دیتا ہوں لیکن تم ان گہری نیلی جھیلوں میں ڈوبنے سے تو مجھے بچالو ۔ سلمیٰ مسکرائی تو علی احمد نے اپنا رومال اس کی چھلکتی ہوئی آنکھوں پر رکھ دیا ——

علی احمد ولی محمد کے پاس چلا گیا تو سلمیٰ نے اطمینان کا سانس لیا ۔ ننھی کو چارپائی پر لٹا کر لوری دیتے ہوئے وہ خالی خالی آنکھوں سے دیوار کو گھورتی رہی ۔ اس کی آواز بڑی میٹھی اور بڑی سریلی تھی ۔ وہ جب کبھی گنگناتی یا ننھی کو لوری دیتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خود گیت بن گئی ہے ۔ وہ اسی طرح گیت بن کر فضاؤں میں تیرتی پھرتی —— سروں کے مد و جزر کے سہارے وہ ماضی حال مستقبل کے سارے فاصلے طے کر لیتی ۔ وہ مست ہو کر گنگناتی رہتی اور اس کی گوری گوری انگلیاں ننھی کے گھنے کالے بالوں میں کنگھی کرتی رہتیں اور اس کے حلق سے نکلتی ہوئی سریلی آواز ماضی کے دھندلکوں میں اجلی اجلی کرنیں بکھیرنے لگتی ۔

میری بٹیا تو نغموں کی جان ہے ۔ اس قدر خوبصورت گلا خوش نصیبوں ہی کا حصہ ہے ۔ میری اچھی بیٹی اچھو بھی اس طرح نہیں شرماتے اچھے بچے —— ہاں ہاں اچھا سا چھوٹا سا بکس لا دیں گے ۔ سبھی سب لا دیں گے لیکن ہمیں اس طرح شرمانے والے بچے پسند نہیں ۔ اب گائے گی ۔ اب گائے گی میری رانی ۔ اچھا بھئی نورجہاں کا بدلہ [illegible]

لگا بھی — تو کو تسی بدلی میں —

بس ایک اور — ایک ہی — اب نہیں سنائیں گے تمہیں — لتا سا — سلمیٰ نغمات کی شہزادی بنی خا
بھر میں دھوم مچاتی رہی — نغموں کے سہارے اُس نے اپنی امی سے اپنی ضدیں منوائیں — چھوٹا سا مکس — نئی نئی
اور یہ ضدیں جاکیٹ کے ڈبوں سے لے کر سیٹ کی شیشیوں تک پوری کی گئیں — دادی اماں اداس ہوتیں
جھٹ بلا بھیجتیں اور سلو کو اپنے پاس بٹھا لیا — کچھ بھی سنا دے میری اماں — بس تو گنگنا دے ذرا اور سلمیٰ نے
دادی اماں کو ماضی کی حسین یادوں کی وادیوں میں پہنچا دیا —

عقیقہ ہو رہا ہے — ممتاز دلہن کے بچے کا لیکن سب کی نظریں تھیں سلمیٰ بٹیا پر — چچی اماں، پھوپھی اماں
ہنس ہنس کی سب پیش سد باں کر رہی ہیں — طرح طرح سے سلو کو رجھا رہی ہیں — اس محفل میں سلو گائے گی
پھر ممتاز کبھی بات نہیں کریں گی اس سے — خوشی کی محفلوں میں گانے سے انکار نہیں کرتے بھئی — بری بات سمجھ
اور سلو کچھ شرما کر کچھ اترا کر گانے لگتی تو سب کے سب اس کو گھیر لیتے —

سلمیٰ جب اپنی ہم عمر سہیلیوں کے جھرمٹ میں ہوتی تو اس کو اپنی اہمیت کا اندازہ ہونے لگتا — کوئی کچھ فرمائش
کچھ فرمائش کرتی کوئی کچھ کہتی — وہ سب کی فرمائشیں یکے بعد دیگرے پوری کرتی — ایسی ہم جولیوں میں بیٹھ کر تا
ہوئے اس کو محسوس ہوتا کہ وہ بڑی گائیک ہو گئی ہے اور واقعی کمال کرتے جھجک گانے کی وجہ سے اس کی آواز
پختگی پیدا ہو جاتی — اپنے سے بڑوں کے آگے وہ اپنے فن کا اس طرح مظاہرہ نہ کر پاتی — جس کا اس کو بعض دفعہ
ہوتا اور وہ گا چکنے کے بعد سوچتی کہ میں نے اتنا اچھا نہیں گایا جتنا اچھا میں گا سکتی ہوں — لیکن اب کی میں بے
گاؤں گی — اُس کی امی کہتیں کہ ہم اس طرح نہیں گا کر سناؤ جس طرح اپنی سہیلیوں میں گاتی ہو تو ہم تمہیں
سنگار دان لا دیں گے بالکل دلہن باجی کے سنگار دان کی طرح —

آخر ایک دن امی کے اصرار پر سلو نے جی کڑا کر کے ایسا گایا کہ دوسرے دن اُس کو سنگار دان لا
ننھی کے سیاہ کالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سلمیٰ گنگنا رہی تھی —

آ جا ری نندیا تو آ کیوں نہ جا —

ننھی کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں اور سلمیٰ کی آنکھوں میں آنسو امڈے رہے تھے — آج وہ اپنے
میں خود جل رہی تھی — بیتے ہوئے سنہری دنوں کی جگمگاتی یادیں اُس کی بھیگی ہوئی آنکھوں کو نمناک بنا رہی تھیں
رہی تھی — اور اس کا ذہن اُس کے بچپن کے سہانے ایام کی تصویر کشی میں مصروف تھا — وہ سوچ رہی تھی
بے فکری کے دن تھے وہ بھی — ہر خوشی حاصل تھی، ہر تمنا کی تکمیل ہو جاتی تھی — ان نغموں کے سہارے اس نے دا
لیا تھا — اس کی آواز کی پختگی نے ساری زندگی کو نغمہ بنا رکھا تھا — کاش میری ننھی بھی ان دنوں ہوتی — پر
میں اپنی آواز سے سب کو مسحور کر سکتی ہوں — خاندان بھر میں آج بھی سب کے دلوں میں میرے لئے اتنا ہی
آج بھی میری امی مجھے چوم چوم لیتی ہیں — آج بھی میرے ابا میری پیشانی پر اُسی طرح بوسہ دیتے ہیں — آج
سب کا پیار حاصل ہے لیکن اس کے باوجود آج زندگی میں کتنی حسرتیں پیدا ہو گئی ہیں — آج میرے ننھے اپنے
سے ان کی چہیتی ننھی کے لئے ایک انڈا بھی تو انعام میں حاصل نہیں کر سکتے — آج میں گاتی ہوں تو امی کے کانوں پر
بجنے لگتا ہے جسے ابا نے بڑے چاؤ سے ساڑھے تین سو روپے میں خریدا تھا — اور جو صرف ستر روپے میں ایک
رہن ہو کر ڈوب گیا — ان ریکارڈوں پر تھرکتی ہوئی سوئیاں جن کو بار بار بجا کر میں گیتوں کی لے سے —

آج خود میرے کلیجہ کو چھیدتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اور پھر کیا کچھ یاد نہیں آتا۔ زندگی کا سارا حسن سارا [illegible] گیا اسی لیے آج خود میرے کان میری اپنی آواز سننے کے لیے تو نہیں ترس رہے ہیں۔

آجا ری نندیا تو آ کیوں نہ آ

ننھی کی خوبصورت آنکھوں میں نندیا چپکے چپکے اس طرح آ گئی جس طرح چاند دبے پاؤں چھوٹی سی بدلی کے پیچھے چھپ جاتا ہے اور سلمیٰ کی آنکھوں سے دو تیلیں چمکدار موتی اس طرح اس کے دامن میں گر کر کہیں غائب ہو گئے جس طرح چمک دمک کرتے ستارے ٹوٹ کر گرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن کہاں گرتے ہیں اس کا پتہ نہیں چلتا۔

دو مانوس ہاتھوں نے اس کی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ بچپن اور دوشیزگی کو بہت پیچھے چھوڑ کر پلک جھپکتے [illegible] ایک ہی لمحہ میں پھر اپنے حال سے چمٹ گئی۔

یہ کیا ہے سلو۔ علی احمد نے اپنی بھیگی ہوئی انگلیوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ لیکن ان ہاتھوں کا سہارا پا کر سلو کی آنکھوں نے علی احمد کے قدموں پر سارے موتی لٹا دیئے۔ اور علی احمد نے پلکوں سے ان موتیوں کو چن کر اپنے دامن دل میں چھپا لیا۔

جب سلمیٰ کا آنچل اور علی احمد کا گریباں نم ہو چکا تو علی احمد نے ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ سلو۔ دیکھو نا۔ بات کس قدر معمولی ہے اور ہم کس قدر جذباتی ہیں۔ مجھے بعض وقت کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم کسی بہت بڑے گنبد میں کھڑی ہوئی مجھے پکار رہی ہو سکتی ہیں تمہیں جواب دینے کی بجائے تمہاری آواز باز گشت بن گیا ہوں۔ دو دلوں کا اس قدر ایک ہو جانا کس قدر خوبصورت سانحہ ہے۔ تم روتی ہو تو تمہارے آنسو پونچھ دینے کی بجائے میں تمہارے ساتھ رونے لگتا ہوں۔ اس طرح تو زندگی زیادہ دشوار ہو جاتی ہے۔

وہ مسکرانے لگا۔ کم سے کم سلمیٰ نے تو یہی دیکھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔ اس نے سلمیٰ کی بانہہ میں چٹکی بھرتے ہوئے کہا لاؤ ہاتھ پر ہاتھ مارو۔ وہ ترکیب سوچی ہے کہ بس تم بھی خوش ہو جاؤ گی۔ سلو بی بی دن بھر سوچتی رہیں اور سلو بی بی کے صاحب بہادر نے چٹکی بجا کر مسئلہ حل کر دیا۔ بس طے ہو گیا کل سے صاف سگریٹ بس پئیں گے۔ بیڑی پئیں گے۔ بیڑی پیتے ہوئے انہیں ذرا شرم آئے گی اس لیے دفتر میں وہ اسموکنگ نہیں کریں گے۔ اسموکنگ کا پروگرام گھر پر ہی ہوگا اور ننھی انڈا کھائے گی۔

اور آج ننھی نے انڈا کھا لیا تھا سلمیٰ اسی لیے تو بہت خوش تھی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ آج زندگی میں پہلی بار علی احمد کو بیڑی پیتا ہوا دیکھ کر بھی اس کے دل پر کچھ نہ گذری۔ علی احمد نے بیڑی کا ایک لمبا کش کھینچا تو پھر دوسرا کش نہ لے سکا۔ سلمیٰ سے چھالیہ کا ٹکڑا مانگ کر منہ میں ڈالتے ہوئے دوسرا کش لینے کے بجائے اس نے بیڑی کو انگلیوں میں دبا یا تو سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے اس کو دیکھا۔ علی احمد چاہتا تھا کہ سلمیٰ اس سے ہمدردی کرے۔ یہی کے لیے کم سے کم اس کے جذبۂ قربانی کو سراہے لیکن ننھی انڈا کھا چکی تھی اور سلمیٰ نے اپنے اطراف مسرتوں اور خوشیوں کا ایک ایسا جال بُن رکھا تھا جس کے خول کو کوئی حادثہ کوئی سانحہ اس وقت نہیں توڑ سکتا تھا۔ علی احمد نے غور سے سلمیٰ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ گلستان بنا ہوا تھا اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ اس کے بدن کا رواں رواں جیسے رقصاں تھا آج اس نے نئی دنیا پا لی تھی جہاں اس کو ہر چیز حاصل تھی جہاں اس کا ہر قدم منزل تھا۔ علی احمد کی نظر برآمدے میں رینگتی ہوئی ننھی پر پڑی تو اس کو سلمیٰ پر بے اختیار پیار آ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ سلمیٰ کا یہی بے پناہ مسرت ہی زندگی کے سارے انسانی جذبات [illegible] ہیں اس کی یہ خوشی جہاں ننھی کے لیے [illegible] کے لیے بے اندازہ محبت کا مظہر بھی ہے کیونکہ سلمیٰ نے مصیبتوں کو شکست دے کر زندگی سے نباہ کرنا سیکھ لیا ہے۔

ان سلمیٰ کو پیٹ لگاتے ہوئے کہا کہ سوتے سوتے ہی بیٹے نے انڈا کھا لیا ہے تو تم گھور رہی ہو کہ میرا پیٹ بھی بھر گیا ہے
آہ اماں تو خوش ہو کر ہمارے ناشتے کی بھی فکر نہیں سلمیٰ نے بہت محبت سے علی احمد کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ
آج پیٹ ہی صاف ہو گیا ہے، سو گیا ہے اسی لیے تو تم نے ٹیری کو بہت شال سے ہاتھوں میں دبا رکھا ہے بالکل اسی
طرح جیسے کوئی پاؤ اور مرغ مسلم کا ٹکڑا سا لگا رہتا ہے

اب پاؤ اور مرغ مسلم کھا چکنے کے بعد علی احمد سلمیٰ کے پاس کھڑا ہوا دال کے بگھار سے لطف اندوز ہو رہا تھا
پاؤ اور مرغ مسلم کھا چکنے کے میاں علی احمد کے لیے گھر۔ سہی ہوئی دال اور گرم گرم چپاتیوں کے انتظام میں سلمیٰ معروف
ہو گئی تھی۔

بی اماں اپنے آخری پہرے میں آخری لوگ ٹانک چکی تھیں اور بہت احتیاط سے ممی کی گرفت سے سر دوپٹہ چھڑانے کی
کوشش کر رہی تھیں

سلمیٰ کی زندگی بہتی ہوئی ندی کی طرح شانت تھی ممی نے بیچ ندی میں کھڑے ہو کر کچھ ایسا اودھم مچایا تھا کہ اس کے
چھوٹے چھوٹے ہاتھوں نے سے ساری ندی کی شانتی ڈول گئی تھی۔ لیکن علی احمد نے ایک چھوٹی سی ناؤ ندی کی نرم موجوں پر بہا دی
تھی۔ اور ننھی اس ناؤ پر بیٹھ کر دھیمی دھیمی بہنے لگی تھی

زندگی کی گاڑی راستے کی ناہمواری کے سبب ٹھہر گئی تھی لیکن علی احمد نے ذرا سا دھکا دے کر ان راستوں سے گاڑی
کو گزار دیا تھا اور اب یہ گاڑی جیسے مانوس راستے کے چوڑے چکلے سینے پر رینگتی ہوئی منزل کی طرف بڑھنے لگی تھی
ننھی کو ہر روز ایک انڈا مل رہا تھا۔ چار دنوں میں اس نے چار ہی انڈے کھائے تھے

پھر دن طلوع ہوا تو دادی اماں کی طبیعت زیادہ اداس تھی زیادہ مضمحل تھی رات بھر وہ نیند میں بڑبڑاتی رہی تھیں خدا
میرے احمد کو ترقی دے سو دو تین علم کی دولت سے اس کو سرفراز کیا اسے اس کو زندگی کی مسرتوں سے مالا مال کر دے۔ ننھی پھول
بن کر جیئے اور اس کی خوشبو سارے چمن کو معطر کر دے۔ پھر وہ یکایک کہنے لگیں۔ "او سو علی احمد کی ڈگری کا فریم ٹوٹ گیا تھا
پھر تم نے بنوایا کیوں نہیں۔ آج ہی بنوا دو۔ ممی یہ شگون ٹھیک نہیں۔ اتنا بہت سا علم پڑھ لیا ہے تب کیسے دو لیے بے کھلی بی لے
پاس کی دلہن ہو کر علم کی حفاظت کرنا تو بے رسکیا"

"دادی سلو بیٹی یہ میری ننھی تو پلنگڑی کی پٹی کا سہارا لیے بغیر بھی دو چار قدم چل لیتی ہے لے بھئی سنبھال اس کو اس نے
میری ساری گھڑیاں بکھیر دیں"

سلمیٰ نے ٹری لی کے چلتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اماں ننھی تو آرام کر رہی ہے۔ ڈگری کا فریم تو میں نے
کب سے بنوا لیا تھا جس کی آپ تعریف کر چکی ہیں ماتھے پر پسینہ آ رہا ہے اب آپ آرام کیجیے اماں بخار اتر رہا ہے"

صبح ہوئی لیکن دادی اماں کا بخار نہ اترا کانپتے ہوئے ہاتھوں میں موسمبی کے رس کا گلاس تھامے دادی اماں نے نحیف آواز
میں پوچھا "ننھی کو انڈا نہیں دے رہی ہو کیا" سلمیٰ نے دادی اماں کے سوال کو ان سنا کر کے جواب دیا "اماں آپ شربت
پی چکیے نا دوا کا وقت ہو رہا ہے اور پھر آپ کو زیادہ آرام کرنا بھی تو چاہیے

دادی اماں نے موسمبی کا گلاس منہ سے لگایا۔ پی چکیں تو کچھ سوچ کر انہوں نے سلمیٰ کو پکارا "سلو بیٹی ذرا اس گلاس
میں تھوڑا سا پانی لے آنا"

پانی کا گلاس ہاتھ میں تھامے دادی اماں آنکھیں بند کیے دیر تک کچھ پڑھتی رہیں۔ پڑھ چکیں تو سلمیٰ کو گلاس دیتے
ہوئے انہوں نے کہا۔ "کیا نام ہے تمہاری تاثیر ہوتی ہے بیٹی۔ دم کیا ہوا پانی ننھی کو روز پلایا کرنا۔ انشاءاللہ وہ بہت

جلد باؤں باؤں چلنے لگے گی۔"

سلمیٰ نے نمی کو گود میں اٹھا کر گلاس اس کے منہ سے لگانا چاہا تو جانے کیوں اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر دم کئے ہوئے پانی میں جا چھپا۔

نمی کے ہونٹوں سے لگاتے لگاتے سلمیٰ نے گلاس ہٹا لیا۔ لیکن ٹپکا ہوا آنسو دم کئے ہوئے پانی کا جزو بن گیا تھا۔ کوئی موتی تو تھا نہیں جسے سلمیٰ الگ کر لیتی۔

اس نے پھونک کر گلاس نمی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ دو گھونٹ پی کر نمی نے منہ پھیر لیا۔ اور بسورتے ہوئے کہا۔ "ندا کاتے، ندا دو۔"

بقیہ یادوں کے کھنڈر

گم ہو گئی۔ اس کی انگلیوں کی حرکت آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی گئی۔

"کیا آپ مجھے یہ کوٹ پہنا دیں گے؟" سوال سے زیادہ یہ ایک درخواست تھی۔ اور واعظ نے کانپتے ہاتھوں سے اسے کوٹ پہنا دیا۔ وہ اب بھی گم صم سا خاموش کھڑا تھا۔

"فورٹین ڈاؤن" کسی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اب وہ پھر ایک اسٹیشن ماسٹر تھا۔ ایک ذمہ دار فرض شناس آدمی! اسے ریل گزارنی تھی۔

ریل آئی اور چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی نرملا بھی۔ لیکن اسے یہ بھی یاد نہ رہا کب ریل آئی اور کب چلی گئی..... اپنے نرملا کو خدا حافظ بھی کہا تھا کہ نہیں؟ . . . . . وہ اس وقت چونکا تھا جب ریل کی آخری سرخ روشنی... تاریکیوں میں ڈوب کر رہ گئی تھی! بوجھل قدموں سے وہ اپنے کمرے کی طرف لوٹ آیا۔ رات ختم ہو رہی تھی۔ صبح کی آمد کے آثار ہر طرف پھیل گئے تھے۔ خواب کی رنگین دنیا پو پھٹتے ہی تحلیل ہو جاتی ہے اور پھر حقیقت کا مدھم اُجالا ——— !

بقیہ کتاب پڑھنے کی تکنیک

بیوک کار آ کر رک جائے گی۔ اسلام علیکم خطیب صاحب۔ آپ وعلیکم سلام کہہ کر موٹر نشیں کو دیکھیں گے۔ موٹر نشین جو "جنت نظیر" میں رہتے ہیں۔ آپ سے پوچھیں گے "کیا کوئی نئی کتاب ہے؟" جی ہاں "عورت کا دل" "عورت کا دل شائد آپ نے دیکھ لیا ہوگا۔" "جی یوں ہی کہیں کہیں سے۔ کیا آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ ہاں ——— مجھے کتابیں دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ کل واپس کر دوں گا۔" آپ کتاب دے دیں گے۔

اور بیوک کار ایک اپیل عورت کی طرح آپ کے سامنے سے پھرا اُٹھ جائے گی۔ آپ موٹر کی پشت دیکھتے رہ جائیں گے تو دوستو یہ ہے مفت کتاب پڑھنے کی تکنیک ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔

ٹھاکر پونچھی

معاوضہ

چھوٹی سی ریاست میں چھوٹی چھوٹی جاگیروں کی تعداد اتنی ہی تھی جتنی کہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں، چھوٹی چھوٹی ندیوں اور چھوٹے چھوٹے کچے گھر دندوں کی تھی۔ چاند نگر کی ریاست دور دور تک پھیل کر مختلف جاگیروں میں بٹی ہوئی تھی۔ جتنے کسان تھے شاید اتنی ہی جاگیریں۔ جو جاگیرداروں کے حساب سے نہیں بلکہ کسانوں کے حساب سے تقسیم کی گئی تھیں — دھرتی زرخیز تھی اور اپجاؤ۔ کسان بھوکے تھے اور ننگے۔ جاگیردار عیاش تھے اور عشق پرست۔

ویسے تو چاند نگر کی زمین اپنے خوبصورت قدرتی مناظر کے لیے دور دور تک مشہور تھی۔ حسین دھرتی کے کسان مرد بھی خوبصورت اور تنومند تھے۔ عورتیں خوش شکل اور معصوم لیکن زیادہ مشہور تھی چاند نگر کے جاگیرداروں کی مہمان نوازی، حسن کا شہرہ شراب کے ساتھ حسن کے شائق مرد بھی تھے۔ عورتیں بھی اور کتے بھی۔ انسانوں پر کتوں کو ترجیح دی جاتی۔ اس لیے عمدہ کتوں کا جام صحت پیا جاتا اور ان کے منہ میں چند گھونٹ ڈال کر شراب کے دور کا افتتاح کیا جاتا۔ علاقہ کے لوگ جاگیرداروں اور ان کے مصاحبوں سے اتنا ڈرتے تھے جتنا کہ کتوں سے — بڑے بڑے اعلیٰ نسل کے خونخوار کتے جو شراب پی کر سرِ شام گلی کوچوں کے چکر کاٹنے لگتے تھے شرابی کتے اور سرکاری سانڈ! ان کے ادھر ادھر اور ارد گرد پسینہ میں لت پت ہانپتے ہوئے سرسبز پیلے پیلے کھیت اور جھپائی ہوئی کسان لڑکیاں جو اس علاقہ کی تمثیل حسن علاقہ دھرتی کی ہیبت اور

کنور کشور سنگھ جی نے جب اپنی جاگیر کی باگ ڈور سنبھالی تو ان کی جوانی کی طرح جاگیر بھی سکڑتے سکڑتے چند دیہات تک ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی کیونکہ ان کے والد بڑے جاگیردار صاحب شکار کے دلدادہ تھے۔ اور کھیتوں کے زیادہ حصے انہوں نے شکارگاہوں میں بدل دیے تھے جہاں وہ اپنے بڑھاپے کی دبی ہوئی حس کو جنگلی جانوروں کے تازہ خون سے ہرا کرتے لیکن کنور کو جنگلی جانوروں کا شکار پسند نہ تھا۔ انہوں نے ان میں دوبارہ کھیت پیدا کئے اور انہیں کسانوں کے ہاتھ سونپ کر حسب منشا شکار کے لیے استعمال کیا۔

کہتے ہیں کنور صاحب کا دور خوشحالی اور ترقی کا دور تھا۔ چاروں طرف پکی سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا۔ ندی نالوں پر پل باندھے گئے۔ نہریں کھودی گئیں۔ اپنی پرانی حویلی کی مرمت کروا کر اسے جدید طرز پر لایا گیا۔ جس پر ہزاروں روپے صرف کئے گئے اور ایک جھنڈے میں نئے ڈھنگ کی بیٹھک بنوائی گئی۔ جہاں شام کو بیٹھ کر وہ اپنی جاگیر کی نئی پرانی داستانیں سنتے اور جام نوش فرماتے۔ اپنی پیاری رعایا کو اپنے مقدس درشنوں سے فیض یاب کرتے۔ پیاری رعایا جھک جھک کر سلامیں بجا لاتی اور جے کے نعرے پرانی حویلی کی بوسیدہ بنیادوں میں سما کر کنور صاحب کی زندگی کو ایک ہزار برس اور بخش دیتے۔ ...

جب پرائے مہمان ہو جاتے، جو ان کے دل کو چھو جاتا۔ اسے وقتی طور پر اپنے نوکر چاکروں میں جگہ دینے کے لیے حویلی میں داخل کر لیا جاتا۔ خوبصورت لڑکیوں کے بیاہ شادی کا کام بھی انہی کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچتا۔ ایسی لڑکیوں کو وہ اپنی حویلی میں لے آتے۔ ہفتوں اپنے حرم میں رکھتے اور پھر انہیں غریب کسانوں میں بانٹ دیا جاتا۔ لوگ ان کے گن گاتے اور لڑکیاں اپنی جوانی کو اپنے سینوں سے لگائے جاگیر کے کھیتوں میں آباد ہو جاتیں۔

.... دھرماتما جاگیردار کی رعایا بھی دھرماتما تھی۔ اس لیے کنور صاحب کی جاگیر میں صرف ایک بار بغاوت ہوئی۔ حالانکہ اردگرد کے علاقوں میں کئی بار لوگ سوتے میں ایک ساتھ بڑبڑائے تھے اور انہیں نیند سے جگانے کے لیے کھلی فضاؤں میں گولے داغے گئے تھے۔ اور یہ بغاوت کرنے والا نعیتو چمار تھا، جو اپنی کھیتی باڑی چھوڑ کر بڑے شہر چلا گیا تھا۔ کیوں وہ کسان کی موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔ زراعت چھوڑ کر جانے اس نے وہاں کون سا دھندا اپنایا، کیا کیا دیکھا اور پڑھا سنا۔ کیا کیا باتیں سیکھیں تھیں کہ جاگیر کے کسان کنور صاحب کو بھول کر اسی کے گن گانے لگے وہ قلندروں کی طرح ایک جھٹک کر حق صدا بلند کرتا ـــــ

زمین کاشت کار کی،

یہ صدا پہلے دبی دبی زباں سے بلند ہوئی۔ کئی بس پلٹے، کئی ہنسے۔ پھر یہ عجیب سی صدا دھرتی کے گیتوں میں سما کر دھان کی بالیوں اور گندم کے خوشوں میں لہلہانے لگی۔ اناج کا ایک ایک دانہ اس کی زبان بن گیا۔ بڑھتی پھیلتی یہ آواز مندر کی گھنٹیوں اور مسجد کی اذانوں میں تحلیل ہو گئی

کنور صاحب کے اپنے خاندان کی ساری تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا حادثہ تھا۔ وہ بہت سٹپٹائے۔ ایک نیچ ذات کا حقیر سا آدمی، جس کا نہ کوئی دھرم نہ ایمان، اس طرح ان کے پرسکون حوالوں میں خلل ڈال دے۔ اُن کی خاندانی وجاہت پر ایک کاری ضرب تھی۔ کئی راتیں بے آرامی میں کاٹنے کے بعد انہوں نے اپنے خاص مصاحب ستونائی کے مشورے پر عمل کیا۔ جو ایسی گتھیاں سلجھانے میں مشاق تھا۔

ایک صبح، جو روزمرہ کی ایک عام صبح تھی، کسان لوگ پرانے اسکول کے احاطے میں جمع ہوئے۔ تاکہ نعیتو چمار کا جلوس نکالا جائے۔ لیکن اس کا کوئی پتہ نہ تھا۔ صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے شام، لیکن وہ نہ آیا۔ کسی کو معلوم ہی نہ ہو سکا۔ وہ زندہ ہے یا ختم ہو چکا ہے۔ اس دن کسانوں کا جلوس تو نہ نکلا۔ لیکن کنور صاحب کی سواری ضرور نکلی۔ کھیتوں کو اجاڑتے اکھاڑتے شاہی گھوڑے اور پیادے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہنہناتے اچھلتے کودتے نکل گئے۔ ان کے آگے پیچھے مصاحبین تھے، سرکاری کتے تھے اور دوسرے لوگ جو جاگیر کی پرانی حویلی کی خاص پیداوار تھے اور جن کو اس کی پرانی دراڑوں میں ہی دم توڑنا تھا۔ شاہانہ سواری کو دیکھ کر کسان سہم گئے۔ انہوں نے آگے بڑھ بڑھ کر۔ گھوڑوں کی ٹاپ سے اٹھتی دھول کو اپنی اپنی پیشانی پر لگایا اور اپنے گناہوں کا پراشچت کیا۔ اسی شام کو معلوم ہوا کہ پرانے اسکول کے احاطے میں سرکاری کتوں کی چھاؤنی بنا دی گئی۔ جہاں نعیتو کی آواز کئی ہفتے گونجتی رہی وہاں اب کتے بھونکنے اور چلانے لگے۔ بھگوان اور خدا کا کسان لوگوں پر جو قہر نازل ہونے والا تھا وہ ٹل گیا۔ ایک ہیچ قسم کی بغاوت ختم ہو گئی اور بیچاری رعایا آہنی سلاخوں کے جکڑ میں الجھ گئی جو ان کے ساتھ ہی دھرتی کی کوکھ سے پیدا ہوئی تھیں۔ اس رات ستونائی کا جام صحت پیا گیا۔ مال گنج کے فانوس ساری رات رنگ برنگ کی روشنیاں پھینکتے رہے۔ پرانی داستانیں پہاڑوں میں گونجتی رہیں۔ بیچ میں جاگیر کی کھوکھلی فضائیں گولوں کی دھاڑیں نگلتی رہیں۔ بغاوت کا پودا جہاں اگا تھا، وہیں اسے دفنا دیا گیا!؟

بہت مدت تک کنور صاحب کا رام راج قائم رہا ـــــ

.... ایک رات، جو روزمرہ کی ایک عام رات تھی، کنور صاحب نے ایک بڑا بھیانک خواب دیکھا ـــــ بالکنی میں براجمان ہیں، شام کا وقت ہے، شراب کا دور چل رہا ہے لیکن حسب دستور سلام کا ایک [illegible] کہیں سے بلند نہیں ہوتا۔ نہ کسان نہ سلام نہ بچے کے نعرے، جو پرانی حویلی کی [illegible]

صبا

ہر شام کنور صاحب کی زندگی کو ایک ہزار سال اور بخش دیتے ... فوراً نقاروں پر چوٹ پڑی اور شاہی فرمان جاری ہوا کہ تمام رعایا حویلی کے نیچے جمع ہو جائے۔ لیکن تب بھی کوئی نہ آیا۔ سب اپنے اپنے کھیتوں سے ہی چپٹے رہے۔ پھٹک نہ پایا۔ کوئی جنبش نہ ہوئی۔ جو جہاں جہاں بیٹھا تھا اس کا مالک بن بیٹھا۔ ابھی کنور صاحب کچھ سوچ بھی نہ پائے تھے کہ یہ خواب ہے یا حقیقت کہ نفیسو چمار کا دھندلا سا نقش نمودار ہوا۔ اس جگہ وہ صورت کو دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ صبح کا سورج جاگ رہا تھا اور ساری حویلی ایک خوفناک سناٹے میں لپٹی ہوئی تھی۔ اسی وقت پنڈت، جیوتشی اور ودوان بلوائے گئے اور خواب کی تعبیر پوچھی گئی۔ جنگل کی آگ کی طرح خبر چاروں طرف پھیل گئی کہ ہر حویلی اور ہر ایک جاگیر میں ہون کرائے جا رہے ہیں اور منتروں کا اکھنڈ پاٹھ شروع کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ سنیچر کی رات جب ٹوٹ رہی تھی اور پرانا سورج ایک نئی صبح کو جنم دینے والا تھا، تمام جاگیرداروں نے ایک جیسا خواب دیکھا کہ ان کی جاگیریں ختم ہو گئی ہیں اور ہر کسان اپنی اپنی زمین کا جاگیردار بن بیٹھا ہے اور چاند نگر کے مہاراج ادھیراج غیر قدرتی موت مر کر اپنے جاگیردار بچوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یتیم کر گئے۔

مہینوں ہون کنڈ کی آگ جلتی رہی۔ دھرتی کی سوندھی سوندھی خوشبوئیں چندن اور ساگری کے معطر دھوئیں میں لپٹ کر رہ گئیں۔ لیکن نفیسو چمار کی روح حویلی میں پھرتی رہی۔ ہون کنڈ کی آگ اسے نہ جلا سکی۔ اس کا جو اثر دھرتی میں رچ گیا تھا، وہ بھی نہ مٹ سکا۔ اور پھر ایک دن کنور صاحب کے خواب کی سچی تعبیر سامنے آئی۔ چاند نگر کی نئی سرکار کا حکم گاؤں گاؤں پہنچ گیا — زمین کے مالک کاشتکار ہوں گے۔ اس دن کسانوں کا جلوس نکلا۔ وہ جلوس گھنٹوں کھیتوں اور پہاڑوں میں یونہی ناچتا گھوما۔ حسب دستور پرانی حویلی کی پالکی کے پیچھے سے نہ گزرا۔ ایک بے ترتیب سا جلوس تھا جس کے ساتھ نہ گھوڑے تھے، نہ مصاحب تھے اور نہ ہی آگے پیچھے سرکاری کتے۔ پھر بھی اس کے آگے آگے دھرتی ناچتی جا رہی تھی۔ آر پار کی ندیاں ایک دوسرے میں سماتی جا رہی تھیں۔ چاروں طرف پہاڑ گونج گونج کر زندگی کا نغمہ سنا رہے تھے۔ دھرتی نے اپنی چاندی کی پازیبیں کسان عورتوں کے پاؤں میں پہنا دی تھیں اور سونے کی سنہری سرسوں چاروں طرف بکھر گئی تھیں — اس دن کئی جاگیرداروں کو دل کے دورے پڑے۔ حویلیاں اندھیری رہیں اور فانوس سرد۔ غم بھلانے کی تمام ترکیبیں ناکام رہیں۔ لیکن جو دورہ کنور صاحب کو پڑا وہ شدید قسم کا تھا۔ کیونکہ جلوس کا آغاز ان کی اپنی حویلی سے ہوا تھا۔ وہ جہاں بیٹھے تھے وہیں جم گئے۔ خاص مصاحبوں نے صرف ان کی خوبصورت آنکھوں کی مست پتلیاں پھڑکتی دیکھیں۔ زبان سے وہ ایک لفظ بھی نہ نکال سکے۔ خاموشی کو انہوں نے ہمیشہ کے لئے اپنا لیا۔

ایک ہی رات میں حکومت بدل گئی تھی۔ ضابطے قانون بدل گئے تھے۔ حکم احکام بدل گئے تھے۔ حویلی کی روشنیاں دھیمی پڑ گئی تھیں۔ مصاحبوں کی تعداد گھٹ گھٹ کر ختم ہو گئی تھی اور کتے لاوارث ہو گئے تھے۔ لیکن کھیتوں کا ہریالا سبزہ لمحہ لمحہ نکھرتا جا رہا تھا اور اس کی وسعتیں پھیلتی جا رہی تھیں اور کسان اپنے نئے جسم کی حرارت میں غلطاں تھے۔

ایک روز کنور صاحب کو اچانک اپنی زندگی کا احساس ہوا۔ انہوں نے اپنے مصاحبوں کی نشستوں کو خالی دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری اور سنتو نائی کو بلوا کر کہا۔

"ہمارے سب مصاحب ہمیں چھوڑ گئے؟!"

"جی سرکار" سنتو نے روندھے ہوئے گلے سے جواب دیا۔

"کہاں گئے؟"

"جو زمین آپ نے انعام میں بخشی تھی اس کے جاگیردار بن بیٹھے۔"

"تم کیوں نہیں گئے؟"

"میرے نام آپ نے دو بار پڑھا تھا سرکار، دونوں بار پھاڑ دیا۔"

"نہیں تو تم ہی چلے جاتے؟!"

سنتو کی زبان لڑکھڑائی۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

کنور صاحب گرجے ___ "سنتو؟!"

"جی سرکار"

"سب لوگ مالک بن بیٹھے ہماری زمین کے۔"

"جی سرکار"

"وہ کس کے حکم سے"

"سرکار۔ نئی سرکار کے حکم سے۔"

"نئی سرکار کون؟"

"اپنی پرانی سرکار کے بعد جو بنی"

"اپنی پرانی سرکار کہاں گئی؟"

"یا تراپر چلی گئی سرکار"

کنور صاحب دانت پیس کر رہ گئے۔ سنتو سر جھکائے خاموش کھڑا ہے۔

کچھ دیر کے بعد وہ پھر گرجے ___ "کس قانون سے ہماری جاگیریں کسانوں کو دی گئیں؟!"

سنتو بڑا کائیاں تھا۔ وہ جانتا تھا کنور صاحب نشے کی حالت میں نمسکار کو ایک خاص نکتہ پر لاکر مارنے کے عادی تھے۔ اس کی نگاہوں میں وہ حادثہ گھوم گیا جب اسے ایک ایسے ہی سوال کا درست جواب دینے کے صلے میں کنور صاحب نے حکم دیا تھا کہ وہ سوبار پہاڑی قلعہ چھو کر دربار میں حاضری دے۔ لیکن آج اس نے دم رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ اور ذرا سنبھل کر گمبھیر آواز میں جواب دیا۔

"سرکار اس قانون سے جس سے آپ کو جاگیریں ملی تھیں۔"

"لیکن وہ تو ہمارے خاندان کی کارکردگی کے صلے میں دی گئی تھیں۔ وہ تو ہمارے شاندار کارناموں کا معاوضہ تھا۔ نقدی میں نہ ہوا۔ زمین جاگیر کی شکل میں ہو گیا۔"

"پھر سرکار کیا ہوگا؟" ___ سنتو خاموش نہ رہ سکا۔

کنور صاحب نے فیصلہ کن انداز میں کہا ___ "زمینیں جاگیریں جائیں کویں میں۔ ہمیں معاوضہ ملنا چاہیے۔" حویلی کے تاریک کونے میں معاوضے کی یہ صدا لگائی گئی۔ ساری حویلی گونجی، سارے پہاڑ گونجے اور یہی صدا بڑھتی پھیلتی گئی .... معاوضہ ملنا چاہیے۔ نئی سرکار دے چاہے کسان دیں ___ تمام جاگیردار پہلی بار ایک دوسرے کے قریب آئے۔ بات لمبی ہوتی نئی سرکار کے تحت تک پہنچی اور اسے جھک کر اپنا سامنے لے آئی نئی کہانی کے ہیرو کنور صاحب تھے۔ انہیں سخت صدمہ ہوا۔ اتنی شدت کا دورہ پڑا کہ رہی سہی سکت بھی جاتی رہی۔ اب کی بار وہ چارپائی سے ہی لگ گئے۔ جب ان کی سانسیں اکھڑ جاتیں اور دم نکلنے کو آتا تو ان کے

...بہت حرکت کرتے ـــــ معاوضہ ملا؟! اور پھر اپنی مری ہوئی آنکھوں سے چاروں طرف گھور گھور کر دیکھتے اور جب انہیں پورا احساس ہو جاتا کہ ان کے دل کی مراد پوری نہیں ہوئی، وہ پھر سے صاف سانسیں لینے لگتے۔

سنتو نے کنور صاحب کی زندگی کو یوں گھٹتے دیکھ کر ایک دن جاگیر کے شاہی حکیم صاحب کے ہاں جا کر کہا ـــ

"کنور صاحب کا کیا ہوگا حکیم صاحب۔ وہ تو کچھ کھاتے ہیں۔ نہ پیتے ہیں"

"انہیں غم ہو گیا ہے۔" حکیم صاحب کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

"کس بات کا غم۔ جاگیر چھن جانے کا ... وہ تو سب کی چھن گئی۔"

"نہیں!"

"تو پھر کنور صاحب کو کس بات کا غم ہے حکیم صاحب۔ کیا روگ ہے انہیں کہ کئی مہینوں سے بیچ میں لٹکے ہوئے ہیں"

حکیم صاحب نے سوچ سوچ کر سر گھمایا۔ اندازیں کہنا شروع کیا: "معاوضہ نہ ملنے کا انہیں اتنا غم نہیں جتنا کہ انہیں حضوری نصیب نہ ہونے کا ... نہ سلام رہے، نہ مصاحب اور نہ ہی وہ پہلے سے جلوس جشن، کنور صاحب کو بچانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے سامنے وہی منظر لایا جائے ... وہ پالکی میں بیٹھے ہوں اور ان کی رعایا سلام کرتی پیچھے سے گزرے اور ان کے نعروں سے ساری دھرتی گونج اٹھے"

سنتو کے پلے کچھ بھی نہیں پڑا۔ پھر بھی وہ جاگیر میں گھر گھر پہنچا۔ کیوں کہ کنور صاحب کی زندگی کا سوال تھا سنتو نے رو رو کر ان کی زندگی کی بھیک مانگی ـــ کسانوں نے اپنے مالک کی یہ حالت سن کر اپنے آپ کو سنگار ... مندروں اور مسجدوں میں ان کی صحت یابی کے لیے دعا مانگی گئی۔ وہ سب سچے دل سے ان کی زندگی کے خواہاں تھے۔ بدلے میں چاہے انہیں ساری قربانی بھی کیوں نہ دینی پڑے۔

کنور صاحب کو پرانی حویلی کی نئی پالکی میں لٹایا گیا اور پیچھے سے جے کے نعرے اور سلام بلند ہوئے۔ کسانوں کا جلوس جے کی صدائیں لگاتا گزر رہا تھا۔ لیکن کنور صاحب نے ہاں نہ ہلائی۔ آنکھیں موندے پڑے رہے۔ بڑی دیر کے بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف دیکھا آہستہ آہستہ ان کے لب ہلے۔ کیا معاوضہ مل گیا؟! سنتو سر تھام کر بیٹھ گیا!

حکیم صاحب کا یہ اُپائے بھی ناکام رہا۔ کنور صاحب چارپائی سے لگے رہے۔

کئی فصلیں پیدا ہوئیں۔ کئی گھرانے آباد ہوئے۔ بھوکے ننگے لوگ پیٹ بھر کر کھانا کھانے لگے۔ دھرتی کے اجڑے بنجر ٹکڑے پھر سے آباد ہونے۔ کسان لڑکیوں کی بھرپور جوانیاں بے خوف و خطر کھیتوں میں رقص کرنے لگیں۔ اب سارا ڈرامہ پرانی حویلی کی چار دیواری میں دبکا بیٹھا تھا۔

اب کی بار تاخیر سے بارشیں ہوئیں۔ لیکن برسنے لگیں تو قیامت ہی ڈھا گئیں۔ چھوٹے بڑے ندی نالوں میں سیلاب آ گیا اور ریاست کا بڑا دریا ابھرا۔ سے کاٹ کر کئیوں سڑکوں اور کھیتوں کو اجاڑتا ملتا تا کنور صاحب کی جاگیر کی طرف بڑھا اور رات ہونے تک اس کا ہر ایک کونہ اپنی لپیٹ میں لے لیا ... آگ روگ، جوگی جل اور راج راجہ کا قہر رات کو ہی نازل ہوتا ہے وہ رات بڑی لرزہ خیز تھی۔ پکی ہوئی فصل طوفانی لہروں کا شکار ہونے لگی۔ دیکھتے دیکھتے جل تھل ایک ہو گیا۔ کسانوں کی خوشیاں آنسوؤں میں بدل گئیں۔ ان کی چیخوں اور بھیانک آوازوں نے ... طرف ایک ہولناک فضا جگا دی لیکن کنور صاحب کی حویلی اس شور و شر سے بے نیاز دور کھڑی ...

خود بے ہوش پڑے صرف اونگھتے رہے۔

سنتو نے حویلی کی بالکنی سے طوفان اور سیلاب کا بھیانک منظر دیکھا۔ ڈرتے ڈرتے وہ کنور صاحب کے پاس گیا اور ان کے کان میں سرگوشیانہ لہجے میں کہا ——

"سرکار زبردست باڑھ آ گئی۔ جاگیر کے گاؤں سمایت ہونے والے ہیں۔ اپنی جاگیر کے انتم درشن کر لیجئے سرکار"

کنور صاحب کے بہرے کانوں میں جیسے کسی نے ڈھول بجا دیا۔ ان کے بے ہوش جسم نے حرکت کی۔ مری ہوئی آنکھیں تمتمائیں ہونٹ ہلے

"سچ سنتو"

"ہاں سرکار" سنتو کی آنکھیں بھی تمتما اٹھیں۔ "کئی تھوک مال بہتا جا رہا ہے۔ کئی گھر کو ٹھے بیٹھ گئے۔ میں نے گاؤں کے گاؤں باڑھ میں بہتے دیکھے . سب کچھ سمات ہو رہا ہے سرکار۔ آدمی رہیں گے نہ کھیت۔"

کنور صاحب کے جسم میں برقی رو جیسے دوڑ گئی۔ ایک دم اٹھ بیٹھے ——

"مجھے بالکنی میں لے چلو سنتو۔ میں بھی یہ تماشہ دیکھوں گا!؟"

۔ ان کا پلنگ بالکنی میں ڈالا گیا۔ نیچے دریا کسی بپھرے ہوئے اژدھے کی طرح سب کچھ ملیا میٹ کرتا ہوا پھنکارتا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اور کسان دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور حویلی سر بلند کئے دور کھڑی تھی۔ اس بھیانک سیلاب کا کوئی چھوٹا حقیر سا چھینٹا بھی اس کے قریب نہ پہنچا تھا —— کسانوں کی پر ہول چیخوں میں کسان لوگوں کی ان گنت مشعلوں کا رقص کنور صاحب کو بہت پسند آیا۔ ان روشن مشعلوں میں اندھیری رات کا سیلاب بھی انہیں بہت خوب صورت دکھائی دیا۔ اس رقص میں انہوں نے اپنی حویلی کو بھی شریک کیا۔ ایک مدت کے بعد اس میں فانوس جلائے گئے اور شراب کا دور چلایا گیا۔ حسب دستور کتوں کا جام صحت پیا گیا اور ان کے حلق میں چند گھونٹ ڈال کر جشن کا افتتاح کیا گیا۔ دریا کی اچھلتی ناچتی لہروں میں شراب کی بوتلیں انڈیلی گئیں تاکہ وہ بھی نشہ میں سرشار بلا جھجک ہو کر ناچ سکیں، کر گرس اور کسانوں کی بے ہنگم بے معنی چیخوں سے بے اعتنا اور نہیں کنور صاحب کے ہاتھوں چاندی کے روپے اور سونے کی اشرفیاں دریا کی نذر کی گئیں —— سیلاب اور خوفناک ہو گیا۔

حویلی میں اندر ویرانیوں کا جام صحت پیا جا رہا تھا۔ کھیتوں میں سدا بہاروں کے لیے دعائیں مانگی جا رہی تھیں کسان اپنی زندگیوں اور امیدوں کا بلیدان دے رہے تھے تاکہ کھیت کبھی فنا نہ ہوں لہلہاتی فصل تباہ نہ ہو۔ خود مر جائیں لیکن دھان کی بالیاں اور گندم کے خوشے زندہ رہیں

جب دور پورے عروج پر پہنچ گیا اور ساری حویلی نشہ کی کیفیت سے جھومنے لگی تو سنتو نے ایک روح فرسا چیخ بلند کی۔ لیکن کسی نے پرواہ نہ کی۔ صرف سنتو کے خشک حلق میں چند گھونٹ انڈیل دیئے گئے۔ دور جاری رہا کنور صاحب بے حد مسرور تھے کہ آخر اپنا پرانا ساتھی دریا ہی کام آیا۔ اگر جاگیر مفت ہی ان کے ہاتھوں سے نکل کر صحیح سالم برقرار رہتی تو ان کے پرکھاؤں کی آتمائیں بے چین بھٹکتی رہتیں اور وہ خود بھی شانتی کی موت نہ مر سکتے۔ جاگیر کا انت ہی ان کے وچے تھی!

.... جب سب لڑکھڑا گئے اور لڑکھڑا کر بہکنے لگے تو انہیں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ بیچ سیلاب میں کھڑے ہوں اور حویلی کی دیواریں ڈر اور سردی سے کانپ رہی ہوں اور بہت دور [illegible] پانی میں تیرتی ہوئی [illegible] —— اس احساس نے [illegible]

صبا

یکبارگی زلزلہ آیا تھا۔ کسانوں کی چیخوں کا بے ہنگم سا شور حویلی کے کونے کونے میں گونج اٹھا۔ سیلاب نے پرانی فصیل کو گھیر لیا تھا۔ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ کھیت اور گاؤں بہہ گئے تھے اور حویلی ایک جزیرہ بن کر رہ گئی تھی، جو کسی وقت بھی ڈوب سکتا تھا۔

حویلی کی چیخ پکار سن کر کسان اپنے کھیتوں کو بھول گئے۔ اپنے ان بچوں کو بھی بھول گئے، جو بہہ گئے۔ وہ جشن بھی بھول گئے جو حویلی کی چار دیواری میں صرف چند لمحے پہلے منائے گئے۔ پانی میں گھری ہوئی ایک حویلی دکھائی دے رہی تھی اور تھوڑی دور پر کھیتوں میں دیوڈار کا درخت کھڑا تھا، جو صدیوں سے راجہ اور پرجا کو ایک دوسرے سے الگ کر رہا تھا یا پھر دریا کے طوفانی تیور لمحے سے لمحہ۔ لمحہ تلخ و تند ہوتے جا رہے تھے۔

کسانوں کے چہرے اتر گئے۔ اپنے گھر اور کھیت بچ جانے کی جو خوشی انہیں بڑی مشکل سے حاصل ہوئی تھی وہ جیسے دریا کی خونخوار لہریں ان سے چھین کر اپنے ساتھ بہا لے گئیں۔ انہیں لگا جیسے حویلی کی چیخوں میں ان کا اپنا درد تھا۔ اس زندگی میں ان کا اپنا خون ہی دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا.. یکبارگی مشعلوں کا سیلاب حویلی کی طرف چلا، ایک ساتھ سب لوگ حویلی میں سسکتی ہوئی زندگیوں کو بچانے میں جٹ گئے۔ دیکھتے دیکھتے حویلی اور دیودار کے درخت کے درمیان رسوں کا پل باندھا گیا اور اس کام کو سرانجام دینے کے لیے کئی جانیں تلف ہوئیں۔ لیکن کام بلا خوف و خطر جاری رہا۔ کئی گھنٹوں کی مسلسل تگ و دو کے بعد حویلی کی مرتی ہوئی زندگیوں کو بچا لیا گیا اس وقت کسان اور جاگیردار کا سوال نہ تھا۔ انسان انسان کے بیچ ایک لازوال ابدی رشتہ کا سوال تھا۔

حویلی ڈوب گئی تھی!

وہاں کے بے ہوش نیم جان نیم مردہ لوگوں کو اکٹھا کر کے مندر کی عمارت میں لایا گیا۔ ان میں کنور صاحب کی اکھڑی ہوئی سانسیں بھی تھیں۔ انہوں نے تمام منظر دیکھا تھا۔ مدتوں سے بند آنکھیں ہمیشہ کے لیے کھل گئیں۔ ان کے چہرے پر کیسی اجنبی راحت کا سکون تھا۔

جب بارش تھم گئی اور سیلاب کا پانی اتر گیا۔ دن چڑھ آیا اور حویلی کی ڈوبی ہوئی دیواریں بھی باہر نکل آئیں اور ان کے سائے میں پلے ہوئے لوگوں کو زندگی کا احساس ہو گیا، تو سب ٹھٹھرتے کانپتے اس کمرے میں آئے جہاں بھگوان کی مورتی کے قریب کنور صاحب بے ہوش پڑے تھے۔

سنتو نائی سہما ہوا ڈرتا لرزتا ان کے پاس آیا اور بولا —

"سرکار ہم بچ گئے!"

کنور صاحب نے پھٹی پھٹی سی نگاہوں سے سنگ مرمر کی مورتی پر اچٹتی نظر ڈالی۔ پھر بھرپور نظروں سے کسانوں کو دیکھا — انہیں معاوضہ مل گیا تھا!

غلام جیلانی

یادوں کے کھنڈر

سندی پور معمولی سا اسٹیشن تھا۔ اس لائن پر گذرنے والی چند ریلیں تو وہاں ٹھیرتی بھی نہ تھیں۔ سرخ بجری سے بنے ہوئے لمبے پلیٹ فارم پر ہر وقت دھول اڑتی رہتی۔ نیم کے سایوں میں دو ایک لکڑی کی بنچیں پڑی تھیں۔ لیکن ان کو استعمال شاذ ہی کیا جاتا۔ مختصر سے مسافر خانے سے ملا ہوا چائے کا اسٹال تھا۔ جس میں چائے کے علاوہ پوری کچوری بھی مل جاتی تھی۔ دو ایک خوانچے والے بھی ریل کے وقت کہیں سے آنکلتے۔

جب کبھی کوئی ریل پلیٹ فارم پر آکر رکتی تو سندپور کی خاموش اور ویران دنیا میں زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ جیسے کائنات اونگھتے اونگھتے جاگ پڑی ہو! ہر طرف زندگی کے آثار بکھر جاتے۔ ہمیشہ خالی پڑا رہنے والا پلیٹ فارم ریل سے اتر کر سستانے والے مسافروں سے بھر جاتا۔ پان، بیڑی سگریٹ، گرم چائے — اور ٹھنڈا پانی کی صدائیں ہوا کے ساتھ ہر سمت پھیل جاتیں۔ شائیں شائیں کرتا ہوا انجن دور دور تک خاموش کھیتوں اور میدانوں کو جھنجھوڑ کر جگا دیتا۔ اور کچھ دیر کے لیے سندپور کا معمولی سا اسٹیشن اپنے گرد و پیش کے ماحول پر اپنی برتری ثابت کر دیتا۔ جیسے سندپور بھی دنیا کی اہم چیزوں میں سے ایک ہے!

اور ایسے میں روندر اسٹیشن ماسٹر، اپنے چھوٹے سے کمرے سے باہر نکل آتا اور دالان کے ایک ستون سے ٹیک لگا کر پلیٹ فارم پر بکھری ہوئی زندگی میں اپنے کو سمو لینے کی کوشش کرتا۔ اس وقت اس کے ہونٹوں کے گوشوں میں ایک سہمی ہوئی سی مسکراہٹ کے شائبے تیرتے نظر آتے اور اس کی آنکھوں میں ایک بجھی بجھی سی چمک لہرانے لگتی۔ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ ویسا ہی کھڑا رہتا۔ اور پھر یہ کیفیت ختم ہو جاتی! انجن کی خوفناک چیخ کے ساتھ ہی اسٹیشن پر پھیلی ہوئی رونق اور چہل پہل اپنے پر سمیٹ لیتی — جیسے چیل کی آواز پر مرغی کے بچے اس کے پروں کے اندر جا چھپتے ہیں . . . اور ریل چلی جاتی۔

وہ اسی ستون سے ٹیک لگائے کھڑا رہتا، حتیٰ کہ اسٹیشن پر پھر وہی وحشت برسنے لگتی۔ ہر طرف اداسی، حزن، نیم کی شاخوں میں سے گذرنے والے ہوا کے جھکڑوں کا نوحہ اور تیز ہو جاتا۔ روندر کو محسوس ہوتا جیسے بھائیں بھائیں کرتا ہوا یہ اسٹیشن اس کا منہ چڑا رہا ہے — جیسے سندپور کا اسٹیشن اس بڑی دنیا میں پھر ایک حقیر اور بے معنی چیز بن کر رہ گیا ہے...... اور وہ اپنے کمرے میں چلا آتا۔

روندر کو ریلوے میں ملازمت کرتے پانچ سال گذر چکے تھے اور پچھلے دو برس سے وہ سندپور کا اسٹیشن ماسٹر تھا۔ لیکن وہ اب تک اس زندگی سے مانوس نہ ہو سکا تھا۔ اسے اس کا احساس تھا اس بارے میں اس نے لاکھ کوشش کی لیکن اس زندگی سے اس کا سمجھوتہ نہ ہو سکا! وہ سوچتا یہ ملازمت وہ نہ سنبھال سکے گا۔ اسے اس دنیا سے نفرت سی ہو چلی تھی — یہاں کی ہر چیز سے آتی ہوئی ریلوں سے، جاتے ہوئے مسافروں سے، انجن کی چیخوں، ریلوں کی گھڑگھڑاہٹ اور [illegible] کی بک بک سے وہ عاجز آچکا تھا۔ وہ ایک تغیر چاہتا تھا..... صرف تغیر، خواہ وہ کیسا ہو

صبا

اچانک ہی زندگی کی اس یکسانیت سے وہ گھبرا گیا تھا۔ یہاں کی باقاعدگی اور [illegible] سے وہ چڑنے لگا تھا۔ ہر چیز وقت پر ہوجاتی ہے ... [illegible] آپ [illegible] آپ [illegible] وجود ہی ہیں ——۔ [illegible] وہ سوچتا زندگی میں غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں ہر انسان سے۔ بلکہ آدمی غلطیوں [illegible] [illegible] تو وہ تو غلطیاں ہی کر رہا ہے۔ یہ بھی غلط ہے تو اس بات کوئی انکار نہیں کہ [illegible] ایک غلطی ضرور کی تھی [illegible] ایک ہولناک اور زبردست غلطی زندگی کی سب سے بڑی غلطی [illegible] اور یہاں غلطی کا وجود ہی نہیں [illegible] محسوس ہوا اس کی زندگی بھی [illegible] کی طرح وقت کے [illegible] پیچھے دوڑ [illegible] جا رہی ہے۔ [illegible] اور پہاڑوں کو [illegible] اور جنگلوں کو چیرتی اور اسٹیشنوں کو پیچھے چھوڑتی [illegible] رہی ہے۔ سگنل آ [illegible] لائنیں خود ہی کٹ [illegible] میں اور [illegible] کے لیے راستہ صاف ہوجاتا ہے [illegible] سگنل [illegible] کہیں [illegible] سوچتا اور سوچتا [illegible] تڑپتا

[illegible] نہیں [illegible] وہ [illegible] کہ [illegible] اسٹیشن کا کوئی ملازم اس سے کہہ رہا ہوتا۔ اس کی رگوں میں [illegible] ہوا اور بیروں سے لگ جاتا [illegible] ہو [illegible] وہی اسٹیشن وہی [illegible] ہوا پلیٹ فارم اور وہی سنگنل کے [illegible] سگنل [illegible] والا اور [illegible] لپٹا ہوا لنگڑا [illegible]

[illegible] میدانوں پر جب شام کا تھکا ہارا سورج آہستہ آہستہ اترنے لگتا تو اسٹیشن کے تمام ملازم پلیٹ فارم کے آخری سرے پر سرخ گول موال [illegible] پر بیٹھ جاتے، ایک جلسے [illegible]۔ اور آہستہ آہستہ ان کی گفتگو کا موضوع [illegible] [illegible] کرنے والے [illegible] کے [illegible] کی پیچیدہ [illegible] سیاسیات [illegible] کرتا۔ ہر [illegible] سگنل میں اپنی [illegible] کی [illegible] ایک [illegible] نکالتا اور [illegible] اس [illegible] دونوں [illegible] سے ایک ہے۔ ایک دو دم [illegible] اپنے ملک کی ترقی پر [illegible] اور ادھر [illegible] اسٹیشن کا [illegible] موڑ [illegible] موڑ [illegible] کے ایک [illegible] کے جھٹکے [illegible] اس کی [illegible] کرتے جاتے رو [illegible] دور [illegible] اس کی [illegible] محفل دیکھ کر خود بھی اس میں [illegible] کی خواہش [illegible] کرتا۔ اور تیلوں کو گھٹنوں پر [illegible] کے سامنے [illegible] پر ہی بیٹھ جاتا۔ [illegible] لوگ [illegible] ایک چھوٹا سا کلب [illegible] شامل کریں۔ [illegible] بے تکلف [illegible] بجھتے [illegible] اسٹیشن پر چھائی ہوئی اس وحشت خیز خاموشی کو [illegible] کے [illegible] اور [illegible] سفید [illegible] تیلوں کے میلے ہونے [illegible] سامنے [illegible] ہی بیٹھ [illegible] معصوم [illegible] اس کے دماغ میں مچے ہوئے طوفان کو [illegible] اور [illegible] خاموش ہو جاتے، جیسے بے تکلف [illegible] کی محفل میں کسی اجنبی کے آجانے سے [illegible] سا [illegible] جاتا ہے [illegible] وہاں سے اٹھ کر آگے بڑھ جاتا اور ٹہلتا ٹہلتا اسٹیشن کے حدود سے آگے نکل جاتا، جہاں تمام لائنیں آکر ایک لائن میں ضم ہو جاتی ہیں!

وہ جب لوٹتا تو دور پورب میں [illegible] ہوئے کوؤں اور [illegible] کی قطاریں رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں گم ہو چکی ہوتیں۔ درختوں پر چڑیوں کا شور [illegible] ہو چکا ہوتا اور خاموش و ساکت [illegible] کھڑے ہوئے بے حرکت درخت یوں لگتے جیسے کسی بادشاہ کے حضور میں کھڑے ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی اسٹیشن کی لائنوں کے [illegible] جھاڑیوں میں سے جھینگر چیخنا شروع کر دیتے "جھر جھر جھر" جھینگروں کا یہ کورس [illegible] کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ اسے اس آواز سے ہمیشہ نفرت رہی۔ اس آواز کو سنتے ہی اسے ایک جھرجھری سی آجاتی

اور اس کا جی چاہتا کہ اپنے دونوں کان بند کر لے۔ "چھر رچھر ر" اس کا بس چلتا تو وہ اس آواز کو فوراً بند کر دیتا۔ آدھی رات کو جب کوئی ٹرین رات کی اداس خاموشی اور تکلیف دہ جمود کو کچھ دیر کے لیے توڑ کر چلی جاتی تو اس کے جانے کے بعد جھنگروں کا یہ کورس انتہائی عروج پر محسوس ہوتا۔ اس وقت اسے اپنا یہ اسٹیشن ایک قبرستان دکھائی دیتا۔ ہر طرف وحشت، ہر طرف تنہائی، موت کی خاموشی اور مردوں کی سی بے بسی! اور پھر یہ جھنگروں کا غل! وہ گھبرا کر اپنے کمرے کے سارے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیتا۔

اور پھر ایسے میں اپنے کمرے کو دیکھ کر اسے وہ رات یاد آ جاتی جب وہ نرملا سے بیٹھا وہاں مسلسل تین گھنٹوں تک باتیں کر رہا تھا۔ وہ رات! کبھی بھول سکتا ہے وہ اس رات کو؟ ہلکے ہلکے جاڑوں میں لپٹا رات کا پچھلا پہر بوجھل سا ہو گیا تھا۔ وہ گلے میں گلوبند لپیٹے اسٹیشن پر ٹھہری ہوئی پسنجر کے ساتھ ساتھ ٹہل رہا تھا۔ ریل کے ڈبوں میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ انجن سے نکلتی ہوئی چنگاریاں فضا میں دور دور تک روشن لکیریں سی کھینچ رہی تھیں اور ہر طرف جلتے ہوئے پتھر کے کوئلے کی بو پھیل گئی تھی . . .

اور پھر وہ یکا یک چونک پڑا تھا۔ کسی نے اس کا نام لے کر پکارا تھا۔ یہ آواز وہ جانتا تھا، بڑی اچھی طرح۔ اس آواز کو اس کے کان برسوں سنتے رہے تھے۔ پھر بھی اس رات اسے یقین نہ آ سکا کہ یہ آواز نرملا کی ہی ہے۔ پلٹ کر جب وہ اس کھڑکی کی طرف آ رہا تھا تو اسے محسوس ہوا جیسے اس کے قدم ہوا میں پڑ رہے ہوں۔

"نرملا!" اس کے ہونٹوں میں کپکپی سی دوڑ گئی "تم یہاں! . . بھلا ممکن ہے یہ!" "اور میں خود پوچھتی ہوں کہ تم یہاں! . بھلا ممکن ہے یہ؟" اور ایک عجیب قسم کی مسکراہٹ نرملا کی آنکھوں میں ناچنے لگی۔ جیسے چاندنی راتوں میں ستاروں کی پھیکی پھیکی روشنی۔

"اکیلی ہو؟"

"ہاں۔ نہیں بالکل، نہیں! . . . یہ ساتھ ہے"

"یہ کون؟"

"ہاں یہ بھی . . . میرا لڑکا"

"اوہ!" اور اسے اپنی حماقت پر ہنسی آنے لگی۔ اب نرملا کی ہستی کسا نہ کوئی اور ہستیاں بھی وابستہ ہو چکی ہوں گی، یہ تو کبھی اسے سوچا ہی نہ تھا۔ اور اسے محسوس ہوا جیسے ایک نیا تلخ احساس ذہن میں بیدار ہوتا جا رہا ہے۔

"نرملا تمہیں اترنا ہوگا۔ تم اس ٹرین سے نہیں جا سکتیں۔ مجھے تم سے باتیں کرنی ہیں۔ بہت سی باتیں . . . سنا نرملا، تم اس ٹرین سے نہیں جاؤ گی!" وہ کہتا چلا گیا۔ جیسے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دینا چاہتا ہو "کہو نرملا۔ اترو گی نا؟"

"تمہارے کہنے کا کبھی انکار کیا ہے میں نے، ——— روندر تم جانتے ہو تمہارے لئے میری ساری زندگی ایک طویل ہاں میں تبدیل ہو چکی ہے" نرملا نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر پیدا کرتے ہوئے کہا۔

لیکن روندر اس وقت ان الفاظ میں پوشیدہ گہرائیوں میں اترنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چپ ہو گیا تھا۔

[illegible] تھی۔ ایسی طویل مدت کے بعد یہ اچانک ملاقات! جذبات کے سیلاب میں دونوں تنکے کی طرح بہے جا رہے تھے۔ ماضی کے بپھرے ہوئے سمندر میں ہل چل مچ گئی تھی۔ خاموش اور دبی دبی ہلچل...... ...یادوں کی نازک لہریں اٹھتیں، ابھرتیں، جھجکتی ہوئی آگے بڑھتیں اور پھر آپ ہی آپ لیشوں میں کہیں تحلیل ہو جاتیں۔ اور پھر دوسری لہریں ان کی جگہ لے لیتیں۔ . . جیسے یادوں کا یہ ہجوم کسی ہلکے سے اشارے کا منتظر بیٹھا تھا!

وہ اس وقت چونکا جب وہ دونوں اس کے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ نرملا کا مختصر سا سامان سامنے کرسی پر دھرا تھا، ایک تھرماس، ہینڈ بیگ، ایک ہلکا پھلکا سا بستر اور ایک اونی شال، ہیش اب جاگ چکا تھا۔ اور اپنی بڑی بڑی گول گول آنکھوں سے روندر کو تک رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو "یہ کون ہے؟"

"یہ تمہارے اا ہیں   یرنام کرو ہیش۔" نرملا اس کے ننھے منے سے ہاتھ کو پیشانی تک اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن وہ رونے لگا۔ روندر نے اسے چپ کرنے کی غرض سے اپنی گود میں لے لیا۔

"چپ ہو جاؤ بیٹے۔ تم اچھے بچے ہو۔ اس طرح نہیں رویا کرتے . . ." لیکن وہ برابر روتا رہا۔ ..."ارے بیٹے تم تو مجھ سے ناراض ہی ہو گئے اخیر   میں ہوں ہی برا" اور اسے اتار کر پھر نرملا کی گود میں دے دیا۔ "مگر تمہاری ماں نے مجھے کبھی برا نہیں کہا۔"

"کہتی بھی کیسے!   آپ نے اسے تکلیف ہی کونسی دی؟" نرملا نے روندر کی طرف دیکھے بغیر آہستہ سے کہا۔ لیکن روندر ان الفاظ میں چھپی ہوئی طنز سے زیادہ یاس اور ناامیدی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ دونوں پھر چپ ہو گئے۔ گفتگو کا رخ پھر پرانی یادوں کی طرف ہو چلا تھا۔ لیکن نرملا نے جیسے ان یادوں کو کندھوں پر سے جھٹک دیا۔ وہ بولی

"تو اب آپ ایک اسٹیشن ماسٹر ہیں! ـــ ایک ذمہ دار آدمی! وہ   وہ ..."

"ہاں وہ   کالج کا لاپرواہ چھوکرا، نہیں" روندر نے جملہ پورا کر دیا۔ ماضی کے دھندلکے پھر ایک بار تڑپتے چلے آئے۔ "مگر نرملا۔ ان دنوں کسے معلوم تھا کہ   لیکن اب ان باتوں سے کیا حاصل! خواہ مخواہ بے لطفی پیدا ہو گی۔"

"تو اب   اب میرا ذکر بھی   ؟" نرملا کا گلا بھرا گیا۔

"نرملا! ـــ" روندر تڑپ اٹھا۔

"جانے دیجئے۔ آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں، خواہ مخواہ بے لطفی ہو گی! . ." بادل برستے برستے رہ گئے۔ نرملا نے بات کا رخ پھیر دیا "تو آپ ریلوے میں کب سے ملازم ہوئے؟"

"کوئی پانچ برس ہوئے"

"اور کبھی اپنے وطن نہیں آئے آپ! . ایسا بھی کیا؟   پرانے دوستوں کو کبھی یاد کر ہی لیتے ہیں۔"

"لیکن تم نے ہی کونسا یاد کیا؟"

"اوہ۔ تو آپ بدلا چاہتے ہیں!"

"نہیں، یہ بات نہیں نرملا۔" روندر بے چین ہو اٹھا۔

"اور پھر آپ اپنا پتہ بھی تو نہیں چھوڑ گئے تھے! . . . ایسے چپ چاپ چلے آئے کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی"

مہیش نے پھر رونا شروع کر دیا۔ گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ لیکن ان کے ذہنوں میں مچا ہوا طوفان اور بڑھ گیا تھا
بڑی مشکل سے مہیش چپ ہوا۔

"آپ کی شریمتی اچھی ہیں؟" نرملا ایک دم پوچھ بیٹھی "کہاں ہیں وہ؟ .. کیا نام ہے ان کا؟" مسکرانے کی کوشش میں اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی یاس کی لکیریں اور گہری ہو گئیں۔

"میری شریمتی ——؟" راویندر نے جیسے اپنے آپ سے کہا "بہت اچھی طرح ہیں۔"

"تو مجھے ان سے ملائیے"

"کس سے ملاؤں؟" وہ چونک پڑا "میں نے شادی ہی کب کی ہے!"

نرملا چپ چاپ اس کے چہرے کو تکنے لگی۔ کئی بار کچھ کہنے کے لیئے اس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ بالآخر بڑی دیر بعد کہہ سکی۔

"مگر آپ کو شادی کر لینی چاہیئے تھی۔ اب تو آپ کی زندگی ایک دھار سے پر بہہ رہی ہے۔ آپ کے صبح شام صرف وقت کی رفتار نہیں رہے۔ آپ کا مستقبل معین اور روشن ہے! اب آپ ایک زندگی کا بار سنبھال سکتے ہیں اب آپ ..." وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ روندر کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دماغ میں سیکڑوں نشتر چبھو دئے ہوں! —— اس کے وہ سارے جملے اب تک نرملا کو یاد تھے جو وہ اسے سمجھانے کے لیئے کہا کرتا تھا۔ جب وہ کالج کے باغ کے ایک کنج میں بیٹھے گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے۔ باتیں کورس کی کتابوں سے شروع ہوتیں اور آخر میں انہیں محسوس ہوتا کہ وہ جانے کب سے اپنے ہی بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ روندر اپنے گھر کی باتیں سناتا ای ما تا کی باتیں چھوٹے بھائی اور بہنوں کی باتیں اور بات بات پر نرملا کھل کھلا کر ہنس دیتی آخر میں وہ کہتی۔

"آپ کا گھر سورگ سے کم نہیں —— میرے انتخاب کی داد نہ دو گے؟"

روندر بھی خوش ہوتا۔ لیکن اتنا نہیں۔ اسے اور بھی بہت سی باتیں سوجھتی تھیں جن پر نرملا نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اسے معلوم تھا وہ نرملا کو خوش نہ رکھ سکے گا۔ اس کی غریبی اور حساس طبیعت اس کا سب سے بڑا روگ بن گئے تھے۔ وہ نرملا کو پسند کرتا تھا۔ اس سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ اسے خوش رکھنے کے لیئے دنیا جہاں کی کوششیں بھی کر سکتا تھا۔ لیکن حالات اس کے قابو میں نہ تھے۔ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کے کاندھوں پر غریب ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کی پرورش کی ذمہ داری بھی تھی۔ ٹیوشن کر کے اور رات کو ایک اخبار میں کام کر کے وہ گھر کا کاروبار چلا رہا تھا۔ اس کا کچھ ٹھیک نہ تھا۔ نہ معلوم وہ بی۔ اے بھی کر سکے گا کہ نہیں! غریبی کی مصیبتیں وہ اکیلا برداشت کر سکتا تھا۔ وہ تیار تھا مخالف ہواؤں اور طوفانوں سے بچ کر شاید وہ اپنا دیا جلا سکے؛ لیکن ... لیکن نرملا! وہ اسے کیوں کانٹوں میں دھکیلے! مانا کہ وہ ان ساری باتوں کے باوجود اس کے ساتھ بیاہ کرنے کو تیار تھی۔ لیکن کہہ دینا آسان ہے۔ کتنی مشکلیں ایسی آ نکلتی ہیں۔ جن کا پہلے خیال بھی نہیں ہوتا! اور پھر نرملا کی ماں اس کے لیے کہیں اور شگون لینے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ وہ جانتا تھا نرملا سی بہو سے وہ بھی انکار نہ کریں گی۔ لیکن کیا وہ اسے خوش رکھ سکیں گی؟

اسے ہر طرف اندھیرا نظر آتا۔ اس کی زندگی ایک دھارے پر نہیں بہہ رہی تھی۔ اس کے صبح و شام وقت کی گرفت میں تھے۔ اس کا اپنا کچھ نہ تھا۔ اس کا مستقبل غیر معین تھا...... وہ ایک زندگی سب سے عزیز زندگی کا بار کیسے سنبھال لے! —— اور وہ یہ سب نرملا سے کہہ دیتا۔ ایسا کہتے ہوئے اسے اپنے دل پر پتھر رکھنا

آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسوؤں کو پی جانا پڑتا تھا۔ اس کی روح کا ذرہ ذرہ روتا ہوتا۔ لیکن وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ کے آثار لیے اسے سمجھاتا۔

"نرملا تم سمجھتی ہو مجھے ایسا کہنے میں خوشی ہوتی ہے؟ ___ پگلی۔ تم نہیں جانتیں میں چوبیس گھنٹے تمہارے متعلق سوچا کرتا ہوں۔ اپنے متعلق سوچا کرتا ہوں اور اور آئندہ کے بارے میں سوچا کرتا ہوں۔ تم خوبصورت ہو، تعلیم یافتہ ہو، تم دنیا کی خوش قسمت عورتوں میں سے ہو۔ تمہارے لئے ایک خوش قسمت ساتھی کی ضرورت ہے۔ جو زندگی میں تمہارے قدم کے ساتھ قدم بڑھا سکے۔ جس کی بیوی کہلا کر تم لوگوں کے دلوں میں جگہ پیدا کر سکو۔ تمہارے ماتا پتا بھی ایسے ہی سہانے سپنے دیکھ رہے ہوں گے۔ دیکھو۔ ہاں توجہ کر کیوں میں نہیں ہوتے۔ وقت تمہارے آنسو دھو ڈالے گا۔ دولت اور عزت تمہارے دل پر مرہم کا پھاہا رکھ دے گی۔ یہ باتیں جتنی معمولی اور پست ہیں، اتنی ٹھوس اور اہم بھی ہیں دنیا میں محبت ہی سب کچھ نہیں۔ اور پھر محبت کا انجام شادی ہو، یہ بھی تو ضروری نہیں! جو چیز میرے اختیار میں ہی نہیں، تمہیں کیسے دے سکتا ہوں، میں تمہیں خوش۔ رکھ سکوں گا نرملا۔ خواب کی دنیا صبح ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہے اور پھر حقیقت کا تلخ اجالا۔

.. نہیں، نہیں۔ مجھے معاف کر دو نرملا۔ میں مجرم ہوں، لیکن شادی؟ یہ اس سے بھی بڑا جرم ہوگا! میں اپنے آپ کو معاف نہ کر سکوں گا نرملا"

اور نرملا ان سب باتوں کے جواب میں رو پڑی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ اور نہ رونندر ہی کی سمجھ میں کچھ آتا کہ کیا کرے! امنگ اور ٹھوس حقیقتیں ان آنسوؤں کی لڑیوں میں گم ہو جاتیں اور وہ اپنے کیے ہوئے فیصلے پر خود ہی ندامت محسوس کرتا۔ سخت کوشش کے بعد کہیں ہوتی۔ باتیں اسے اپنے پاگل پن کا نتیجہ معلوم ہونے لگتیں۔ وہ آنکھیں بھینچ لیتا۔ اور نرملا کو حسرت سی۔ ہوتی کہ آنسوؤں کی کسی لہر میں ساحل تک آ کر لوٹ گئیں۔

اور اس رات نرملا نے پہلی باتیں یاد دلا کر زخموں کے کھرنڈ اکھیڑ ڈالے تھے۔ ماحول اب خاموش پڑا سو رہا تھا۔ باہر اسٹیشن بھی بالکل خاموش تھا۔ ریل کبھی کی جا چکی تھی، اور اس کے ساتھ ساری چہل پہل بھی۔ یہ خاموشی رونندر کی روح میں تحلیل ہونے لگی۔ جذبات کا وسیع سمندر اپنے اندر سیکڑوں طوفان چھپائے اوپر سے خاموش دکھائی دے رہا تھا! نرملا نے بتایا کہ اب وہ کئی بڑی بڑی انجمنوں کی روح رواں ہے۔ اب وہ اچھی اچھی تقریریں بھی کر لیتی ہے لوگ اس کے نام سے واقف ہو چکے ہیں۔ اس کے شوہر کو حکومت یورپ بھیج رہی ہے۔ آنکھوں سے متعلق ایک خاص بیماری کی تحقیقات کرنے کے لئے اور وہ اس رات بھی ایک جگہ جلسہ کی صدارت کر کے واپس آ رہی تھی۔ وہ کہنے لگی "میں نے پہلی بار اتنے بڑے جلسے کی صدارت کی اور اتنے لوگوں میں تقریر کرنے کھڑی ہوئی! میری تقریر بہت کامیاب رہی، لوگ بار بار بے اختیار ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔ میرے نام کے نعرے بلند ہوئے۔ لیکن . . . " بولتے بولتے وہ رک گئی "لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں مجھے ان چیزوں سے سچی خوشی حاصل ہوئی؟ اوہ .. . . . . کب تک آخر کب تک یہ ڈھونگ رچا سکوں گی!" اور پھر دونوں خاموش ہو گئے۔

بالآخر نرملا نے ہنستے ہوئے کہا "کیا آپ چائے بھی نہ پلائیں گے؟" اور رونندر بھی زبردستی مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے اپنے تھرماس سے پیالی میں چائے انڈیل دی

چائے پی کر وہ زیادہ دیر باتیں نہ کر سکے۔ دوسری ریل کے آنے میں اب بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ نرملا نے [illegible] کی تیاریاں کرنے لگی۔ اس نے اپنا کوٹ اتار کر کرسی پر ڈال دیا تھا۔ دوبارہ پہنتے پہنتے نہ معلوم کیا [illegible]

عوض سعید

نانی ماں

میرے مکان کے عین مقابل کھپریل کا ایک نیم پختہ اور بد وضع سا مکان تھا جس میں نانی ماں رہتی تھیں۔ اور اس کے ساتھ ہی کچی مٹی کے بے ترتیب کئی مکانات تھے جو قطار در قطار دور دراز تک پھیل گئے تھے۔ جسے لوگ شاہ صاحب کا محلہ کہتے ہیں

شاہ صاحب کے محلے میں اگر کوئی چیز قابل دید تھی تو وہ نانی ماں تھیں یا سامنے بہنے والی بڑی بدرو جس میں کئی سال سے سڑاند پھوٹ رہی تھی

محلے کئی مہینوں سے ملیریا کے باعث شاہ صاحب کی بستی کے کئی افراد اجتماعاً دوسری دنیا میں منتقل ہو گئے تھے۔ کبھی کبھار میونسپلٹی کی بڑی لاری شاہ صاحب کے محلے کی گلیوں میں آ رادا۔ گھومتی تو محلے کے لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے مکانوں سے باہر یوں نکل آتے جیسے گھونسلوں سے پرندے

میونسپلٹی کے جوان شاہ صاحب کے محلے کی گندی نالیوں کو بڑی بڑی جھاڑوؤں سے دریو صاف کرتے ہوئے ایک دوسرے کی شان میں مغلظات بکتے۔ ایسے وقت میں نانی ماں اپنے بد وضع مکان سے لکڑی ٹیکتی ہوئی سایے کی طرح باہر نمودار ہوتیں اور اس کے ساتھ ہی نانی ماں کے پوپلے منہ سے گالیوں کا ایک طوفان ابل پڑتا

"کمبختو ۔۔۔ تمہیں میرا شاہ صاحب دیکھ لے گا۔ کتنے دنوں سے تم نے صفائی نہیں کی ہے۔ حرام کی کمائی کھاتے ہوئے تمہیں لاج نہیں آتی

تم سمجھتے ہو میں اس سڑاند میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔ یہاں کا ایک آدمی بھی نہ مرے گا جب تک کہ شاہ صاحب کا سایہ ہمارے سروں پر ہے

میونسپلٹی کے جوان کیچڑ میں لت پت جھاڑوؤں کو ہاتھوں میں لیے نانی ماں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ۔۔۔ "نانی ماں یہ بڑی بدرو سرکار نے تمہارے لیے ہی تو بنائی ہے تم اس میں ڈوب کیوں نہیں مرتیں ٹھہرو ۔۔۔ چند ہی دنوں کی بات ہے سرکار یہاں ایک اسپتال کھول رہی ہے پھر تم اطمینان سے کسی دوسرے محلے میں جا کر ٹھاٹ باٹھ سے اپنا ڈیرا ڈال لینا"

"موئے! میں تیری سرکار سے ڈرتی تھوڑی ہی ہوں مجھ پر شاہ صاحب کا سایہ ہے تم لوگ مجھے یہاں سے نہیں نکال سکتے" نانی ماں جوش گرم ہو کر بڑبڑا اٹھتیں

نانی ماں اپنے محلے کی عورتوں میں عمر اور تجربے کے اعتبار سے سب سے زیادہ قدآور تھیں، گو پیر قبر میں لٹک رہے تھے لیکن طراری اور ہوشیاری کا یہ عالم تھا کہ جوان بھی منہ لگنے سے گھبراتے تھے

شاہ صاحب کے محلے کے جہاں دیدہ لوگوں کے علاوہ نانی ماں ان نوجوانوں میں بھی قابل احترام سمجھی جاتی تھیں، جو ایک باشعور ذہن کے مالک تھے محلے میں اگر کوئی بیمار ہو جائے تو نانی ماں ہی سب سے پہلی عورت ہوتیں جو لکڑی ٹیکتی ہوئی، کھانستی کھکھارتی مزاج پرسی کو آتیں یہی نہیں وہ مختلف جڑی بوٹیوں کی مدد سے طرح طرح کی دوائیں بناتیں، اور محلے کے ان بیمار نوجوانوں کو دے آتیں جو ملیریا کا شکار ہوتے۔

نانی اماں اپنی خدمات کے لیے کسی لیڈی ڈاکٹر سے کم نہ تھیں محلے کے بہت سارے بیمار نانی اماں کے دستِ شفا سے صحت یاب ہو گئے تھے اس میں یا تو نانی اماں کی حکمت کا دخل تھا یا محلے کے ان پڑھ لوگوں کے عقیدے کا کچا پن ـــ وہ بیماروں میں دوا تقسیم کرنے سے پہلے اس پر پڑھ کر کچھ پھونکتیں اور پھر دے آتیں

نانی اماں کے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ وہ بچپن میں کافی حسین تھیں ان کی جوانی اور حسن کے دور دور چرچے تھے انہوں نے ایک کابلی پٹھان سے محبت بھی کی تھی جو پچھلی بڑی جنگ میں مارا گیا تھا۔ تب سے انہوں نے اپنی زندگی کی گاڑی کو دکھوں کی راہوں پر چھوڑ دیا تھا وہ کئی دنوں تک اپنے محبوب کی یاد میں آنسو بہاتی رہیں ـــ اور جدائی کی اذیت دہ لمحوں نے ان کی آنکھوں کے سارے سوتے خشک کر دیے

ان کے متعلقین نے بارہا ان کی شادی کی بات چیت طے کی لیکن ہر بار انہوں نے شادی سے انکار ہی کیا اس طرح اپنی زندگی کے اسی سال انہوں نے کنوارے پن کے سلگتے ہوئے لمحوں کے نظر کر دیے

ان کی زندگی کو قریب سے دیکھنے والا ایک بوڑھا مزدور شکوا تھا جس کی ساری عمر یہیں گزری تھی جہاں نانی اماں اپنی دواؤں اور دعاؤں کے لیے شاہ صاحب کے محلے میں مشہور تھیں وہیں بستی کے ایک چھوٹے سے حلقے میں کافی بدنام بھی تھیں

خاص طور پر بڈھے شکوا کے بیٹے دلدو کو نانی اماں کے نام سے ایک چڑ سی تھی جب شکوا کی آنکھوں کی پتلیوں پر ایک پردہ آ گیا تو ایک دن اس نے نانی اماں سے کہا ـــ کہ بڈھے مزدور اس کی آنکھوں کی جوت بجھتی جا رہی ہے اس لیے وہ اس کے لیے کچھ کریں

نانی اماں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شکوا کی آنکھوں کو کئی بار دیکھا پھر کئی دنوں تک وہ یوں ہی شکوا کی آنکھوں کا معائنہ کرتی رہیں

پھر سلسلہ آخر الامر میں کہا کہ وہ شاہ صاحب کی دعاؤں کی برکت سے ایک ایسی دوا تیار کر سکیں گی جس سے اس کی آنکھیں جلد ٹھیک ہو جائیں گی

اس بارے میں دلدو نے اپنے باپ سے اختلاف بھی کیا کہ وہ بجائے نانی اماں کو اپنی آنکھیں دکھانے کے شہر کے خیراتی ہسپتال میں جائے لیکن شکوا نے خرچ بڑھنے کے خوف سے نانی اماں ہی کو ترجیح دی اس کے خاندان میں کسی نے بھی چشمہ لگایا تھا

باپ کے اس بوسیدہ استدلال پر اس کے نوجوان بیٹے دلدو نے اسے کافی دیر تک سمجھایا بھی کہ وہ اپنا خیال ترک کر دے مبادا کوئی پیسہ ہیں پھر ایسی صورت میں جب کہ بینائی خراب ہو لیکن بوڑھے نے ٹال دیا ـــ

پھر نانی اماں نے کئی دنوں کی عرق ریزی کے بعد شکوا کے لیے دوا تیار کی جس کے استعمال کے بعد شکوا نے اپنی آنکھیں خراب کر لیں

شکوا نے نانی اماں کی اس بھیانک غلطی کو بھی شاہ صاحب کی مرضی پر محمول کر کے چپ سادھ لی

لیکن دلدو نے کئی دنوں تک نانی اماں کو آڑے ہاتھوں لیا

وہ شاہ صاحب کے محلے میں بسنے والی حد سے زیادہ خطرناک اس بوڑھیا کو سمجھتا تھا جس کے کچے اعتقاد نے محلے کے سارے لوگوں پر خراب اثرات مرتب کیے تھے

کبھی کبھی تو وہ مرحوم شاہ صاحب قبلہ کی شان میں بھی گستاخی کر جاتا ایسے وقت میں نانی ماں کے غصے کا پارہ ایک دم چڑھ جاتا۔ اور وہ گھنٹوں بیٹھ کے بعد کاجتی ہوئی دلدو کی بندی کی ضدی کر ڈالتیں

وہ شاہ صاحب تجھے بھسم کرے دسویں جماعت کیا پڑھا ہے کہ بس اپنے آپ کو بھول گیا ہے خدا تجھے اپنے باپ کی طرح

آنکھیں کھونا نصیب کرے۔

نانی ماں کو غصے میں یہ تک یاد نہیں ہوتا کہ سکھو کی اندھی آنکھوں کا کارن وہ خود تھیں

ونود بھی چپ رہنے والا ان میں تھوڑا ہی تھا۔ اس نے نانی کے بڑھاپے کی طرح بڑھیا پر تیزی سے کٹیلے جملوں کی بوچھار شروع کر دی جس سے نانی ماں کچھ دیر تک تو سٹپٹا کر رہ گئیں لیکن اس کے چلے جانے کے بعد گھنٹوں تنہا ہی اس میں بڑبڑاتی رہیں۔

کسی وقت شاہ صاحب کے محلے میں لوگوں کی توجہ کا مرکز نانی ماں ہی تھیں اور اس کے بعد اگر کوئی شئے تھی تو وہ نالی بدبو تھی جس کی سڑاند میں ان گنت طرح کی بیماریاں پرورش پاتے تھے

لیکن پچھلے دنوں جب سے ونود نے شاہ صاحب کے محلے کے چودھری ایک لمبے بالوں والے سانولے سلونے نوجوان سے ملاقات بڑھالی تھی تب سے شاہ صاحب کے محلے میں رہنے والے اس کی شخصیت نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ نانی ماں کو اس بات کا احساس آہستہ آہستہ ہونے لگا تھا۔ وہ شاہ صاحب کے محلے کی ایک طرح سے چودھرائن تھیں اور انھیں اس بات کا فخر تھا کہ محلے کے لوگ انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں

بات بھی کچھ ایسی ہی تھی کون ایسا گھرانا تھا جو نانی ماں کو جانتا ہو۔ ہر آدمی کی وہ نانی ماں تھیں ۔ ہوتیں بھی کیوں نہیں انھوں نے کئی ایسے نازک وقتوں میں خود فاقے کر کے محلے کے کئی بے بس لوگوں کو مدتوں کھانا کھلایا تھا

محلے کے سورگباشی ہونے پر نانی ماں ہی نے اس کے کریا کرم کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھایا تھا۔ ان کی بے لوث محبت کے قصے شاہ صاحب کے محلے میں کافی مشہور تھے۔ ونود تو نانی ماں کے سامنے کا لونڈا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ محلے کے چند چھچھورے لونڈوں کو لے کر جھتہ چلنے لگا جس کی وجہ سے ایک چھوٹا سا حلقہ نانی ماں کی دسترس سے باہر آ گیا تھا

جب اندھے سکھو کی ننھی بچی کو ٹائیفائیڈ نے آ دبوچا تو نانی ماں اپنے سر خیال کے کہ وہ بستر میں ونود کی بہن ہوتی ہے اس کے گھر جا کر مزاج پرسی کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ نانی ماں نے سکھو کی ننھی بچی کے گلے کو اپنے ہاتھوں سے پہلے دیکھا پھر بٹوے سے دوائی نکالی ——

"بس نانی ماں تم اپنی دوائی رہنے دو —— کیا تم میری بہن کو مار ڈالنا چاہتی ہو" ونود چیخ اٹھا۔ ونود کی گرج سن کر نانی ماں ایک لمحے کے لئے کانپ گئیں پھر شعلے کی طرح لپک کر ونود کی شان میں صلواتیں سنائیں

"کل کے چھوکرے تو مجھے سمجھاتا ہے کہ سکھو کی بچی میری بچی نہیں"

"ارے ملوے سکھو۔ چپ کیوں کھڑا ہے۔ کیا تو بھی اپنے سپوت کی ہی گائے گا"

سکھو دیوار سے لگ کر چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس نے زبان کو ذرا بھی جنبش نہ دی

"کیا تیرا بھی مجھ پر سے اعتبار اٹھ گیا"۔ نانی ماں سوریلے کہے انداز میں چیخ اٹھیں ۔ لیکن اندھا سکھو اسی طرح اسی جگہ کھڑا رہا۔ نانی ماں ٹک ٹک لکڑی ٹیکتی ہوئی غصے میں باہر چلی گئیں۔ نانی ماں کی چال میں یکایک مردنی سی آ گئی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ گھر پہنچنے سے پہلے ہی بدر رو میں گر کر مر جائیں گی

نانی ماں کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا جس سے انھیں کافی ذہنی تکلیف پہنچی تھی۔

وہ کئی دنوں تک گھر سے باہر ہی نہ نکلیں۔ محلے کے بڑے بوڑھے لوگوں نے بہتیرا سمجھایا کہ وہ اتنی معمولی سی بات کو بھول جائیں لیکن وہ منے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔

پھر دھیرے دھیرے وہ محلے کے مختلف مکانوں میں جانے لگیں۔ نانی ماں کی عزت میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ پھر بھی

[illegible] طرح ان کی آؤ بھگت ہوتی رہی

لیکن نیم شعوری طور پر انھیں اس بات کا احساس ہوتا جا رہا تھا کہ آہستہ آہستہ ان کی توقیر میں کمی ہوتی جا رہی ہے

کبھی کبھار نانی ماں کے کانوں تک سحری کی علالت کی خبریں پہنچ ہی جاتیں لیکن وہ فوراً ہی گفتگو کا رخ دوسری طرف پھیر دیتیں جیسے ٹھکوا کی بیٹی بھولے سے انھیں سروکار ہی نہ ہو

لیکن پچھلے چند دنوں میں دو ایک ایسی باتوں کی خبریت ضرور دریافت کر آئیں

جب سحری کو خیراتی ہسپتال کے کسی ڈاکٹر نے ٹی بی بتائی تو محلے کے بعض بوڑھے لوگوں نے ٹھکوا کو مشورہ دیا کہ وہ فوراً نانی ماں کے ہاں رجوع ہو لیکن ٹھکوا نے اس مشورے کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں جب ٹھکوا نے ان کی ساری باتیں ان سنی کر دیں تو وہ بوکھلا کر چلے گئے ٹھکوا سے انھیں کچھ کہنے کی اس لیے بھی جرات نہ ہوئی کہ وہ نانی ماں کے علاج کے طفیل کامیاب ہو چکا تھا

نانی ماں کے کانوں تک کبھی کبھار یہ خبریں رینگتی ہوئی پہنچ جاتیں تو وہ ایک سانس چڑھا کر مکان کی دہلیز سے اٹھ کر باہر آ بیٹھتیں اور گھنٹوں دھونکنی کی طرح دھونکتی رہتیں

اندھیرے میں نانی ماں کا پوپلا چہرہ کسی خوفناک جانور کی طرح دکھائی دیتا

وہ رات میں بہت کم سونے کی عادی تھیں ایک آدھ گھنٹہ آنکھ سو لیں تو بہت ہوا

شاہ صاحب کے محلے کے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ رات میں عام لوگوں کی خیر و برکت کے لیے دعائیں کرتی ہیں

یہ بات کہاں تک سچ تھی اس بات میں کچھ نانی ماں ہی بتا سکتی تھیں یا وہ لوگ جو نانی ماں کو شاہ صاحب قبلہ کا جانشین سمجھتے تھے اور اگر کوئی دوسرا نانی ماں کی شب بیداری کا سبب پوچھتا تو وہ یہی کہتا کہ کھانسی کے باعث وہ سونے سے مجبور ہیں

پھر ایک دن شاہ صاحب کے محلے میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ ٹھکوا کی جوان بیٹی سحری پچھلی رات مر گئی ——— اور ٹھکوا اس کے غم میں پاگل ہوا جا رہا ہے

جب نانی ماں نے محلے کے ایک بوڑھے سے یہ خبر سنی تو وہ چمگادڑ کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی سامنے پڑی ہوئی لوہے کی سلاخ سے مرغیوں پر کچھ اس طرح ایک طور پر حملہ آور ہونے لگیں کہ لوگ ڈر کر سہم گئے

بعضوں نے خیال کیا کہ نانی ماں کا دماغ چل گیا ہے

دو لڑکیاں سسکتی ہوئی آہستہ آہستہ ٹھکوا کے گھر گئیں اسے لپٹا کر روتی رہیں ٹھکوا کے گھر کی لوگوں سے لے سحری کے مردہ جسد کو چھوا اور گھنٹوں پھوٹ پھوٹ کر روتی رہیں

ٹھکوا بت کی طرح کونے میں ساکت دم بخود کھڑا رہا

دوسرے دن شاہ صاحب کے محلے کے لوگوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ ٹھکوا کی بیٹی سحری اس لیے مر گئی کہ ٹھکوا اور اس نے نانی ماں کی بے حرمتی کی تھی ———

اور پھر ایک بار نانی ماں کی عزت شاہ صاحب کے محلے کے ایک مخصوص حلقے میں گھٹ گئی تھی بڑھنے لگی ———

اور تقریباً سبھی لوگ سامنے بہنے والی بدرو کے کیڑے پانی مچھروں کو اپنے جسموں سے لپٹائے نانی ماں کی دواؤں کے محتاج دکھائی دینے لگے

کبھی کبھار میونسپلٹی کے کسی آفیسر کی سواری شاہ صاحب کی طرف سے شاہ صاحب کے محلے میں آ نکلتی تو میونسپلٹی کے ہوشیار جوان خطرہ کی گھنٹی سنتے ہی محلے کی گندی نالیوں کو صاف ستھرا کرتے

نانی ماں کی دعاؤں اور روایتوں کے اثر سے شاہ صاحب کے محلہ والوں پر اچھا اثر تو ہوا لیکن بدرو کی سٹرانڈ کا نانی ماں علاج نہ کر سکیں جیسے نانی ماں کی لمبی لمبی دعائیں بدرو کی سٹرانڈ میں ڈوب کر رہ گئی ہوں

ادھر نانی ماں نے ایک نیا شوق پیدا کر لیا تھا

ایک خوبصورت سا سفید سا بلی کا بچہ جانے ان کے ہاں کہاں سے آ گیا تھا جس کے ساتھ نانی ماں دن بھر بچوں کی طرح کھیلا کرتی تھیں اسے پیار سے دودھ پلاتیں۔ اس کی ننھی سی دم کو کھینچے ہوئے کبھی کبھار اسے ساتھ بھی پڑتیں

نانی ماں کی ان عجیب و غریب حرکتوں کو دیکھ کر بعض لوگ سوچتے رہ جاتے اور بعض یہی کہتے کہ نانی ماں کی ہر بات، ہر حرکت کبھی مصلحت سے خالی نہیں ہوتی

کبھی کبھار نانی ماں کی گھر کی چوکھٹ کو پھلانگ کر بلی کا بچہ باہر چلا جاتا وہ چیخ اٹھتیں اور راستہ چلنے والا کوئی بھی شخص اسے دوڑ کر پکڑ لاتا

آج کل وہ ایک پل بھی بلی کے خوبصورت بچے کے بغیر باہر نکلتی نہ تھیں

اس طرف ونود نے بھی بدرو کی سٹرانڈ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور کرنے کی ٹھان لی تھی

اس نے محلے کے چند پڑھے لکھے نوجوانوں کو لے کر اپنی سرگرمی تیز کر دی تھی

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود نانی ماں کی شخصیت کے آگے ونود کی شخصیت شاہ صاحب کے محلہ والوں کی نظر میں اونچی نہ ہو سکی یا یوں کہیے نانی ماں ایک چٹان تھیں جس کے آگے ونود کی حیثیت اس تنکے کی سی تھی جو چٹان کے آگے ہمیشہ سرنگوں رہتا ہے

نانی ماں اپنی ذات میں سمندر تھیں جب سے انھوں نے بلی کے بچے کو پال لیا تھا۔ تب سے وہ اور بھی زیادہ سمندر اور پُراسرار دکھائی دے رہی تھیں

دن تیزی سے گذرنے لگے اور ایک بار پھر شاہ صاحب کے محلہ میں ملیریا زور پکڑ گیا۔ اور لوگ ایک ایک کر کے احتجاجاً دوسرے محلوں میں منتقل ہونے لگے

نانی ماں نے کمر کس لی انھیں بستی سے لوگوں کو اس طرح جاتے دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا

شاہ صاحب کے محلے کے لوگ ملیریا کے خوف سے بھاگ جائیں!

یہ وہ کسی حال برداشت کرنے کو تیار نہ تھیں بھلا ایسی صورت میں جب کہ ان کی سانس کی ڈور ٹوٹی نہ تھی

نانی ماں نے پھر ایک بار اپنے آپ کو محلے کے لوگوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا وہ دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھتی رہیں ——

وہ تاریک راتوں میں بھی محلے کے ہر گھر کا دروازہ کھٹکھٹا آتیں لوگوں نے نانی ماں کی ضعیف العمری کا لحاظ کرتے ہوئے انھیں منع بھی کیا کہ وہ تاریک راتوں میں گھر سے نہ نکلیں لیکن وہ عام بوڑھی عورتوں کی طرح نازک نہ تھیں، جو چھوتے ہی مرجھا جاتی ہیں۔

وہ کافی عمر ہونے کے باوجود اس قابل تھیں کہ ان پر سے کئی جوان عورتیں قربان کی جائیں۔

جب شاہ صاحب کے محلہ میں خیراتی ہسپتال کے نوجوان ڈاکٹر کو سوٹ بوٹ پہنے ونود کے ساتھ گھومتے پھرتے دیکھا تو انھیں پھر ایک بار غصہ آ گیا۔ نانی ماں کو پھر ایک بار محسوس ہوا جیسے ونود ڈاکٹر کے ساتھ مل کر ان کی تضحیک کر رہا ہے۔

وہ تن تنہا اپنے وجود کو شاہ صاحب کے محلے کے لیے کافی سمجھتی تھیں۔ اس میں نانی ماں کی خوش فہمی سے زیادہ لوگوں کی اس

اس کے پیچھے اندھی ضعیف الاعتقادی کا زیادہ دخل تھا جس نے نانی اماں کا ابتدا ہی سے دماغ خراب کر دیا تھا
شاہ صاحب کے محلے کے بے ترتیب مٹی کے مکانات رات کی تاریکی میں بھوتوں کے غول کے مانند دکھائی دے رہے تھے ایسے
گھٹا ٹوپ اندھیرے میں طرح طرح کی بیماریوں کے کراہنے کی آوازیں دہشت سی ہوتی تھی

رات کی بھیانک تاریکی میں نانی اماں کی لکڑی کی ٹھک ٹھک کی آواز موت کے فرشتے کی چاپ کی طرح معلوم پڑتی تھی
آگے آگے نانی اماں ہوتی پیچھے پیچھے بلی کا خوبصورت بچہ

نانی اماں دن بدن پراسرار ہوتی جا رہی تھیں شاہ صاحب کے محلے کے بعض لوگ تو نانی اماں کو رات میں آوارہ
گھومتے دیکھ کر ڈر سے جاتے تھے

نانی اماں کی لاٹھی کی ٹھک ٹھک کی آواز اندھیرے کو چیرتی ہوئی دور دور تک سنائی دیتی تھی لکڑی کی ٹھک ٹھک کی آواز
کے ساتھ ہی شاہ صاحب کے محلے کے لوگ سمجھ جاتے کہ نانی اماں تشریف لا رہی ہیں

پھر ایک گہری کالی رات کو جب کہ سردی کافی بڑھ گئی تھی شاہ صاحب کے محلے کے لوگوں نے نانی اماں کو منے ——
منے پکارتے ہوئے سنا

گھپ اندھیرے میں نانی اماں کی آواز کے ساتھ لکڑی کی ٹھک ٹھک سے ساری فضا ہیبت ناک بن گئی تھی
نانی اماں مدھم آواز میں منے کو پکارتی جا رہی تھیں
منے ———— منے ———— منے ————
پھر آہستہ آہستہ نانی اماں کی آواز فضا میں تحلیل ہوتی ہوئی ڈوب گئی

دوسرے دن نانی اماں کو لوگوں نے مدرسہ میں گرا ہوا پایا نانی اماں کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور ان کی آغوش
میں بلی کا خوبصورت بچہ مرا پڑا تھا!!!

واجدہ تبسم

ایک ہی منزل

اولگا ان سب میں بڑی تھی ـــ سب ندما اس سے ڈرتی تھی۔ اس وقت وہ ندی کے کنارے ایک اونچے سے پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سر کے بال ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے جو اس بات کا پتہ دے رہے تھے کہ وہ بُری طرح برہم ہے۔ ایک بار اسے غصہ میں بال بکھرائے دیکھ کر تاشا نے پوچھا تھا کہ "تم نے یہ بال کیوں کھلے چھوڑ رکھے ہیں۔" تو اولگا بولی تھی۔
"ایسا کرنے سے مجھے تھوڑا بہت سکون مل جاتا ہے ورنہ غصہ میں تو میں اپنا گلا گھونٹنے سے بھی نہ چوکوں"ـــ

آج پھر اولگا کے بال کھلے ہوئے تھے ـــ تاشا، ندما اور املی پاس پاس بیٹھی تھیں ـــ ایکدم اولگا چیخ اٹھی۔
"شیطان کی اولاد ـــ ہمیں بدنام کرتا ہے"ـــ

"تم کس کے بارے میں کہہ رہی ہو"ـــ؟ ندما نے ندی میں کنکر پھینکتے ہوئے پوچھا ـــ

"اسی کے بارے میں ـــ اولگا تیزی سے بولی ـــ جو میرے بچے کا باپ بنے گا"ـــ!

"سچ ـ سچ ـ سچ"ـــ ماں کی اور بچے کی بیچ سمجھے بوجھے بغیر ندما نے اظہار تاسف شروع کر دیا ـــ تمہیں اپنے شوہر کے متعلق ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں ـــ وہ بیچارہ تمہیں کتنا پیار کرتا ہے۔ اگر میرا کوئی شوہر ہوتا اور ـــ

"بس ـــ بس" اولگا نے اس کی بات کاٹ دی ـــ اگر تمہارا کوئی شوہر ہوتا تو بھی تم یہی کہتیں ـــ تمہیں معلوم ہے وہ کیا کہتا ہے ـــ؟ وہ کہتا ہے عورت کبھی سچا پیار نہیں کرتی۔ عورت بے وفا ہوتی ہے اور یہ کہ مرد ہمیشہ سچی محبت کرتا ہے یہ تو عورت ہی ہے جو بے وفائی کرتی ہے ـــ کہتا ہے میں نے آج تک کوئی ایسا مرد نہیں دیکھا جس نے پیار میں لغزش کی ہو ـــ وہ اپنی ہی مثال دیتا ہے ـــ کہتا ہے یہ تو ممکن ہے کہ میں کسی کے ساتھ آنکھ لڑا بیٹھوں مگر وہ خود مجھ سے اتنی شدید محبت کرتا ہے کہ کسی دوسری عورت کا خیال تک بھی دل میں نہیں لا سکتا ـــ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ عورت . . . .

ایلی جو اب تک چپ چاپ بیٹھی تھی اس کی بات کاٹ کر بول اٹھی ـــ

"اور تم اتنا سب کچھ سن کر بھی یوں چپ بیٹھی رہیں"ـــ؟

اولگا پھر ہنسی ـــ "تو پھر میں غصہ کس لئے ہوں"ـــ؟

"غصہ سے بات نہیں بنتی ـــ تم اسے قائل کریں تو ایک بات بھی تھی"ـــ

"میں اس سے بہت لڑتی رہی ـــ آخر میں میں نے یہی کہا تھا کہ میں تمہیں ایک نہ ایک دن قائل کر کے چھوڑوں گی ـــ ہنسی اڑانے کے سے انداز میں بول اٹھا تھا ـــ "مر تو نہ جاؤ گی"ـــ میں اس کی ناک کاٹ دوں گی بخت ـ شیطان ـــ پاگل جوہا ـــ ہونہہ ـــ "دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک محبت کرنے والا شخص بیوی کی طرف سے پھر جائے ـــ مگر یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ با وفا بیوی مرد کا گھر چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہو ـــ میں اسے کبھی نہ کبھی تین مہینے کے اندر اندر تمہیں ثبوت کے ساتھ قائل کر دوں گی ـــ اوہ آسمانی باپ ـــ اولگا نے اپنے پیٹ پہ اپنا گورا ہاتھ رکھ لیا ـــ "محبت تو مجھ سے اتنی شدید کرتا ہے مگر کس قدر لڑتا ہے"

"محبت دراصل لڑائی جھگڑوں سے ہی مضبوط ہوتی ہے جان" ___ نتاشا کے بعد بعد بات دکھائی دیتے ___ "تم بہت بڑی آئی جب ڈالی" ___ اولگا نے نتاشا کی طرف کرلیا۔ "تو کیا تمہیں اس کا یقین ہے کہ وہ تم سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتا ہے" ___ "تو کیا میں اس سے محبت نہیں کرتی" اولگا غصے سے چلائی۔

"تم بھی کرتی ہو مگر دیوانگی کی حد تک نہیں" ___ اور نتاشا مسکرا کر ہنسنے لگی۔ "چھوٹی ___ تجھے معلوم ہے ہماری تو صرف ہوئی ہے ___ اور محبت پہلے مجھی کو ہوئی تھی" ___

"محبت پہلے ہوئی تھی اسی لئے لڑائی بھی۔ تو ہی پہلے کرلیے ___ یہ مانتی ہی بات" ___

"نہیں یہ بات نہیں ___ میں اسے دل سے چاہتی ہوں اگر اسے ذرا سا بخار بھی آجائے تو میں رات آنکھوں میں کاٹ دیتی ہوں ___ میں سچ کہتی ہوں مجھے کھانا پینا کچھ اچھا نہیں لگتا ___ مگر جب وہ دوسری لڑکیوں سے اچھی لگتا ہے تو میں برداشت نہیں کرسکتی" ___

"اور یہی تیری محبت کی کمزوری ہے" نتاشا نے لقمہ دیا ___

"اور یہی تیری محبت کی کمزوری ہے" ___ اولگا بالکل نتاشا کے لہجے میں چڑچڑائی ___ "جیسے تو بڑی محبت کی پکی ہے" نتاشا طرح پیار سے مسکرائی" ___ "ہاں محبت ہی کس نے کی ہے ___ ؟ ایسا تو دعویٰ ہے کہ اپنے کو کسی سے محبت ہو ہی نہیں سکتی ___ کیونکہ دیوتا بس ایک ہی جگہ تو آکے ہارے ہیں" ___

"اگر ہوگئی تو بیٹھ کے روتی رہنا عمر بھر" ___ اولگا کوسنے لگی ___ "مگر ہونے ہی کیوں لگی ___ بغداد کا خوب رو شہزادہ بھی ایسا جادو نہیں چلا سکتا۔ اصل بات یہ ہے جان ___ یہ دل جو ہے نا" ___ وہ اپنے دل کے قریب اپنی سفید انگلی لے گئی ___ "بڑا بیم ہے" ___ "اور وہ ایکدم ہنس پڑی ___

اولگا جل گئی ___ "اطلس" اور مدہا کی طرف دیکھ کر بولی ___ "سنتی ہو اس کی باتیں ___ اسے محبت کوئی چیز ہی نہیں لگتی" ___ !

"آپ کیا کہوں میرا خود یہی حال ہے" ___ اطلس خاموشی سے بولی ___ مدہا بڑے رحم سے بولی ___ "یہ محبت کیا ہے میں آج تک نہیں سمجھ سکی ___ نہ معلوم اس کی اصلیت ہے کیا" ___ ؟

اولگا کباب ہوگئی ___ "تم سبھوں نے دراصل اس مسئلے کا فیصلہ کرلیا ہے یا میرا مذاق اڑانے پر تل گئی ہو" ___

"میں نے مذاق کب کیا" ___ نتاشا بول اٹھی ___ "یہ تو میرے ذاتی حالات ہیں" ___ "اور میں نے کب مذاق کیا" ___ اطلس بول رہی تھی ___ "اصل میں میرا مرد کی محبت پر اعتبار رہا ہی نہیں ___ محبت کرنا ہی ٹھہرا تو جانوروں سے ہی کیوں نہ کرلی جائے" ___

"میں اور تم سے مذاق کروں ___ ؟" مدہا، اولگا کے غصے سے واقف تھی ___ "میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ یہ ڈھکوسلہ ہے ___ اور اگر کبھی کسی سے محبت ہو ہی گئی تو دیکھا جائے گا" ___

"میں تم سب کو بری طرح پیٹوں گی حرام زادیو ___" اولگا چلائی ___ "تمہیں یاد ہے اسکول کے زمانے میں میں مانیٹر تھی اور تمہیں ذرا سی شرارت کرنے پر کھڑا بینچ پر لگایا کرتی تھی ___ وہ زمانہ بیت گیا تو کیا ہوا ___ میں آج بھی تمہیں مار سکتی ہوں اور کل بھی" ___

"تم مار سکتی ہو جان" ___ نتاشا اولگا سے ذرا کم ہی ڈرتی تھی ___ "مگر اب غصہ چھوڑ دو ___ ہم اصل بات تو بھولی جا رہی ہیں ___ پھر تمہارے دوست نے کیا کیا ___ ؟"

اولگا نے جیو نے موٹے سر کو پیر ہاتھ سے اٹھایا ــــ "اور کیا کہا؟ بس آج کے یہی کہتا تھا کہ عورت بے وفا ہوتی ہے اور مرد باوفا ــــ میں نے بھی اسے نیچا دکھانے کی ٹھان لی ہے" ــــ وہ بڑے عزم سے مسکرائی ــــ

"ہاں ــــ اور بڑی اچھی ترکیب بھی سوچ لی ہے" ــــ

"وہ کیا" ــــ؟ ساشا اس کے بالکل قریب کھسک آئی ــــ

میں بھی سامنے آ گئی ــــ کچھ بھی ہو بہرحال ایک مرد کو نیچا دکھانے کے سامان تو ہو رہے تھے ــــ

"میں بھی تو سنوں آخر" ــــ مدھا تینوں کے بیچ گھس گئی ــــ

اولگا مسکرائی ــــ "ہم چاروں، چار شادی شدہ مردوں کو خط لکھیں گی ــ اور ایسے مردوں کو جو اپنی بیویوں کو بے پناہ پیار کرتے ہیں ــــ اور تم ایلن مجھے کیا دیکھ رہی ہو تمہیں بھی لکھنا ہوگا ــــ جنس سے بھرپور خط ــ اور نتاشا تم مسٹر نیکی کو خط لکھو گی ــــ سمجھیں" ــــ؟

"میرے مرد کو" ــــ؟ ساشا سینے پر دو ہتڑ مار کر چلائی" ــــ آسمانی باپ مجھ پر رحم کرے" ــــ

اولگا ہنسی ــــ "مگر یہ کون بڑی بات ہوتی ہے ــــ بس ہمارا کام اتنا ہی ہوگا کہ مسلسل پیار بھرے خطوط انہیں لکھیں ــــ حتیٰ کہ یہ حد آ جائے کہ وہ پیار کی گرمی سے پگھل اٹھیں ــــ یہاں آ کر تکمیل ختم ــــ اور پھر میں وہ سارے خطوط نیکی کو سناؤں گی ــــ اور اس کی ناک پکڑ کر کہوں گی کہ دیکھو یہ تمہارے اور تمہارے ان باوفا مردوں کے خطوط جب اپنی بیویوں سے بے پناہ پیار کرتے ہوئے بھی کسی کی زلفوں کے اسیر ہو سکتے ہیں ــــ؟

یوں کیسی ترکیب ہے ــــ؟ اولگا نے داد طلب نظروں سے سب کی طرف دیکھا ــــ

"اور اگر وہ یہ اعتراض کرے کہ جس طرح یہ خط لکھے گئے تھے جواب بھی اسی طرح کے آئے ہیں تب کیا جواب ہوگا تمہارا" ــــ ایلن پوچھ رہی تھی ــــ

اولگا جیسے اس کے بھول پن پر مسکرائی ــــ "تمہارے اس سوال کا جواب بھی اسی وقت مل جائے گا جب وہ اتفاقاً نیکی ایسا سوال کرے ــــ مرد بہت بے وقوف اور بھولا جانور ہوتا ہے اس کا اندازہ تمہیں نہیں ــــ مجھے ہے ــــ بہرحال ــــ یہ سوچو کہ خط کس کس کو لکھے جائیں" ــــ؟

مدھا اکتا کر بولی ــــ "یہ سب بیکار کے جھگڑے کیوں اٹھا رہی ہو تم! یہ چار چار مردوں کو خط لکھنے کیا ضروری ہیں" ــــ "تمہیں یاد ہے اسکول میں، مسٹر ایک سوال سمجھانے چار چار مثالیں دیا کرتی تھی ــــ میں بھی اسے قائل کرنے کا پورا اہتمام کر رہی ہوں ــــ ایک کو جھٹلانے گا ــــ دو کو جھٹلائے گا مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ سبھی کو جھٹلانے بیٹھ جائے"!

اولگا اپنی عقل مندی پر خود ہی مسکرائی ــــ "ایلن تمہارے گھر کے سامنے وہ جو سانولا جوڑا رہتا ہے کیا نام ہے ــ مسٹر اور مسز گریگ ــــ تو تم مسٹر گریگ کو خط لکھو گی ــــ اور مدھا تم انکل جیم کو خط لکھو گی ــــ اس کی شادی کو دو سال ہوئے ہیں آنٹی سے اتنی محبت کرتا ہے کہ ــــ" وہ میز پر ہاتھ رکھ کر بڑے آرام سے بولی ــــ "شادی کو اتنے دن ہو گئے مگر ابھی تک وہ ایک ہی بستر میں گھس کر سوتے ہیں ــــ" اور وہ زور سے ہنس پڑی ــــ

"گریگ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا ہے کیا" ــــ ایلن نے پوچھا ــــ

"ارے محبت کیا کرتا ہے کہ بیچاری کو جینے نہیں دیتا" ــــ اور وہ دوبارہ زور سے ہنس پڑی ــــ

"مگر یہ تو بتاؤ تم خود کسے خط لکھو گی" ــــ نتاشا نے یک لخت سوال کر دیا ــــ

"میں ــــ میں ان لمبے بالوں والے شاعر گرا ہم کو خط لکھوں گی جس کی شاعری ہی لوسی کے گرد گھومتی ہے

صبا

دس سال سے وہ لوسی کو جانتا ہے — دس سال سے وہ اس کی شاعری میں اس کی محبوبہ بنی رہی ہے — اور اب
کچھ ہی دن ہوئے اس نے لوسی سے شادی کر لی ہے — لوگ کہتے ہیں لوسی کو پا کر وہ دنیا مافیہا کو بھول بیٹھا ہے اور مزے کی
بات یہ کہ ایڈیٹروں کی فرمائش پر کہانی نظم اور اشعار کے لئے بھی قلم توڑ کر رکھ دیا ہے —"

مگر خطوں میں ہم کیسی کہانی — ناتاشا عشق عاشقی سے ابھی بالکل بے بہرہ تھی —

سبھی خط ایک ہی نوعیت کے ہوا کریں گے — پہلے پہل تو دبے دبے الفاظ میں محبت کا ذکر ہوگا — اس کے بعد
ایک دم اعتماد آ گیا — پھر اور آگے اس طرح ایک دن ایسے خط آئیں گے گویا ان کے بغیر زندگی بیکار ہے — پھر ان کا
ردعمل کیا ہوگا یہ دیکھ کر — فریقین کو قائل کیا جائے گا — اولگا مسکرائی — مگر سنو — شیطان کی اولاد کو
— کہیں سچ مچ ہی محبت کرنے لگ جانا — ورنہ کہانی کی جگہ شکست ہو جائے گی الٹی" —

"تم اپنی خیر مناؤ — یہاں لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں" — ناتاشا اپنی پارسائی پر اتر آئی —

"میں — ؟ میں تو شادی شدہ ہوں — ہم مدتوں ہی سنبھل کر سر اٹھاتا" —

دوسرے اتوار کو جب چار دن مدعا کمارے جمع ہوئیں تو اولگا کا منہ ذرا سوکھ گیا — کسی بھی خط کا جواب نہیں
آیا تھا —

"اتنی جلدی جواب آئیں گے بھی کیسے" — اولگا نے دل کو تسلی دینی چاہی

"واہ — معافی خطوں کے جواب اور کتنے دن لیں گے" —

"بہرحال مایوس نہیں ہونا ہے نہیں — یہ بے وقوف جانور کبھی تو دام میں آئیں گے — اولگا نے سب کو ڈھارس
بندھائی — بس پیسے کی مدت تو بڑی ہے جان — اب تک ایک ایک خط اور لکھ لیں" —!

دو ہفتے سبھی کے جواب آ گئے — مضمون ملتے جلتے سے تھے — یہی کہ "خط پا کر ہنسی بھی آئی تعجب
بھی ہوا — ہم آپ کو کیسے اپنے دل میں جگہ دیں جب کہ وہ پہلے ہی سے کسی کے پیار سے بھرے ہوئے ہیں" —

اولگا بار بار مسکراتی تھی — چلتے چلتے اس نے مدعا سمجھا لگا —

"پاگل ہو جو انہیں اتو سا کے نہ چھوڑا تو اولگا مت کہنا" —

ناتاشا نے خط پھیلایا تو ایک بار تو اولگا بھی چونکی ہو گئی — وہ ہم "گویا کچھ ہفتے گزر گئے تھے اور خطوں کے مضامین
ہر ہفتے بدلتے جا رہے تھے — فریکی نے لکھا تھا — "اور ڈیئر پیاری — دل کو بہت سنبھالتا ہوں مگر تمہاری جانب
کھنچتا ہوا محسوس ہوتا ہے — تم مجھے اسے پیار بھرے خط تو نہ لکھا کرو — مجھے اپنی بیوی پر رحم آتا ہے جو میرے ہی
دم سے جیتی ہے" —

ناتاشا بولی — "اولگا کہیں اسے یہ پتہ نہ چل جائے کہ میں تمہاری ہی دوست ہوں" —

اولگا اپنی دور اندیشی پر مسکرائی — "تمہارا نام اسی لئے تو بدل دیا گیا ہے ڈیئر پیاری" —!

"ارے تمہارے شاعر کا کیا حال ہے" — دفعتاً ناتاشا پوچھ بیٹھی — "ہاں — آں — اچھا ہے —
اولگا نے ہنس کر بولا — پھر کا تقریر سنگوا تا تھا میں نے یوں ہی چلا دیا" —

"اچھا تو یہاں تک نوبت آ گئی ہے" —— ایلس شرارت سے مسکرائی ——

"پھر بھیج دی تم نے" —— ندیا نے پوچھا

"کہہ تو رہی ہوں یوں ہی ٹال دیا" ——

"آگے کیا ارادے ہیں" —— سانتا بولی ——

اورنگا جیسے چونک پڑی —— "ارادے —— ہاں —— ؟ کچھ بھی نہیں —— ارے کچھ بھی کیسے ہیں بس فرنگی لو حائل کریں گے اور کیا —— ؟

ندی کا پانی ڈوبتے سورج کی کرنوں سے سنہری ہو گیا تھا —— اورنگا اپنے بالوں سے کھیلتی، ندی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی ——
"کیوں ندیا —— ؟ میرے بال کیسے ہیں" —— ؟
"تمہارے بال —— ؟ اگر کسی ملک میں سنہری ناگنیں ہوتی ہوں گی تو بس بالکل ویسی ہی ہیں" —— وہ داد طلب انداز سے مسکرائی ——

اورنگا نے اپنے سنہری بالوں کو جھٹکا دیا —— "کیوں کیا میری زلفیں —— یہ سنہری لہراتی لچکتی زلفیں ایسے نہیں معلوم ہوتیں جیسے کسی اکیلی ندی پر شام کے ڈوبتے سورج کی کرنیں تڑپ رہی ہوں" ——

اوہ —— کسی شاعر کے دماغ کے خیالات معلوم ہو رہے ہیں یہ تو" —— سانتا زور سے ہنس پڑی ——
"اور کیا اتنی حسین تشبیہ میرا دماغ سوچ سکتا تھا —— گراہم نے تصویر ہی میں میری تشبیہ ڈھال لی ہے —— میری زلفوں کو اسی نے یہ اعزاز دیا ہے" ——
"آرٹسٹ اچھے ہیں —— آسمانی باپ رحم کرے" —— ایلس شرارت سے مسکرائی —— ندیا بھی مسکرا دی —— سانتا بھی ——

اورنگا ہولے سے مسکرائی —— "جھنا لو —— اپنے دماغوں کو بھٹکنے مت دو —— یہ میں ہوں اورنگا سمجھیں" —— ؟
چلتے چلتے اورنگا نے ندی میں جھانکا" —— سنہری زلفیں —— ؟ ندی پر شام کے ڈوبتے سورج کی کرنیں سی سسکار کر رہ گئی !
"لو بھئی —— فرینکی نے میری تصویر منگوائی ہے ——
"گریگ نے بھی" ——

"اور جم نے بھی" ——
"مگر یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے اورنگا" —— سانتا پریشان سی ہو کر بولی یہ لوگ کیا محبت کے معاملے میں اتنے کچے ہیں —— دل کے معاملے میں، میں سمجھتی ہوں ایسا نہیں ہو سکتا —— مرد واقعی بے وفا ہوتے ہیں تب ہی تو —— اورنگا خط کی سطروں سے ندیا میں کچھ ڈھونڈنے لگی ——
"جم نے لکھا ہے" —— اب تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا تمہارے لیے ہی اب تک جی رہا تھا —— دل نے تمہاری کتنی ہی بن مالی ہیں کیا اپنی ایک تصویر نہ بھیجو گی" —— ندیا مسکرائی
"مسٹر گریگ لکھتے ہیں" —— مسز گریگ اب ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگی —— مجھے ایسا لگتا ہے یہ [illegible]

مگر تھا جو فیصلے سے کبھی احمد نے اپنا لیا ــــ اب بس کرایعلاؐ کو ہٹانا ہی ہوگا ــــ امن یہ آنکھیں مٹکا رہی تھی ــــ
"میری آنکھیں کیسی ہیں" ــــ ایکدم اونگا پوچھ بیٹھی ــــ "بڑی خوبصورت ــــ نیلی نیلی سی ہیں"
جیسے ــــ ندیا مسکرائی ــــ کہ میری آنکھیں دیکھ کر بس ــــ گہری گہری اور نیلی نیلی ایسی جھیلوں کا خیال بس آتا
جنہیں دیکھ کر ہی پیاسے کی روح سیراب ہو جائے ــــ!
"یہ تشبیہ تم کی ہوگی ــــ تصور میں اس نے ــــ لگتا ہے ــــ بڑی پیاری شکل ڈھال لی ہے سب ہی تو ایسے
رنگیلے خط بھیجنے لگا ہے" ــــ امن مسکرائی ــــ "تصور میں نہیں ــــ اونگا سنجیدگی سے بولی ــــ بلکہ میں نے
حقیقتاً میری پیاری شکل دیکھ لی ہے" ــــ
"وہ کیسے" ــــ سب چلا پڑیں ــــ
"میں نے تصویر بھی بھیجی ہے" ــــ اونگا مسکرائی ــــ مگر ایک حرف ردہ ــ یہ پاگل سٹھیا دیو ــــ یہ تو سب
ایک نئی ساتھی اسکیم کے تحت ہو رہا ہے ــــ!
سانا کھوئے ہوئے انداز میں بولی ــــ" اونگا ــــ سراحط لو آج کسی لے پڑھا ہی ہیں ــــ فریکی نے لکھا ہے
ــــ" سوچا ہوں اگر تمہیں مجھ سے واقعی سچی محبت ہے تو میں تمہیں اپنا ہی لوں ــــ میرا پیارا ــــ میری محبت تمہیں نہ سب
کچھ دے گی میں کیا ہم ہے آس ماہ میں ہوگی ــــ آنکھیں بند کر کے جب تمہارے ہی تصور میں لیٹ جاتا ہوں اس وقت کہیں
سے میری بیوی کی آواز آ جاتی ہے تو طبیعت مکدر ہو جاتی ــــ میں تم سے کب مل سکوں گا پیاری ــــ تمہارے بغیر اب
زندگی بیکار معلوم ہوتی ہے" ــــ!
"بولو اونگا ــــ یہی آخری قدم تھا ــــ اور اب میں ماہ کی مدت بھی قریب الختم ہے ــــ کیا جواب دیں ان
بیچاروں کو جھوٹی آس ما مدھولی ہے ــــ سانا بولی ــــ
"جھوٹی آس ــــ" اونگا مدرے حیرت سے بولی ــــ" ہاں جھوٹی آس تو ہے ہی یہ ــــ اچھا کل
ــــ ہنس اگلے ہفتے سب کو خط لکھ دیں گے کہ یہ تو سب مذاق تھا اور فریکی کو قائل کر دوں گی ــــ" کہ دیکھ لو یہ مرد ایسے
ہوتے ہیں تم تو سدا اوروں کو تمام دم لے لیے ــــ اب کہو" ــــ؟
چپکے چپکے اونگا نے ال کھائی یکھا ندی میں اپنے آپ کو دیکھا ــــ
ندی کی طرح مچلتی زلفیں ــــ نیلی نیلی جھیلوں کی طرح آنکھیں ــــ پھولوں کے بوجھ سے ڈولتی شاخ کی طرح بدن
ــــ یہ سب ــــ سب کیا ہے ــــ کیا یہ واقعی میں ہوں" ــــ گرما کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی ــــ

×

اگلے ہفتے اونگا ندی پر پہنچی تو سناٹا ــــ ندیا اور امن بیٹھی ہوئی تھیں ــــ اداس اداس ــــ رنجیدہ سی ــــ
اونگا جاتے ہی مسکرائی ــــ
"لاؤ قلم کاغذ ــــ آج سب کو ایک ہی مضمون کے خط جائیں گے" ــــ
سب ساکت و صامت بیٹھی رہیں ــــ
"ارے سانپ سونگھ گیا کیا" ــــ؟ اونگا نے تانا شا کی ٹھوڑی اونچی کی ــــ
تانا شا کی آنکھیں چھلکنے کو تھیں ــــ "ارے کیا ــــ پاگل چڑھیا؟ رونی کیوں ہے" ــــ؟
تانا شا نے جلدی سے اپنا چہرہ چھڑا لیا ــــ "کچھ بھی تو نہیں" ــــ

"ممیا ــــ ایلین تمہیں کچھ معلوم ہے یہ کیوں رو رہی ہے" ــــ اولگا ان کی طرف پلٹی "ارے تم کیا رو رہی ہو ــــ یہ سب کیا ہے ــــ لو سنو ــــ میں یہ مسودہ سنا کر لاتی ہوں ــــ میرا فرینکا تو بس کٹ کے رہ جائے گا

جناب ــــ

آپ کے نام خطوط ملے ــــ آپ جیسا مخلص مندرجہ صحیح لفظوں میں بے وقوف شاید ہی دنیا بھر میں کوئی ہو ــــ گھر میں بیوی رکھتے ہوئے بھی آپ دوسری لڑکیوں سے عشق لڑا سکتے ہیں اس پر افسوس ہے ــــ اور اس سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ آپ اپنی بیوی پر دل و جان سے فدا تھے ــــ یہ مرد کی بے وفائی کی بہت بڑی مثال ہے ــــ آپ خود اپنے وجود پر لعنت بھیجئے ــــ کیا آپ کو اپنی بیوی یا رسائی کے متعلق کچھ کہنا ہے ــــ ؟ بیچاری عورت ہر زمانے میں نشانہ ستم رہی کہ وہ بے وفا ہوتی ہے ــــ میں نے تو آج تک ایک عورت ایسی نہیں دیکھی جو اپنے محبت کرنے والے شوہر کو چھوڑ کر دوسرے سے محبت کرنے بیٹھ جائے ــــ وہ سارے خط ایک ہی شانی اسکیم کے تحت آپ کو لکھے گئے تھے ــــ انہیں معمول جانیے مگر یہ یاد رکھیے کہ مرد بے وفا ہو سکتا ہے عورت نہیں ــــ"!

ایک دم ناتاشا سسک اٹھی ــــ "اولگا یہ خط پوسٹ نہیں ہوگا" ــــ

"کیوں" ــــ اولگا کی آواز میں حیرت تھی!

"نہیں ــــ میں ــــ" ناتاشا پھوٹ پڑی "میں فریکا سے سچ مچ پیار کرتی ہوں ــــ" اور اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا ــــ "جسم کے بغیر میرا تصور ناممکن ہے" ــــ

"فریک میری نس نس میں سما چکا ہے اولگا ــــ" اور وہ تینوں بری طرح رونے لگیں ــــ

اولگا نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا ــــ

ناتاشا نے اپنا سر اٹھایا اور سسکیاں روک کر بولی ــــ "اولگا تم فریکی کو گراہم کے خطوط بتا کر فاش کر دو اور تم یہ خط گراہم کو پوسٹ کر دو" ــــ

"کیا تم ــــ ؟" اولگا جیسے کہیں دور سے بولی ــــ

"ہاں تم" ــــ گراہم کا پتہ میں لکھے دیتی ہوں ــــ" ؟

"نہیں نہیں ــــ وہ خط غلط ہے ــــ اولگا چلائی ــــ میں نے ایک شادی شدہ عورت دیکھی ہے جو اپنے چہیتے خاوند کو چھوڑ کر دوسرے مرد سے محبت کرنے لگ گئی ــــ جھوٹا خط کیسے پوسٹ کر دوں" ــــ ؟

"وہ کون ہے وہ عورت" ــــ ناتاشا آنسو پونچھ کر بولی

اولگا نے خط توڑ مروڑ کر ندی میں پھینک دیا ــــ اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں ــــ" ناتاشا ــــ وہ سسک رہی تھی ــــ" ناتاشا ــــ وہ عورت ــــ وہ عورت ــــ ناتاشا میں گراہم سے محبت کرتی ہوں ناتاشا" ــــ!

اور اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا ــــ

عزیز قیسی

وہ نہیں بھولتا......

صرف دھڑکن پہ ہے گماں دل کا — ویسا انداز اب کہاں دل کا
کس کی آہٹ سے دھڑکنوں کو لگاؤ — کس کے مرہم کے انتظار میں گھاؤ
کس کے جلوے کی پیاس آنکھوں میں — کس کے آنے کی آس آنکھوں میں
راہ کو کس کے نقش پا کی ہوس — دل زخمی کو کس ادا کی ہوس
گیت کو کس کے روپ کی حسرت — شعر کو کس کے حسن سے نسبت
کس لیے صبح کی دعا کیجے — نور کی آس کر کے کیا کیجے
آفتابوں پہ جی جب آئیں کیا — بارگاہ شفق میں جائیں کیا
کیوں گھٹاؤں سے دل کی بات کہیں — اب کسے گیسوؤں کی رات کہیں

آرزوئے بہار کیا کیجے
شام کا انتظار کیا کیجے

کیا خبر اس کو اس کے جانے سے — ہم کٹے سے ہیں کچھ زمانے سے
مہر بدنام ہو گیا جب سے — ماہ کا جی اُٹھ پڑا جب سے
لب سینے محفلوں سے اٹھتے ہیں — بے پئے میکدوں سے اٹھتے ہیں
دل سے دامن بچائے رہتے ہیں — درد سے منہ چھپائے رہتے ہیں
چاندنی سے نظر چراتے ہیں — ربط مہتاب سے چھپاتے ہیں
ایسے چپ ہیں کہ اپنی گلیوں میں — اپنی گم سم اداس آنکھوں میں
کوئی افسانہ کوئی بات نہیں — جیسے محفوظ کوئی رات نہیں

یاد ہے اس کی منہ چھپانے سے ——— دل کی دھڑکن سے ہم پرائے سے
ایک احساس اس سے چھٹنے کا ——— یوں سحر کارواں میں لٹنے کا
جانے کس وقت جاگ اٹھا ہوگا ——— وہ قیامت کا وقت کیا ہوگا
دل گیتی میں داغ کی صورت ——— محفلوں کے چراغ کی صورت
بے تماشا تبسم کی مانند ——— بے ٹھکانہ نسیم کی مانند
آج تک دربدر ہیں بے منزل ——— ہائے بے کلی حسرت دل
شہر ناز و ادا و نغمہ و نے ——— بزم جام و شراب و شعلہ و مے
عشوہ ہائے فسون و افسانہ ——— غمزہ ہائے جمال جانانہ
شب عصیاں کی زلف آوارہ ——— صبح شعلہ وشاں کی عشق ہرا
مامتا کی نگاہ کا جادو ——— معتقدوں کے حریم کی خوشبو
سانولے کوہسار کا آنگن ——— باہوں کے جھرے ہوئے دامن
ہولے ہالے گھنگھروں کی دہلیزیں ——— مسجدوں مندروں کی دہلیزیں
وضعدار دلبر و دلدار ——— دست طوق آشنا کف آزاد
آہنی بادوں کی دلنوازیں ——— رزم تسخیر لشکر کی للکاریں
برچھیوں کی ہوا سہانی سی ——— نو دمیدہ صبا پرانی سی
بارگاہ رسول و علم و ہنر ——— صد چراغاں دیار فکر و نظر
کس کی کس کی پناہ ڈھونڈی ہے ——— کیسی کیسی نہ راہ ڈھونڈی ہے
کس جگہ پر نہیں نہ دھرنا آئے ——— کس گلی میں نہ سجدہ کر آئے
ایک دو پل کا ہیں کب لیجئے ——— زخم کتنے دعا ہرا کیجئے
کتنے در کھٹکھٹا کے لوٹ آئیں ——— دل وحشی کو کیسے بہلائیں

"وہ نہیں بھولتا جہاں جائیں
ہائے ہم کیا کریں کہاں جائیں" (ناسخ)

رامی معصومہ رضا

تم کون ہو ؟

کون ہو تم کہ مرے کمرے کی ویرانی میں
اس طرح آئی ہو جیسے کہ سحر آتی ہے
نہ کوئی شور، نہ سرگوشی، نہ آہٹ نہ صدا
فصلِ گل آئی ہے بوئے گلِ تر آتی ہے
جیسے بے ساختہ ہونٹوں پہ کوئی گیت آجائے
جیسے دل تک کسی قاتل کی نظر آتی ہے
جیسے چپ چاپ ستاروں کے کنول کھلتے ہیں
جیسے یادوں کی بلا عشق کے سر آتی ہے

ذہن میں جیسے کسی یاد کی کونپل پھوٹے
جیسے امید تمناؤں کو بہلاتی ہے
جیسے اک لمحہ کو چھونے کوئی لمحہ آئے
جیسے وہ نیند جو تنہائی پہ چھا جاتی ہے
جیسے کلیوں کے دریچوں سے گذرتی ہے سحر
جیسے پیغام تبسّم کا صبا لاتی ہے
جیسے کیفیتِ صہبا چلے پیمانے سے
جیسے ساقی کی نگاہوں میں حیا آتی ہے

جیسے بیمار تک آتا ہے مسیحا کا خیال
زرد چہرے نکھر آئے مری دیواروں کے
دل کے زخموں پہ لگا مرہمِ امیدِ سحر
حوصلے بڑھ گئے کچھ اور بھی بیماروں کے
یک بہ یک ساز کی رگ رگ میں لہو دوڑ گیا
مسکرا اٹھا جنوں رقص پہ سیاروں کے
پھر حریفوں کے تصور پہ ہنسی آتی ہے
پھر پیام آتے ہیں زنجیروں کی جھنکاروں کے

•

ہوں میں حیران کہ تم کون ہو کیوں آئی ہو
تم مرے عشق کی محرومی کا افسانہ نہیں
دل کے سنّاٹے کی آواز تو پہچانتا ہوں
تم مرے جسم کی کوئی لغزشِ مستانہ نہیں
کسی سجدے نے تمھیں دیکھ کر انگڑائی نہ لی
تم کوئی کعبہ نہیں، کوئی صنم خانہ نہیں

آؤ آؤ تمھیں پہچان لیا شاعر نے
لاکھ دیوانہ ہوں پر اتنا بھی دیوانہ نہیں

•

تم مرے جسم کی صداقت ہو کوئی اور نہیں
تم مرے عہد کی فطرت ہو کوئی اور نہیں
عشرتِ منزلِ فردا کی حقیقت کی قسم
میرے فردا کی حقیقت ہو کوئی اور نہیں

•

تم جو آئیں تو مری نظموں کے دروازوں سے
کتنے غنچوں کے چٹکنے کی صدا آنے لگی
تم جو آئیں تو مرے کمرے کی ویرانی تک
دلِ گیتی کے دھڑکنے کی صدا آنے لگی

شاذ تمکنت

آب و گل

مجھے یاد پڑتا ہے اِک عمر گذری
لگاوٹ کی شبنم میں لہجہ ڈبو کر
کوئی مجھ کو آواز دیتا تھا اکثر
بلاوے کی معصومیت کے سہارے
میں آہستہ آہستہ پہنچا یہاں تک
بہ ہر سمت انبوہِ آوارگاں تھا
بڑے چاؤ سے میں نے اک اک سے پوچھا
"کہو کیا تمہی نے پکارا تھا مجھ کو
کہو کیا تمہی نے پکارا تھا مجھ کو"
مگر مجھ سے انبوہِ آوارگاں نے
ہراساں ہراساں پریشاں پریشاں
کہا صرف اتنا "نہیں وہ نہیں ہم
ہمیں بھی بُلا کر کوئی چھپ گیا ہے"

حمایت علی شاعر

ان کی جو راہ تھی وہ اُسی پر چلا کیے
ناداں تھے ہم، چلے جو انہیں رہنما کیے

گلچین و گل فروش کی سازش سے بے خبر
ہم اہتمامِ جشنِ بہاراں کیا کیے

اب زحمتِ مزید اٹھانے سے فائدہ
معلوم ہے جو آپ نے وعدے وفا کیے

اک آفتابِ تازہ کے سوزِ فراق میں
کتنے ستارے بجھ گئے، کتنے جلا کیے

اک لغزشِ قدم نے سجھائی تو کوئی راہ
اب غم نہیں جو راہ میں کانٹے ہوا کیے

زہر کا نگار

دل کا دکھ، آنکھ کا نم یاد نہیں
ہم کو کیفیتِ غم یاد نہیں

طاعتِ اہلِ کرم یاد نہیں
کتنے مجبور ہیں ہم یاد نہیں

کام یوں آئی تری سنگدلی
کوئی پتھر کا صنم یاد نہیں

نقش بن بن کے بگڑ جاتے ہیں
کب ترے ساتھ تھے ہم یاد نہیں

یاد ہے درد کا ملنا لیکن
یہ زیادہ ہے کہ کم یاد نہیں

حسن نعیم

شام الم کو یاد رکھ صبحِ طرب کے بعد بھی
سوزِ جنوں سے کام لے منزلِ شب کے بعد بھی

دل میں نہ جانے کیا رہا شل شرارِ آرزو
جوشِ طلب کے وقت بھی ترکِ طلب کے بعد بھی

تجھکو بتائیں کیا صبا ہم نے جلایا کیوں چراغ
آمدِ خور کے باوجود رخصتِ شب کے بعد بھی

شکر کرو کہ مل گیا خواہ سبھوں کے بعد ہی
ملتا ہے ورنہ کسکو جام حسنِ طلب کے بعد بھی

دیکھیں نہ مجھکو اہلِ بزم ایسی نظر سے اے نعیم
آیا ہوں میں تو بارہا بزم میں سب کے بعد بھی

زندگی منتظرِ دردِ تہِ جام نہیں
مئے کشی حق ہے ہمارا، ترا انعام نہیں

سینۂ وقت مرے نور سے روشن ہوگا
مجھکو ان بجھتے چراغوں سے کوئی کام نہیں

کرگیا کام مرا جذبِ نہاں ان کے حضور
گر مجھے چین نہیں ان کو بھی آرام نہیں

فرصتِ غم نہ ہوا گر دوست تو وحشت کی قسم
اک نگاہِ غلط انداز بھی ناکام نہیں

وصل کے نام میں تاثیر ہے تھوڑی ورنہ
قربتِ شمع سے پروانے کو آرام نہیں

میں نہ شاعر نہ مصور نہ مغنی ہوں نعیم
میں ہوں وہ رویا خلش جس [illegible]

اکبر حیدرآبادی

ظلمتوں ہی سے نئی صبح کی تنویر ملی
ذہن کو خواب ملا خواب کو تعبیر ملی

چپ تھے وہ بزم میں پرشوقِ سماعت کو مرے
اس خموشی میں بھی اک لذتِ تقریر ملی

نامکمل ہے ابھی جہدِ تمنا شاید
ڈھونڈنے تجھ کو چلے تھے تری تصویر ملی

مرحلے ہو گئے آسان اسیروں کو ترے
یادِ گیسو کی جو وابستۂ زنجیر ملی

ہم نے دیکھے ہیں بہت معجزۂ فکر و عمل!
ہم کو تقدیر بھی شرمندۂ تدبیر ملی

دل میں تھا ولولۂ رقصِ بہاراں لیکن
فصلِ گل آئی تو اک آہنی زنجیر ملی

حادثہ کتنا مکمل ہے شکستِ دل کا
سوز نغمے کو ملا، شعر کو تاثیر ملی

کچھ تو کام آگئی اکبر مری وحشت آخر
وہ بھی خوش ہیں کہ چلو حسن کو تشہیر ملی

شہاب جعفری

بزمِ الفت کی فضا بدلیں گے
کہنہ ہے رسمِ وفا بدلیں گے

راس آیا نہ دیارِ احباب
کیا کریں آب و ہوا بدلیں گے

کچھ ہمیں میں ہے برائی شاید
خیر آئینِ وفا بدلیں گے

رند و ناصح کی سرشت ایک سی ہے
ہم نہ بدلیں تو وہ کیا بدلیں گے

لائقِ عشق نہیں ناز و ادا
تیرا دستورِ جفا بدلیں گے

دیکھ کر تم کو گذر جائیں گے
وضعِ دیرینہ ذرا بدلیں گے

تم پکارو بھی تو بولیں گے نہیں
کچھ ہو، مفہومِ صدا بدلیں گے

طورِ الفت ہوئے بے طور شہاب
ناروا ہو کہ روا بدلیں گے

وحید اختر

واپسی

واماندگیٔ عافیت اندیش کے ہاتھوں
چاہا تھا ذرا دیر کہیں ٹھیر کے دم لوں
پیکار گہہِ زیست کا ہر لمحہ مصر تھا
زخموں کی زباں دیر سے کیا کہتی ہے سمجھوں
دم توڑتی امیدوں کی آنکھوں میں تقاضہ
ماتھے سے لہو پونچھ کے سینہ سے لگا لوں
تحریر تھکے ماندے عزائم کی جبیں پر
جینا ہے اگر رخصت آرام انھیں دوں
غیرت کے کڑے کوسوں کے تیور سے یہ ظاہر
اس راہ سے بے راحلہ و رخت نہ گذروں
یہ دیکھ کے منزل نے بھی دی دور سے آواز
سستانا بھی اک فرض ہے گر آبلہ پا ہوں

آخر کو مگر کھولی اک آرام سرا میں
اس جا بھی نظر آیا ہر اک شاکیٔ دوراں
واماندہ و مجروح و دل افگار سبھی تھے
اتنوں کے لیے تنگ تھی آسائش داماں
زخموں سے تڑپتے ہوئے ہر شخص کا آرام
بستر کے لیے دوسرے کی موت کا خواہاں
اپنے ہی مفادات پہ جب سب کی نظر ہو
اوروں کیلئے کون کرے کوشش درماں
جنگاہ سے دور اور بہت دور بھی آ کر
نظروں میں ہیں اک مسخ شدہ جنگ کے عنواں
جو بیٹھ گیا تھک کے یہاں پھر نہ اٹھے گا
ہوجاتا ہے کچھ اور ہی افکار میں غلطاں

دم لینے کو آیا تھا مگر دیکھ رہا ہوں
آرام سرائیں بھی ہیں اس دور میں زنداں
وہ لوگ یہاں قید ہیں اپنی ہی رضا سے
جو چھوڑ گئے معرکۂ زیست کا میداں
کچھ وہ ہیں جنھیں وقت نے پامال کیا ہے
کچھ وہ ہیں کہ تھے مصلحت اندیش و تن آساں
کچھ وہ ہیں کہ سمجھے نہیں اس جنگ کے اسباب
کچھ وہ ہیں کہ تھے سمتِ تغیر سے ہراساں
خود ساختہ زنجیروں میں یہ لوگ گرفتار
اپنے ہی تضادات میں فکر ان کی پریشاں
معلوم ہوا جرم ہے دم لینے کی خواہش
پسماندوں کی قسمت نہیں جز نالۂ و افغاں

واماندہ و مجروح و دل افگار ہوں لیکن
یہ سوچ کے لوٹ آیا ہوں میدانِ وغا میں
جب شعلوں کی زد میں ہو ہر اک شاخِ گلستاں
کیا ہوگا نشیمن میں اگر سر بھی چھپائیں
جو آگ بجھانے کے لیے سینہ سپر ہیں
ان کے لیے ممکن ہے کہ اپنے کو بچالیں
جو بیٹھ گیا توڑ کے اپنے پر و بازو
لازم ہے نہ چھوڑیں اسے شعلوں کی زبانیں
پیکار گہِ زیست کی گرمی سے ہیں بیدار
جینا ہے عزائم کو تو دم لینے نہ پائیں
دامن نہ چھٹے قافلۂ وقت کا اک آن
روندے ہوئے گل کو نہ اٹھائیں گی بہاریں

شفیق فاطمہ شعریٰ

ایک ایسی صبح

دھلے دھلے آسماں کی شفاف وسعتیں مسکرا رہی ہیں
حسین نیلاہٹوں میں رنگ اور نور گھل مل گئے ہیں جیسے
سکون ہلچل مچا رہا ہے خموشیاں مل کے گا رہی ہیں
سرور اور سرخوشی کے ہر سمت پھول سے کھل گئے ہیں جیسے

سلونی شام زمیں پر آسمان کو آج پیار آیا
سہانے لمحوں کی ہلکی ہلکی پھوار پیہم برس رہی ہے
فضاؤں میں رنگ رچ گئے دشت و در کے رخ پر نکھار آیا
تجلیِ ماہِ نو رمیدہ بھی چاندنی بن کے ہنس رہی ہے

نمی کو شبنم کی پی کے سورج کی نرم کرنیں بھی تازہ دم ہیں
ہوائیں نم ہیں فضائیں نم ہیں فلک کی نیلی ردائیں نم ہیں
یہ آسماں اس قدر دل آویز اور حسیں ہے کہ آج اسیر
نثار نیلے کنول کی نرمی، سکونِ دل جھیل کا پھیلاؤ
گداز نیلم میں گھل گئی ہے شگفتگیٔ رخِ گلِ تر
کروڑوں تاروں کی روشنی سے سحر نے شاید بنی ہے چادر
فلک پہ ہر سو نشاط سے ڈبڈبائی آنکھوں کی تازگی ہے
رکی رکی مسکراہٹیں ہیں بھنچی بھنچی بے کراں ہنسی ہے
مئے محبت کی سرخوشی ہے چٹکتی کلیوں کی تشنگی ہے
طلوعِ صبحِ بہار کی پاک اور طربناک روشنی ہے

سلونی شیاما زمین پر آسمان کو آج پیار آیا

زمین نے آسمان کو شوق و آرزو کا پیام بھیجا
شکایت درد نارسائی کا حال لکھا سلام بھیجا
کھلے ورق نامہ ہائے رنگیں کے اڑ رہے ہیں حسیں فضا میں
گھٹاؤں کے پیک تند رو کر رہے ہیں اٹکھیلیاں ہوا میں
اڑے چلے آ رہے ہیں جھم سے آگے پیچھے وہ ابر پارے
نہا کے روشن شعاعوں میں ہو گئے ہیں اجلے سفید سارے
وہ دودھیا دودھیا چٹانوں کے نقرئی نقرئی کنارے
ہے اک چکاچوند ہر طرف اور جگمگا اٹھے ہیں نظارے
یہ سیمگوں کشتیوں کے بیڑے اٹھائے لنگر رواں دواں ہیں
سفید پرچم ہیں تنا تنی کے سفید ریشم کے بادباں ہیں
وہ بڑھتے بڑھتے افق کے نیلے خموش ساحل پہ تھم گئے ہیں
چمکتا کہسار برف کا بن کے ایک منزل پہ جم گئے ہیں
شعاعیں سورج کی چھیڑتی ہیں جو پیار سے انکو گدگدا کر
تو غنچہ ہائے سمن کے انبار جاگ اٹھتے ہیں مسکرا کر
دیے ہزاروں لرزنے لگے ہیں جیسے اک قمقمہ میں
ابلنے لگتی ہے چاندنی کی شراب شیشے کے ساتگیں میں

یہ آسماں ہے کہ اک حسیں آئینہ ہے سیمائے زندگی کا
کبھی بھی اک شکل پر نہیں ایک لمحہ کو بھی قرار جس کو
ابھر کے ہر نقش مٹ رہا ہے نیا ہے ہر آن اس کا جلوہ
خود اس کا ذوق نمود تڑپا رہا ہے سیماب وار جس کو
افق کے برفیلے کوہسار اب فضا میں تحلیل ہو رہے ہیں

دُھنی ہوئی روئی اڑ رہی ہے، اُجالے سایے سے چھن رہے ہیں
سحر کی تنویر بٹ رہی ہے، فضاؤں میں تاج بن رہے ہیں
جُھکی جُھکی ہیں بلندیاں آج ان کی یلغار دم بدم سے
اُلجھ رہا ہے اُمڈتے ساگر کا جھاگ موجوں کے پیچ و خم سے
زمیں نے آسماں کو شوق و آرزو کا پیام بھیجا

یہ کس نے پہنچا دیا فضاؤں میں جوشِ زن بحر بیکراں کو
یہ کس نے نیچی پہاڑیوں تک جھکا دیا اوجِ آسماں کو
بساطِ یک رنگ پر اُتارا یہ کس نے رنگوں کے کارواں کو
یہ کر دیا کس نے تیز تر آج قلب کی آتشِ نہاں کو
یہ کیسی سرگوشیاں ہیں ہر سو یہ کیسی آواز آ رہی ہے
حیات کیا آج وجد میں آ کے اپنی بنسی بجا رہی ہے
زمین اور آسمان اک نغمۂ طرب گنگنا رہے ہیں
نزاعِ پست و بلند کی تلخیوں کو دل سے بھلا رہے ہیں
کُھلی کُھلی ملگجی گھٹائیں چمکتے موتی لٹا رہی ہیں
نئی فضاؤں میں شور برپا ہے بجلیاں مسکرا رہی ہیں

بلراج کومل

فریبِ لطیف

وہ رک گیا، گڑگڑا کے بولا
شراب کا ایک جام دے دو
"مجھے بھی دے دو،
شراب کہنہ کا ایک ہی جام جس کو پی کر
میں اپنی ہستی کو بھول جاؤں
میں تشنہ لب ہوں،
تھکا ہوا ہوں۔

جواب میں مے فروش بولا،
"یہ جام لے لو
شراب کا ایک جام لے لو
اسے پیو، اک ہزار دن زندگی سے غافل
جہانِ آہ و فغاں سے غافل
سکون کی نرم و گرم آغوش میں گذارو"

عجب تھا اعجازِ مے کہ وہ تشنہ لب مسافر
ابھی یہاں تھا، ابھی نہیں تھا
بس ایک آواز اس کے ہونٹوں سے رس رہی تھی
"مرے عزیزو! میں جا رہا ہوں
میں جنتِ گمشدگی کی خاطر جہانِ تازہ میں جا رہا ہوں"

ہزار دن بھی گذر گئے وقت ہوش آیا۔
نگہ اٹھائی، زباں کھولی؛
"اک اور دے دو،
شراب کا اک اور بھرپور جام دے دو
اک اور دے دو، دیے چلو اب،
مرا سفر، میری رہگذر میری جنتِ گمشدہ رہے گی"

قریب سے کوئی کہہ اٹھا، مے فروش؟ ہائے! وہ مر چکا ہے۔
وہ مر چکا ہے۔'

بشرنواز

چاند پیغام لے کے آیا ہے

دلوں کی سیہ چٹانوں سے
ر کے آبشار گرتے ہیں
اگوں، بے صدا، مدھر نغمے
ل پر خامشی کے بکھرتے ہیں
ہزادگی شب کے جوڑے میں
د کا پھول مسکراتا ہے
حدِ نگاہ رقصوں میں
افشاں چمک رہے ہیں نجوم
ریتوں کی چلمنوں میں سے
دیوں جھانکتا ہے رہ رہ کر
کوئی نگار سیم بدن
کمرے کے اک دریچے سے
ب رہگزار تکتی ہو

اور کسی راہرو کو اپنی طرف
دیکھتا پا کے ایک ناز کے ساتھ
ایسے پردے کی آڑ لے جس سے
کچھ چھپے اور کچھ نمایاں ہو
نیلگوں آسماں کا گنبد
ورقِ زر میں جیسے لپٹا ہے
سیم سیال میں نہائے پیڑ
آبِ زر سے دھلے دھلائے پیر
مست و بےخود ہیں سر اٹھائے ہوئے
ذرے ذرے پہ سیکڑوں بوسے
ثبت کرتے ہیں چاندنی کے لب
بارشِ نور ہے چہار طرف
وقت آیا ہے آج کیف بدوش

ایک اک لمحہ ہے مسرت کوش
کھل گئے راگ سے ہواؤں میں
میکدے کھل گئے فضاؤں میں
آج تو جیسے ایک اک لمحہ
بادہ و جام لیکے آیا ہے
میرے سر بے وفائی کے مانے
کتنے الزام لیکے آیا ہے
مدتوں بعد ان کی محفل سے
چاند پیغام لیکے آیا ہے
چاندنی ہے اداس آجاؤ

●

گنگناتی ندی کے ساحل پر
سبزہ زار آج بھی لہکتے ہیں

زیرِ دامانِ ماہ یادوں کے
گلستاں آج بھی مہکتے ہیں
موجۂ بادِ نم سے رگ رگ میں
جیسے آتش کدے دہکتے ہیں
آج بھی دل کی سونی راہوں پر
آرزو کے قدم بہکتے ہیں
دن ڈھلے دور افق کے دامن میں
مسکراتے ہیں پھول لالے کے
اور ندی کے بہاؤ کے رخ پر
لڑکیاں چھوڑتی ہیں دیپ کئی
جن کی ہنستی ہوئی لووں کا عکس
آگ پانی میں جب لگاتا ہے
دل کا ہر درد جاگ جاتا ہے
جگنوؤں کی طرح تصور میں

سینکڑوں واقعات پھرتے ہیں
سینکڑوں خواب سینکڑوں ارماں
آنکھ سے اشک بن کے گرتے ہیں
جانے دل کیوں لرزنے لگتا ہے
اور میں جب ستارے گھرتے ہیں
سے چشمے میں غسل کرنے کو
ماہتاب آج بھی اترتا ہے
مقبرے کے بلند مینارے
آج بھی دودھ میں نہاتے ہیں
خوشنما آبشار بہتی ہے
پھیر دیں آج بھی سناتا ہے
سے ہوا اب بھی رات کی رانی
کھیتوں کی دھی سے اترائی
مسکن حسیں ہے اب بھی مگر
چاندنی دلنشیں ہے اب بھی مگر
زندگی ہے اداس آجاؤ

اس سے پہلے کہ راہ تک تک کر
منتظر چشمِ شوق سو جائے
اس سے پہلے کہ آنسوؤں کا سیل
کتنی آرزو ڈبو جائے
اس سے پہلے کہ کاروانِ حیات
یاس کی تیرگی میں کھو جائے
میری دنیا کو جگمگا جاؤ
راہیں مشعلیں جلا جاؤ
زندگی ہے اداس آجاؤ

اختر سعید

درد جیسے مسکرا کر زخم ہنس کر کھائے ہے
دل وہ شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکرا جائے ہے

ہر ارادہ لڑکھڑائے ہر قدم تھرائے ہے
کیا یونہی اے رہنما منزل پہ پہنچا جائے ہے

اے نگاہ یار کہہ لینے دے مجھ کو دل کی بات
انتہائے ضبط غم سے آدمی مر جائے ہے

دیکھئے پورے ہوں کب تک میرے ارمانوں کے خواب
آج تو ہر آرزو سے زندگی شرمائے ہے

فیصلہ اس کا نہیں ہوتا ہے راہ شوق میں
دل کو سمجھاتا ہوں میں یا دل مجھے سمجھائے ہے

کاروبار زیست میں دل سے تعلق ہو نہ ہو
یہ مگر سچ ہے کہ تجھ بن جی بہت گھبرائے ہے

دیدنی ہے اے دغا دشمن ہماری سادگی
کون اس دنیا میں یوں دانستہ دھوکا کھائے ہے

اظہر سعید

میرے ہونٹوں پہ تبسم جو عیاں ہوتا ہے
سو وہ اک پردۂ غم ہائے نہاں ہوتا ہے

جی اٹھے تیری نظر سے تو کھلا ہم پہ یہ راز
کبھی نشتر بھی رفیق رگ جاں ہوتا ہے

زخم دل تک جو پہنچ جائے نظر ہے ورنہ
زخم سر کا تو زمانہ نگراں ہوتا ہے

درد کہہ کر کوئی دل کہہ کے گذر جاتا ہے
کب زمانے سے مرا حال بیاں ہوتا ہے

ہے تری بخیہ گری سے مرا چاک دامن
کام یہ دست بہاراں سے کہاں ہوتا ہے

شوق دل جس کی کمی سے ہے یہ سب مجبوری
کبھی بڑھتا ہے تو رسوائے جہاں ہوتا ہے

یہ نگاہ غلط انداز بھی کیا ہے کہ ہمیں
اپنے ہونے پہ نہ ہونے کا گماں ہوتا ہے

انور معظم

آدمی کے آدمیت پر ستم دیکھا کیے
زندگی سہتی رہی غم اور ہم دیکھا کیے

درمیاں پھولوں کے شبنم دل گرفتہ ہی رہی
ہم بہارِ زندگی با چشمِ نم دیکھا کیے

بزم میں ساقی نے ساغر لا کے چھلکائے مگر
میکشاں بادہ بقدرِ شوق کم دیکھا کیے

ذوقِ تقلیدِ کہن نے چھین لی آبِ نظر
ہر قدم پر ہم کوئی نقشِ قدم دیکھا کیے

پھول کیا ہنستے چمن میں باغباں کے سامنے
ہر تبسم میں نہاں تعزیرِ غم دیکھا کیے

کیسی بے غرضی، کہاں کی سادگی، سب کا خلوص
نفع و نقصان پر ہم بیش و کم دیکھا کیے

امان ارشد

داغہائے پیہم نے مدتوں نکھارا ہے
اشکِ محفلِ انجم آج دل ہمارا ہے

خود بخود چلا ہے دل جانبِ غمِ دوراں
عشق نے مجھے اپنا جان کر پکارا ہے

حاصلِ محبت ہے حسنِ زندگانی ہے
یاد میں تری ہم نے وقت جو گزارا ہے

دار پر چڑھاتے ہیں جرم صرف اتنا ہے
ہم نے زلفِ گیتی کے حسن کو سنوارا ہے

ذوقِ دید پر میرے تہمتیں سہی لیکن
حسن خود مکمل اک دعوتِ نظارا ہے

زبیر رضوی

اندیشے

تجھے خبر بھی نہ ہوگی نسیم صبح بہار
یہ رات دن مرے کس طرح سے گذرتے ہیں
یہ تیری یاد کے گجرے یہ تیری یاد کے پھول
جو میرے اجڑے دیاروں کی مانگ بھرتے ہیں

گگن پہ چاند ستاروں کے ناچتے پیکر
مری حیات کی تنہائیوں پہ خنداں ہیں
شفق کی گود کے پالے ہوئے حسین منظر
مری نگاہ کی ویرانیوں پہ حیراں ہیں

تجھے خبر بھی نہ ہوگی متاعِ ناز و جمال
کہاں کہاں میں تری آرزو میں گھوما ہوں
چڑھا کے پھول میں ناکامیوں کی تربت پر
زمانے بھر کی نگاہوں سے چھپ کے رویا ہوں

جبینِ شوق پہ سجدوں کی تازگی لے کر
ہزار بار ترے آستاں تک آیا ہوں
لبوں پہ عرضِ تمنا کی حسرتیں لے کر
ہزار بار میں تیرے جہاں تک آیا ہوں

بہ ایں عروجِ تمنائے چاک دامانی
نگاہ پھر بھی تری انجمن کو پا نہ سکی
جبیں کو مل نہ سکا تیرے آستاں کا نشاں
لب و دہن پہ کوئی دل کی بات آ نہ سکی

مہکتی گاتی ہواؤں کی ہرنیاں اکثر
پیام لیکے تیرا بام و در سے گذری ہیں
سحر نے جب بھی مری خلوتوں میں جھانکا ہے
[illegible]

صبا

کبھی فضا میں جو لہرائے ریشمی آنچل
تو یاد تیرے حسیں پیرہن کی آئی ہے
کبھی جو تیری وفا کا خیال آیا ہے
تو زندگی تری قربت پہ مسکرائی ہے

میں تجھ سے چھوٹ کے ان اجنبی دیاروں میں
بھٹک رہا ہوں سکونِ دل و نظر کے لیے
نہ کوئی جادہ نہ منزل نہ کوئی راہنما
ترس رہی ہیں دعائیں مری اثر کے لیے

فلک کی گود میں جب ماہتاب ہنستا ہے
تمام رات خیالوں کے جال بُنتا ہے
دُلہن اداؤں کی بزم سنگھار کرتی ہے
مژہ مژہ پہ میں اشکوں کے پھول چنتا ہوں

کبھی جو یاد تری بے قرار کرتی ہے
میں بڑھ کے ساغر و مینا کو چوم لیتا ہوں
مٹا کے نقشِ غمِ دل، لپٹ کے ساقی سے
میں میکدے کی فضاؤں میں جھوم لیتا ہوں

میں سوچتا ہوں یہ اکثر کہ زندگی میری
اس انتشار سے گھبرا گئی تو کیا ہوگا
تجھے نہ پا کے تری جستجو سے اکتا کر
ترے خیال سے کترا گئی تو کیا ہوگا

حمید الماس

فردا

طلسم خانۂ شام و سحر کے روزن سے
دکھائی دیتا ہے اک روئے آتشیں کب سے
شعاعِ خواب ہے تعبیر آفریں کب سے

اُمید و بیم کے لمحوں کا دم بدم بِکھراؤ
خیال و خواب کے بازو فگار ہوتے ہیں
عجیب رسم ہے یہ انتظارِ جلوہ دوست
دل و نگاہ سراپا بہار ہوتے ہیں

کہیں قریب ہے وہ پیکِ جلوۂ نوروز
قدم بڑھاؤ نئی زندگی نظر آئی
مناؤ جشن کہ راہوں میں خار زار ملے
چلے چلو کہ مراد آبلوں کی بر آئی

فیصی

خوں ناب

(خالہ کے نام)

میری ہمدم میری غم خوار میری مونس ماں
کس زباں سے ترے الطاف کا افسانہ کہوں
زندگی تیرے ہی احسان کے سایوں میں پلی
"اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں"
نقش ہے دل پہ ترا لطف و کرم مہر و وفا
ہیں منت کشِ اظہار ترا سوزِ دروں
تیرے قدموں میں نہاں جنتِ فردا کا جمال
دل کو اب کونسی جنت کا طلبگار کروں
محرمِ درد ہے تو جذب ہے تیرے دل میں
میرے ہر غم کی کسک سوزشِ قلبِ محزوں
گُل نہ ہو جائیں کہیں تیری محبت کے چراغ
ٹوٹ جائے نہ کہیں تیری نگاہوں کا فسوں
میری پلکوں سے لرزتے ہوئے آنسو چن لے
کہتے ہیں ضبطِ غم اور بھی ہوتا ہے فزوں

قصۂ عہدِ کہن تجھ کو سنانے کے لئے
سب سے منہ موڑ کے اِک تیری طرف آیا ہوں

آج کی رات بہت تیز ہے دل کی دھڑکن
آج کی رات غمِ دل پہ بہت بھاری ہے
اونگھتا چاند، بجھی رات، فسردہ تارے
آج ہر شئے پہ قیامت کی غشی طاری ہے
وقت کی بوڑھی رگیں ٹوٹ رہی ہوں جیسے
کرۂ ارض کی ہر چیز تھکی ہاری ہے

دھند میں ڈوبتی یادوں کا سہارا لے کر
شیشۂ ذہن نے ہر نقش کو جھلکایا ہے
دل کے غم خانہ میں سویا ہوا ہر لمحہ
اپنے ماضی کا کفن پھاڑ کے لوٹ آیا ہے

سالہا سال سے آنکھوں میں چھپائے ہوئے اشک
آنکھ نے قطرہ بہ قطرہ انہیں ٹپکایا ہے

یاد تو ہوگی مری ماں تجھے وہ حشر کی رات
جب قیامت بھی بہ انداز دگر آئی تھی
کتنی پُر ہول تھی جاڑوں کی ٹھٹھرتی ہوئی رات
شب اندھیرے کا کفن اوڑھ کے در آئی تھی

ب سناٹا تھا چھایا ہوا بام و در پر
رگی رات کی کچھ اور نکھر آئی تھی
ٹھنڈے کمروں" پہ المناک اداسی تھی محیط
و دیوار پہ ویرانی اتر آئی تھی

ل، آلودہ جبیں باب اثر سے لے کر
عاز جسم بہ دل خاک بسر آئی تھی
ت کی ٹھٹھری ہوئی لاش کو کاندھوں پہ لیے
با دیدۂ تر چاک جگر آئی تھی

گی ہار کے جب تیری بہن ہار علاج
ے اصرار پہ آخر ترے گھر آئی تھی

گر کتنے پئے عزم جواں آئے تھے
پُر عزم مسیحائے زماں آئے تھے
ر موت بھی ہے نام سے جن کے لرزاں

انگلیاں جن کی سمجھ لیتی ہیں نبضوں کی زباں
آئے ننھے لب پہ سکھائے مسیحا لے کر
دل میں امید کا بجھتا ہوا شعلہ لے کر

اک دواؤں ہی پہ موقوف نہ تھا طرز علاج
سوئیاں جسم سے لیتی رہیں زخموں کے خراج
چھلنی چھلنی تھا اگر جسم تو آنکھیں بے خواب
شدت درد سے اک آہ بھی کرنی تھی عذاب
زرد چہرہ پہ سلگتے ہوئے اشکوں کی قطار
مضمحل سینہ اٹھائے ہوئے ہر سانس کا بار
موت یلغار پہ یلغار کئے جاتی تھی
زندگی بڑھ کے ہر اک وار سہے جاتی تھی

اور الجھنے لگا جب زیست کا ہر تار نظر
تو نے رو کر یہ صدا دی سر بالیں آ کر
رخصت اے میرے لیے اشک بہانے والی
میرے ہر زخم کو سینہ سے لگانے والی
رخصت اے میرے سمن زار محبت کی بہار
رخصت اے میرے شب و روز چمن کی مہکار
رخصت اے میرے رخ بزم مسرت کے نکھار

میری آنکھوں کا ترنم میرے اشکوں کی پھوار
رخصت اے میری لٹکتی ہوئی یادوں کے چمن
رخصت اے میرے سیہ خانۂ ہستی کے رتن
دیکھ ہاں دیکھ ترا لختِ جگر آیا ہے
آنکھ تو کھول کہ اب وقتِ سفر آیا ہے

اور وہ رات کہ جب شمع سیہ پوش ہوئی
زندگی موت کے سینہ سے ہم آغوش ہوئی
کتنی تاریک تھی وہ رات کہ دم گھٹتا تھا
دل کی محراب سے آہوں کا دھواں اٹھتا تھا
رات کے پچھلے پہر کا وہ دلِ انگار سکوت
کتنے معصوم اشکوں کا اٹھا تھا تابوت

مسکراتے ہوئے بچپن کی دل آویز ہمک
ناشناسائے الم چہروں کی معصوم چمک
ایک دو ماہ کی بچی کی جگر پاش پکار
جس کے ہونٹوں سے ابھی دور رہی دودھ کی دھار
مطربِ اجل نے جسے توڑ دیا ایسا ساز
جس نے دیکھا ہی نہیں ماں کی محبت کا گداز
غم سے سنولائے ہوئے چہروں کی معصوم خوشی
دامنِ دل پہ لرزتے ہوئے اشکوں کی نمی

[illegible] کا ایک قبرستان

کتنے افسانوں کا عنوان بنا تیرا کرم
میری خوشیاں، مرے آنسو، مرے ارماں، مرا غم
زیست کو ہر گھڑی آفت میں سہارا تو نے
کاکلِ ہستیٔ برہم کو سنوارا تو نے
زندگی شمعِ شبستاں ہوئی تیرے دم سے
رو کشِ صبحِ بہاراں ہوئی تیرے دم سے

تیری ہمدم تھی جو الفت کی زبوں حالی میں
دفن ہے آج وہی "پنجۂ بنگالی" میں

محمد فضل الرحمٰن

کارخانہ

کردار

سیٹھ ثروت بھائی۔ کارخانہ کے مالک۔ عمر پچپن سال
یاسمن۔ ثروت بھائی کی لڑکی۔ عمر پچیس سال
پردیسی۔ کارخانہ کا نیا منیجر، یاسمن کا عاشق۔ عمر پینتیس سال
نواب سرفراز شہر کے ایک امیر۔ عمر ساٹھ سال
نثار احمد مزدوروں کے لیڈر عمر تیس سال
خانساماں

ایکٹ پہلا

سین پہلا

(سیٹھ ثروت بھائی کے دفتر کا کمرہ۔ ایک بڑی سی آفس میز کے گرد دو چار کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ سیٹھ ثروت بھائی بیچ کی گھومنے والی کرسی پر بیٹھے کچھ کاغذات دیکھ رہے ہیں۔ دائیں جانب ایک علٰحدہ کرسی اور تپائی ہے جس پر ایک ٹائپ رائٹر رکھا ہے۔ اس کرسی پر ایک نوجوان لڑکی بیٹھی کچھ ٹائپ کر رہی ہے)

سیٹھ ثروت بھائی۔ یاسمن اب تم ٹائپ کرنا چھوڑ کر کوئی اور کام شروع کرو۔ سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ ٹائپسٹ کی تنخواہ بچانے کے لیے سیٹھ ثروت بھائی اپنی لڑکی سے دفتر میں کام لیتے ہیں۔ اب میں انہیں کیسے بتاؤں کہ تمہارے ایک ایک کا خرچ دس ٹائپسٹ کی تنخواہ سے زیادہ ہے۔ ؟ تمہارے جیب خرچ کے لیے جتنا روپیہ میں دیتا ہوں اس میں کم سے کم ایک منیجر، دس کلرک، اور دو سو مزدور رکھے جا سکتے ہیں۔

یاسمن۔ آبا۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ میری ہر چھوٹی سی خواہش پر آپ بڑی سے بڑی رقم کا چیک لکھ دیتے ہیں لیکن میں کیا کروں مجبور ہوں۔ ہزاروں روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی وقت نہیں گزرتا۔ بیکاری سے گھبرا کر میں نے آپ کے دفتر میں کام

کی شروعات کیا اور چونکہ دفتر میں لڑکیوں کے لیے سوائے ٹائپ کے اور کوئی کام موزوں نہیں سمجھا جاتا اس لیے میں ———

سیٹھ (بات کاٹ کر) میں جانتا ہوں لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ تمہیں کوئی اور شغل ڈھونڈنا چاہیے۔

یاسمن اگر آپ میرے کام سے ناخوش ہیں تو میں آج ہی اس کو چھوڑ دیتی ہوں

سیٹھ ہرگز نہیں۔ تمہاری محنت بہت اچھی ہے۔ اور مختصر نویسی میں یہ مسلم ہو چکا ہے کہ کوئی تمہاری برابری نہیں کر سکتا وہ تو میں تمہارے فائدہ کے لیے کہہ رہا ہوں۔

یاسمن دنیا کا سب سے صرف روپیے کی تھیلیاں رکھنے والے سے ہو سکتا ہے

سیٹھ ایسا نہ کہو بیٹی دنیا میں اچھے بُرے ہر قسم کے آدمی ہیں کیا ان دونوں میں تمہارے نزدیک کچھ بھی فرق نہیں؟

یاسمن یہی اتنا فرق ہے کہ اچھا آدمی اچھے اچھے کام کر لیتا ہے اور بُرا آدمی اچھے اچھے خیالات رکھتا ہے یا دوسرے الفاظ میں بُرا آدمی بُرے کام کرتا ہے اور اچھا آدمی بُرے خیالات رکھتا ہے۔

سیٹھ خیر اس بحث کو رہنے دو۔ لاؤ وہ عرضیاں جو ہمارے اشتہار کے جواب میں وصول ہوئی ہیں آج امیدواروں سے ملاقات کا دن ہے شاید ان میں کوئی کام کا آدمی مل جائے۔

یاسمن کونسی عرضیاں؟

سیٹھ وہی جو منیجر کی اسامی کے لیے بھیجی گئی ہیں تمہیں یاد نہیں ابھی کچھ دن پہلے ہم نے ایک اشتہار دیا تھا "ضرورت ہے ایک منیجر کی جو انگریزی اور اردو میں اعلیٰ قابلیت رکھتا ہو۔ ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کا گریجویٹ ہو۔ حساب تاریخ اور جغرافیہ میں مہارت رکھتا ہو۔ اس کے ساتھ محنتی، جفاکش، مضبوط، تندرست، ذہین، خوش مزاج، نیک، شریف خاندان . . ."

یاسمن ہاں یاد آیا۔ تنخواہ سو روپیے ماہانہ، سال میں دو روپیے کی ترقی۔

سیٹھ بس وہی اشتہار۔ کتنی عرضیاں وصول ہوئی ہیں؟

یاسمن (ادھر ادھر تلاش کر کے) عرضیاں تو کئی سو ہیں مگر میں نے چھانٹ چھانٹ کر دس عرضیاں الگ کی ہیں۔ یہ لیجیے پہلے ان کو دیکھ لیجیے (عرضیوں کا ایک پلندا دے کر خود ٹائپ کرنے میں مشغول ہو جاتی ہے)

سیٹھ (ادھر ادھر پڑھ کر ایک عرضی نکال لیتے ہیں اور یاسمین سے مخاطب ہوتے ہیں) مجھے اس عرضی کی عبارت پسند ہے۔ آدمی ہوشیار اور دبنگ معلوم ہوتا ہے مزدوروں سے کام بھی لے گا اور سب کو خوش بھی رکھے گا۔ بس اس کارخانہ کو ایسے ہی منیجر کی ضرورت ہے

یاسمن آپ پہلے اس امیدوار سے بات چیت تو کر لیجیے

سیٹھ ٹھیک کہتی ہو۔ گو بات چیت کے بعد میری رائے نہیں بدلے گی پھر بھی مل لینا مناسب ہے ورنہ دوسروں کو شکایت پیدا ہوگی۔

(بار بار گھنٹی بجاتا ہے۔ پھر پکارتا ہے۔ "ارے کیا سب مر گئے ہیں۔") (نوکر داخل ہوتا ہے)

سیٹھ (غصہ سے) کہاں غائب تھے۔ اتنی دیر سے بلا رہا ہوں کوئی جواب نہیں دیا۔

نوکر حضور میں تو یہیں دروازے پر پہرہ دے رہا تھا۔ گھنٹی سنتے ہی لپکا ہوا آیا۔

سیٹھ بے کار باتیں مت بناؤ۔ کام چور نالائق کہیں کے ابھی اسی وقت دوڑ جاؤ اور دیکھو باہر جو لوگ بیٹھے ہیں ان میں سے جن صاحب کا نام پردیسی ہے انہیں بلا لاؤ

نوکر بہت خوب (دوڑتا ہوا جاتا ہے)

یاسمن پردیسی! عجیب نام ہے

سیٹھ نام سے زیادہ عجیب حضرت کی لکھی ہوئی عرضی ہے

(پڑھتا ہے) لکھتے ہیں "میں جھوٹ بول کر آپ کو دھوکہ دینا نہیں چاہتا۔ اس نوکری سے میری غرض تنخواہ لینا ہے۔ اور بس۔ جب تک روپیہ ملتا رہے گا کام کرتا رہوں گا۔ جس دن یہ آمدنی ٹوٹی اسی دن سے سمجھ لیجئے کہ میرا کام ختم ہو چکا۔ گو سو روپیہ اس مہنگائی کے زمانہ میں بہت کم ہیں لیکن جب تک کہیں اور جگہ اس سے زیادہ نہ ملے میں آپ کے کارخانہ میں نوکری کرنے کے لئے تیار ہوں۔ البتہ سو روپئے دیکر آپ مجھ سے دو سو روپئے کا کام نہیں لے سکیں گے"

نوکر (داخل ہوتا ہے) حضور ۔۔۔ میں نے ان سے سلام کہا تو وہ آپ کو وعلیکم سلام کہہ رہے ہیں۔

سیٹھ بدتمیز۔ یہ کیوں نہیں کہا کہ سیٹھ صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔

نوکر جو حکم (چلا جاتا ہے) (سیٹھ صاحب کاغذات دیکھنے لگتے ہیں۔ پردیسی داخل ہوتا ہے)

پردیسی آداب عرض ہے (یاسمین کو دیکھ کر جھجکتا ہے اور پھر سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

سیٹھ آداب عرض ہے۔ آئیے ادھر بیٹھئے (پردیسی کے بیٹھنے کے بعد) یہ عرضی آپ ہی کی لکھی ہوئی ہے؟

پردیسی جی ہاں

سیٹھ پردیسی آپ ہی کا نام ہے؟

پردیسی بیشک۔ ہر دیس میں مجھے اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

سیٹھ اپنی تعلیم کے بارے میں آپ لکھتے ہیں (پڑھتا ہے) "مجھے افسوس ہے کہ میں نے ایم۔ اے کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا ہے" یہ تو خوشی کا مقام ہے" اس میں افسوس کی کیا بات ہے؟

پردیسی جس کامیابی کے بعد ساری زندگی ناکام رہے اس پر افسوس نہ کروں تو کیا کروں۔

سیٹھ مدرسہ میں آپ کی دوسری زبان کیا تھی؟

پردیسی میں نے عربی لی تھی۔ خدا کی مہربانی سے عربی کے ہر پرچہ میں اور شیطان کی مدد سے سائنس کے تمام پرچوں میں میں ہمیشہ اچھے نمبر لیتا رہا۔

سیٹھ عرضی میں آپ نے خاندان کا ذکر نہیں کیا حالانکہ سب سے پہلے خاندانی عزت کو دیکھا جاتا ہے۔ جب تک کسی شخص کے بارے میں یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کس گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ اس کے بزرگوں نے کیسے کیسے کارنمایاں کئے ہیں۔ اس کے متعلق کوئی رائے نہیں قائم کی جا سکتی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا حسب نسب کیا ہے۔

پردیسی میرے نسب کا سلسلہ مختلف بزرگوں سے گزرتا ہوا حضرت آدم سے جا ملتا ہے۔ طوفان نوح میں قریب تھا کہ میرے خاندان کے تمام افراد ڈوب مرتے لیکن خوش قسمتی کہئے یا حسن اتفاق وہ سب کشتی نوح میں جگہ پا گئے، ورنہ وہ صحیح سلامت کنارے تک پہنچ گئے۔ اس سے زیادہ مجھے اپنے خاندان کے حالات کا علم نہیں۔

یاسمین خاندان کے حالات تو آپ نے پوری طرح بتا دیئے لیکن اپنے وطن کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔

پردیسی وطن!

سیٹھ جی ہاں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آپ کا دیس کونسا ہے

یاسمین یعنی آپ کس ملک میں پیدا ہوئے؟

پردیسی میرا کوئی وطن نہیں۔ اور نہ میں آپ کو کسی دیس کا پتہ دے سکتا ہوں۔ میں ہر دیس میں پردیسی کہلاتا ہوں۔

یاسمین یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ آخر زمین کے کسی نہ کسی حصہ میں تو آپ پیدا ہوئے ہوں گے۔ کوئی اچانک آسمان سے نہیں ٹپک پڑتا۔

پردیسی میں آپ کو کیا بتاؤں (سر کھجاتے ہوئے)

یہ ہے کہ میں سرحد کے ایک چھوٹے گھر میں پیدا ہوا اور پیدائش کی تاریخ سے آج تک کسی ایک شہر میں مہینہ بھر سے زیادہ نہ ٹھہر سکا۔ اب آپ ہی بتائیے میں کس شہر کو اپنا دیس کہوں اور کس ملک کو اپنا وطن سمجھوں۔

ین آہ۔ آپ ہم سب سے زیادہ خوش نصیب ہیں۔ اس زمانہ میں انسان کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی گاؤں یا شہر میں پیدا ہوتا ہے اور ایک نہ ایک ملک میں زندگی بسر کرتا ہے۔

ٹھ (بناوٹی غصہ سے) آپ نوکری کے لیے آئے ہیں اور اپنے ہونے والے مالک سے اس قسم کا بے تکا مذاق کر رہے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان حرکتوں سے آپ کا مطلب نکل آئے گا۔

دیسی دیکھیے سیٹھ صاحب۔ خفا نہ ہوجیے اگر میں سچ بات کہوں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ آج دس سال سے ہر ہونے والے مالک کے سامنے میں اپنا دکھڑا روتا رہا۔ اپنی قابلیت کی سندیں دکھائیں۔ اپنے نیک ارادوں کی داستانیں سنائیں۔ اپنی مصیبت کا رونا رویا مگر ہر وقت ایک ہی جواب ملا "مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت کوئی جگہ خالی نہیں۔ آئندہ کبھی موقع ملے تو میں ضرور آپ کا خیال رکھوں گا۔" یہ جواب سنتے سنتے میرے کان بہرے ہو گئے۔ آخر میں نے سوچا کہ جب بھوکوں مرنا ہی ٹھہرا تو روتے دھوتے جان کھونے سے بہتر تو یہی ہے کہ ہنستے کھیلتے آخرت کا سفر اختیار کروں۔ اگر آپ نے میرے کہنے کا برا مانا تو مجھے افسوس ہے (کرسی سے اٹھ کر) اچھا اب جانے دیجیے۔ خدا حافظ۔

ٹھ ٹھہریے ٹھہریے۔ ابھی ہماری بات چیت ختم نہیں ہوئی۔

یسی جب آپ کا ارادہ معلوم ہو چکا تو پھر وقت کھونے سے کیا فائدہ۔ آپ کی مہربانی کا شکریہ۔

سیٹھ میرا ارادہ آپ کو ہرگز معلوم نہیں۔ آپ کیا جانتے ہیں کہ آپ کے لیے میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ سنیئے میں نے سو روپے تنخواہ کا اشتہار دیا تھا۔ میں آپ کو دو سو روپے پر ملازم رکھنا چاہتا ہوں۔ منظور ہے آپ کو؟

پردیسی (خوشی کو چھپاتے ہوئے) کیوں نہیں۔ آپ مجھ سے دو سو روپے کا کام لینا چاہتے ہیں۔ اس لیے اکتوا کی دگنی تنخواہ دے رہے ہیں۔ اس مہربانی کے شکریہ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھی دگنی بلکہ چوگنی محنت کروں گا تاکہ میری گردن سے احسان کا بوجھ ہلکا ہو۔

سیٹھ اس سے پہلے آپ نے کس کارخانہ، کمپنی یا کچہری میں کام کیا ہے؟

پردیسی میں کہہ چکا ہوں کہ کالج چھوڑنے کے بعد سے آج تک مجھے اس قسم کا کوئی موقع نہیں دیا گیا۔

یاسمین تو آپ اتنے برس تک بیکار رہے۔؟

پردیسی بیکار تو نہیں تھا۔ ہاں بے روزگار ضرور تھا۔ اور اس بے روزگاری کے زمانہ میں روٹی کمانے کے لیے سینکڑوں جتن کیے۔ سب سے پہلے عزیزوں کے لیے ایک اخبار نکالا۔ اس اخبار کا مطلب یہ تھا کہ سب اُسے پڑھتے تھے مگر کوئی اسے نہیں خریدتا تھا۔ ناچار اس کو بند کرنا پڑا۔ پھر میں نے ایک دوکان کھولی جس کا سارا مال ہاتھوں ہاتھ تقریباً مفت بک گیا اور قریب تھا کہ میں خود بھی گاہکوں کے ہاتھ بک جاتا مگر قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ دوکان داری چھوڑ کر میں نے تصویریں بنانا شروع کیں۔

یاسمین اچھا آپ مصور بھی ہیں۔ مجھے تصویریں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ آپ ضرور اب کی دفعہ اپنی بنائی ہوئی تصویریں ساتھ لائیے۔

پردیسی وہ تصویریں کیا تھیں۔ کچھ الٹی سیدھی لکیریں ہوتی تھیں۔ جنہیں رسالوں کے مالک کارٹونوں کے نام سے چھاپتے تھے۔ اس ذریعے سے کچھ روپیہ مل گیا ہم جوش نے سچ مچ تصویریں بنانے کا شوق کیا تو کسی نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور وہ تصویریں میرے ہاں گھر میں پڑی پڑی سڑ گئیں۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

سیٹھ (ٹیلیفون کا آلہ اٹھا کر) ہلو۔ ہلو۔ جی ہاں سیٹھ ثروت بھائی۔ بورڈ کا جلسہ آج رکھا تھا۔ مجھے اس کی اطلاع نہ تھی۔ .... میں اس وقت کام میں ہوں   اہم اجلاس ہے
بڑی مشکل ہے ...   اچھا تھوڑی دیر کے لیے آجاتا ہوں (ٹیلیفون کا آلہ رکھ کر گھنٹی بجاتا ہے)

(نوکر داخل ہوتا ہے)

دیکھو جی میری موٹر تیار کرو۔ اور ہاں باہر جو لوگ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ ان سے کہنا کہ صاحب کو آج فرصت نہیں پھر کسی دن آنا۔

(نوکر چلا جاتا ہے)۔ (یاسمین سے) دیکھو یاسمین میں ابھی تھوڑی دیر میں لوٹوں گا۔ جب تک تم نیجر صاحب کو ان کے فرائض کے بارے میں ساری باتیں بتا دینا میں چاہتا ہوں کہ وہ آج ہی سے کام شروع کر دیں۔ پردیسی صاحب۔ آج تو آپ اس کمرہ میں بیٹھیے۔ کل سے آپ کے لیے دوسرا کمرہ تیار کر دیا جائے گا۔ کسی بات کی تکلیف ہو تو کسی سے کہنا وہ آپ کے لیے لکھنے لکھانے کا سارا سامان مہیا کر دے گی (یاسمین کی طرف دیکھ کر) ہاں میں آپ سے ان کا تعارف کرانا تو بالکل بھول گیا۔

(کچھ کہنا چاہتا ہے کہ یاسمین بیچ میں بول اٹھتی ہے)

یاسمین میں سیٹھ صاحب کی ٹائپسٹ ہوں۔ ان کی تمام خط و کتابت۔ بہی کھاتے۔ لین دین کے سارے کاغذات میں ہی ٹائپ کرتی ہوں۔

منیجر تو یوں کہیے کہ آپ ان کی پرائیویٹ سکریٹری ہیں۔

(سیٹھ صاحب کچھ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ پھر ٹوک دیتی ہے)

یاسمین جی ہاں۔ یوں ہی سمجھ لیجئے۔ ٹائپسٹ یا پرائیویٹ سکریٹری ایک ہی بات ہے کسی طرح روٹی کمانا ہے

(سیٹھ صاحب چلے جاتے ہیں۔ پردیسی میز کے کونے پر ٹکتا ہے)

منیجر (یاسمین سے) آپ کتنے دن سے یہاں ملازم ہیں؟

یاسمین میں ... میں کوئی ... بس یہی دو تین سال سے ....

منیجر تنخواہ کیا ملتی ہے۔؟

یاسمین تنخواہ ۔ ہاں تنخواہ ... ... ٹھیک ہے۔ تنخواہ مہینہ چالیس روپئے۔

منیجر چالیس روپئے تو بہت کم ہیں۔ آپ سیٹھ صاحب سے تنخواہ بڑھانے کو کیوں نہیں کہتیں۔ اتنی کم آمدنی میں خرچ کیسے چلتا ہوگا۔

یاسمین خرچ ... خرچ کیسا! میرا تو کچھ خرچ ہی نہیں۔

منیجر تو پھر آپ ہوا کھا کے زندہ رہتی ہیں۔

یاسمین اوہ کھانے کا خرچ۔ اصل میں میرے کھانے پر ایک کوڑی خرچ نہیں ہوتی۔ آپ سے کیا چھپاؤں میں نے کفایت شعاری پر ایک کتاب پڑھی تھی اس کے بعد سے میرا خرچ کم ہوتے ہوتے اتنا کم ہو گیا کہ چالیس روپئے بھی میرے لیے بہت زیادہ ہیں۔

منیجر (حیرت سے) چالیس روپے بھی بہت زیادہ ہیں۔ معاف کیجئے۔ اگر میں کوئی بات ایسی کہوں جو آپ کو بری لگے۔ میں تو سمجھتا ہوں آپ کے لباس پر چار سو سے زیادہ خرچ ہوتا ہوگا۔

یاسمین اوہ۔ یہ لباس ...... یہ تو میرے بچپن کا ہے ... نہیں ... میرا مطلب یہ ہے کہ [illegible] نام پر ایک لاٹری نکلی تھی اسی سے یہ کپڑے خریدے۔

ان باتوں کا جواب دینا آپ پسند نہیں کرتے تو میں کوئی اور ذکر چھیڑتا ہوں۔ اصل میں ایک آدمی کو ایسا سوال کرنے کا حق بھی نہیں۔
کہئے یہاں مجھے کس قسم کے فرائض انجام دینے ہوں گے؟

سارا کارخانہ آپ ہی کو چلانا ہوگا۔۔ مزدوروں کے کام کی دیکھ بھال۔ ان کی مزدوری بانٹنا۔ گودام کے لئے کچا مال خریدنا۔ سامان بننے کے بعد اس کی نکاسی کا بندوبست۔ اور ایسی ہی کئی چیزیں۔ اس کے علاوہ سیٹھ صاحب جو حکم دیں۔

کارخانہ میں کتنے مزدور ہیں؟

کوئی دو سو مزدور ہوں گے۔ اور پانچ کلرک

اچھا تو کاغذات لائیے۔ سیٹھ صاحب کے حکم کے مطابق آج ہی کام شروع کر دیں گے۔
(میز کے اوپر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

(کچھ کاغذات لاتی ہے) دیکھئے۔ یہ آج کے اہم کاغذات ہیں۔

(ایک کاغذ لے کر) یہ کیا لکھا ہے۔ میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔

یہ ایک جواب کا مسودہ ہے جو ہمارے منشی صاحب نے مرتب کیا ہے۔

پہلے اس نے یہ کیا لکھ مارا ہے۔ نہ فارسی، نہ عربی، نہ ترکی، نہ تامل کی، نہ تلگو کی، نہ سر کی۔

یہ ہمارے منشی صاحب کی زبان ہے

لیکن یہ کہاں کی زبان ہے کہ پڑھنے والے کا حلق چھل جائے۔ یوں ہی سڑکوں کی گرد کھا کر لوگوں کے گلے بگڑ رہے ہیں۔ ان موٹے موٹے لفظوں سے تو مزدور اور بھی پھول جائیں گے۔ (کاٹ چھانٹ کر کے دستخط کر دیتا ہے) دوسرا کاغذ لائیے)

یہ آج کے خرچ کا حساب ہے۔

صاحب مجھ سے نہیں پڑھا جاتا۔ تیسرا کاغذ دیجئے۔

یہ مزدوروں کی عرضی ہے جو پہلے پیش کی تھی۔ کام زیادہ ہے مزدوری کم ملتی ہے۔ مہنگائی الاؤنس نہیں دیا جاتا ہے۔ بیمار پڑیں تو چھٹی نہیں ملتی۔ مرنے پر کوئی کچھ نہیں دیتا۔ اگر آپ نے ہماری فریاد نہیں سنی تو ہم ہڑتال کر دیں گے۔

منیجر: ادھر لائیے (عرضی لے کر غور سے پڑھتا ہے) یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ مزدور دس روپیہ مہینہ زیادہ مانگتے ہیں۔ اب اگر دو سو مزدوروں کو فی مزدور دس روپئے مہینہ زیادہ دیا جائے تو مہینہ دو ہزار یا سالانہ چوبیس ہزار کا خرچ پڑتا ہے۔

یاسمن: آپ مزدوروں کو کیوں نہیں سمجھاتے۔

منیجر: باتوں سے کام نہیں چلتا۔ پہلے ان کی شکایات دور کرنے کا بندوبست کرنا چاہیے۔

یاسمن: ان کی مزدوری بڑھائیے تو سیٹھ صاحب کی آمدنی گھٹ جائے گی۔

منیجر: یہ گتھی اس طرح سلجھ سکتی ہے کہ مزدوری زیادہ دیجئے جو دو ہزار روپئے مہینہ کا خرچ بڑھ جائے گا اس کو پورا کرنے کے لیے سیٹھ صاحب اپنے گھر کا خرچ اس حد تک کم کر دیں۔

یاسمن: کہنے کو بہت آسان ہے مگر سیٹھ صاحب یا منیجر؟ جہاں تک میں جانتی ہوں اس وقت ان کی آمدنی چار ہزار کے لگ بھگ ہے اور اس چار ہزار میں بھی مشکل ہی سے گھر چلتا ہے اب اگر ایک دو ہزار کم ہو جائیں تو گھر والوں کے لیے جینا کٹھن ہو جائے گا۔

منیجر: آپ چالیس روپئے مہینہ میں گزر بسر کرتی ہیں۔ میں سو روپیہ میں گھر کا خرچ چلا سکتا ہوں تو سیٹھ صاحب دو ہزار روپیہ پا کر کیوں خوش نہیں رہ سکتے

یاسمن: آپ کی ہماری اور بات ہے۔ سیٹھ صاحب اونچے گھرانے کے آدمی ہیں وہ چار ہزار سے کم میں زندہ نہیں رہ سکتے

منیجر: اور کارخانہ بند ہو جائے تو ۔۔۔ ۔۔۔
(سیٹھ صاحب داخل ہوتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

(اٹھ کر الگ کھڑا ہو جاتا ہے)

[سی]ٹھ — کارخانہ بند ہونے کا کیا ذکر ہے۔

[یاس]من — کچھ نہیں، مزدوروں نے ہڑتال کرنے کی دھمکی دی تو نئے منیجر صاحب گھبرا گئے۔ اور چاہتے ہیں کہ مزدوروں کو زیادہ مزدوری دی جائے۔

[منیج]ر — جی ہاں۔ اس طرح سے مزدور بھی خوش رہیں گے اور کارخانہ بھی چالو رہے گا۔ بس یہی ایک علاج ہے کہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔

[سیٹ]ھ — جی نہیں، لاٹھی ٹوٹ جائے گی اور سانپ نہیں مرے گا۔

[منیج]ر — مزدور خوش رہیں تو کام اچھا ہوگا۔ کارخانہ کو زیادہ نفع ملے گا۔ اور مزدوری بڑھانے سے جو خرچ ہو وہ آمدنی بڑھنے سے پھر آپ ہی کو واپس مل جائے گا۔

[سیٹ]ھ — اور اگر آمدنی نہ بڑھی تو کیا میں اپنے جیب سے دوں گا

[منیج]ر — کارخانہ بند ہونے سے تو یہی بہتر ہے کہ تھوڑے سے نفع پر کام چالو رہے۔ اس میں آپ کا بھی بھلا ہے اور غریب مزدور کا بھی۔

[سیٹ]ھ — غریب مزدور کے ساتھ تو آپ کو ہمدردی ہے اور مجھ غریب کا کوئی پاس نہیں (درد بھری آواز میں) خدا بہتر جانتا ہے کہ کس مشکل سے زندگی بسر ہو رہی ہے کنگالوں کو چار ہزار روپیہ زیادہ معلوم ہوتے ہیں ارے جن پر گزرتی ہے ان کے دل سے پوچھو۔ اس مہنگائی کے زمانے میں چار ہزار میں کتنی تنگی سے گھر کا خرچ چلتا ہے۔ مزدوروں کا کیا ہے۔ ان کے ماں بیوی بچے سب کماتے ہیں۔ وہ کھا پی کر مزے اڑاتے ہیں۔ مصیبت تو ہم بیچاروں پر ہے کہ ایک کمانے والا اور دس کھانے والے۔

[منیجر] — (سیٹھ صاحب کا مطلب سمجھ کر) آپ مالک ہیں آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ وہ تو میں نے جھگڑا چکانے کے لئے ایک تدبیر بتائی تھی۔ آپ کو پسند نہیں تو کوئی اور طریقہ سوچوں گا۔

[سیٹ]ھ — منیجر صاحب آپ ابھی نئے ہیں وہ جو کچھ کہتے ہیں تا کورا طبل۔ بس وہ مثل پوری اترتی ہے۔ تھوڑے دن یہاں رہ کر سب کا رنگ دیکھئے تو بیوپار چلانے کا ڈھنگ خود ہی آ جائے گا۔

یاسمن — میں بھی یہی کہہ رہی تھی چلتی گاڑی میں روڑے اٹکانا کہاں کی عقلمندی ہے (پردیسی سے) ابا کارخانہ کو اسی طرح چلنے دیجئے اور مزدوروں کو سمجھا بجھا کر جھگڑا چکا دیجئے

سیٹھ — کیسی بھولی لڑکی ہے۔ ارے یہ جھگڑے کب چکے ہیں۔ کس سے چکے ہیں۔ اور کس طرح مٹ سکتے ہیں۔ جیسا دھندا چل رہا ہے چلنے دو اور اگر کوئی جھگڑا نکالنے کے لئے عرضی دے اس کی عرضی پھاڑ کر پھینک دو۔ (سیٹھ صاحب پردیسی کے ہاتھ سے عرضی لے کر پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں)

منیجر — دیکھئے۔ بے ادبی معاف۔ اس جھگڑے کا یہی نتیجہ ہوگا۔ یعنی جیسا سو ہارا اور ہارا سو مرا۔

سیٹھ — بس۔ آپ خاموش رہیے۔ اتنے سال علم سیکھا ابھی تک آپ کو عقل نہیں آئی۔

منیجر — جی میں نے عقل کھو کے علم سیکھا ہے۔ جیسے بعض عقلمند علم سیکھ کر عقل کھو دیتے ہیں۔

یاسمن — یہ سچ ہے ابا جی کچھ نہ کچھ کھو کے سیکھا ہے۔ میں نے بچپن میں سینے سیکھنے کے شوق میں کتابیں کھو دی تھیں۔

سیٹھ — جاؤ اس نوک جھونک بندی کو ختم کر کے آج کا کام شروع کر دو۔ پہلے کام بعد کلام (یاسمن اور منیجر چلے جاتے ہیں)

(نوکر داخل ہوتا ہے)

نوکر — نثار احمد صاحب تشریف لائے ہیں

سیٹھ — انہیں یہیں بلاؤ (نوکر چلا جاتا ہے) (نثار احمد داخل ہوتے ہیں۔ شیروانی اور پاجامہ پہنے ہیں۔ عمر تیس سال)

سیٹھ — آئیے۔ میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔

نشار (کرسی پر بیٹھ کر) آپ نے ہماری یادداشت کا جواب نہیں دیا

سیٹھ میں نے ایک کمیٹی بٹھا دی تھی اس سے زیادہ کیا کر سکتا تھا۔

نشار اس کمیٹی کے صدر کون تھے؟

سیٹھ آپ کو معلوم ہے میں خود اس کا صدر تھا۔

نشار اور معتمد

یہ بھی آپ جانتے ہیں معتمدی کا عہدہ بھی میں ہی سنبھالتا رہا۔

نشار اور ممبر۔ کمیٹی کے ممبر کون تھے۔؟

سیٹھ اب آپ سے کیا چھپانا ہے میں اکیلا کمیٹی کا ممبر تھا

نشار یوں کہیے کہ آپ خود مجسم کمیٹی تھے۔ جس وقت آپ کرسی پر بیٹھتے تو کمیٹی کا جلسہ ہوتا اور جب اٹھ کھڑے ہوتے تو کمیٹی برخاست ہوتی۔

سیٹھ یہ کمیٹی آج دو سال سے اپنا کام کر رہی ہے لیکن ابھی تک اس کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آپ چاہتے کیا ہیں۔

نشار اگر میں یہ بتا سکتا تو پھر جھگڑا کس چیز کا تھا۔

سیٹھ بس معلوم ہو چکا آپ کو صرف جھگڑا کھڑا کرنا آتا ہے میں آپ سے پھر ایک دفعہ کہتا ہوں کہ کارخانے کے مزدوروں کو اپنے حال پر چھوڑ کر کوئی دوسرا کام کیوں نہیں کرتے

نشار قدرت نے مجھے اسی کام کے لیے بنایا ہے۔ کوئی دوسرا کام کر سکتا تو آپ کے کارخانہ کو ٹھوکر کون مارتا؟

سیٹھ زبان سنبھال کر گفتگو کیجیے۔ آپ بھول رہے ہیں کہ میں اس کارخانہ کا مالک ہوں۔ اور آپ کے ساتھی میرے مزدور ہیں۔

نشار بیشک۔ مگر میں ان مزدوروں کا سردار ہوں اور یہ سب میری فوج کے سپاہی ہیں۔

سیٹھ (طنز سے) فوج کے سپاہی! پھر تو ضرور ان کے پاس ہتھیار بھی ہوں گے۔ کہیں شہر پر دھاوا نہ بول دیں۔

نشار ان کے ہتھیاروں کی جھنڈیاں ہیں جن کی مدد سے وہ دنیا کو فتح کر سکتے ہیں۔ یہ شہر کس گنتی میں۔

سیٹھ اس وقت آپ جوش میں ہیں میں پھر کبھی آپ سے گفتگو کروں گا۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ اس شہر میں میں نے کارخانہ کھول کر مزدوروں کی روٹی کپڑے کا بندوبست کیا ورنہ چاہتا تو اپنا روپیہ سود پر چلا سکتا تھا جس میں زیادہ فائدہ ہوتا۔ مگر میں نے سود کے خیال کو دل سے نکال کر صرف غریبوں کی خاطر منافع لینے لگا۔ اس میں کیا برائی ہے۔

نشار کوئی برائی نہیں اگر آپ۔ ان سے کام لے کر رات چین سے گزارے کے لیے مزدوری برابر دیں۔

سیٹھ مزدوری تو ہر روز کے روز دی جاتی ہے کون کہتا ہے کہ مزدوری نہیں ملتی۔

نشار ملتی ہے مگر پیٹ نہیں بھرتا۔ تن نہیں ڈھکتا۔ گھر نہیں چلتا۔

سین دوسرا

منظر۔ نظر باغ

(یاسمن اور پردیسی صاحب ٹہلتے ہوئے باتیں کر رہے ہیں)

پردیسی آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کا مکان کہاں ہے آپ کے ابا کا کیا نام ہے اور وہ کیا کام کرتے ہیں۔

یاسمن (بناوٹ سے) میرا کوئی مکان نہیں۔ ہاں ایک ٹوٹا پھوٹا سا گھروندا ہے جسے پردیسی مجھے خوش کرنے کے لیے کبھی مکان اور کبھی بنگلہ کہتے ہیں۔

پردیسی خیر۔ اسی گھر کا پتہ بتائیے۔

یاسمن وہ گھروندا ایسی اندھیری گلی میں ہے کہ [illegible] تو

اس کا پتہ نہیں چل سکتا۔

پردیسی: گھر کا پتہ رہی اپنے ابا کا نام ہی بتا دیجئے۔

یاسمین: آپ میرے ابا کا نام معلوم کرکے کیا کریں گے وہ ایک گمنام غریب آدمی ہیں جو کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتے اور نہ کسی سے ملتے ہیں اور نہ بات کرتے ہیں۔

پردیسی: میں ان سے ملوں گا اور میں اپنی ایک گزارش ان کے کانوں تک پہنچاؤں گا مجھے یقین ہے کہ وہ ہرگز اسے نہ ٹالیں گے۔

یاسمین: لیکن ان کے پاس دھرا کیا ہے جو آپ کی مدد کریں۔ آپ کسی دولت آدمی کے محل کا دروازہ کھٹکھٹائیے شاید آپ کی مراد بر آئے۔ کوئی ایسا امیر جیسے ثروت بھائی ہیں۔

پردیسی: مجھے دولت کی پروا نہیں۔ کم سے کم ایسی دولت کی جو سیٹھ ثروت بھائی کے پاس ہے۔ میں جس دولت کی بھیک چاہتا ہوں وہ صرف آپ کے ابا ہی کے دروازے سے مل سکتی ہے۔

یاسمین: (جھینپ کر) میں نہیں سمجھی آپ کیا چاہتے ہیں۔

پردیسی: میں بس ایک عرضی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ دوہری عرضی۔ بحالی یا نوطرفی۔ (یاسمین ایک بنچ پر بیٹھ جاتی ہے)

یاسمین: (حیرانی سے) آپ تو عرضیاں دینے کا خبط ہے پرسوں آپ نے سیٹھ ثروت بھائی کو عرضی دی اور دو سو روپئے کے منیجر ہوگئے۔ پھر اب کیسی نئی عرضی دینے کی سنک سمائی ہے۔

پردیسی: یہ تو بہت پرانی سنک ہے۔ اتنی پرانی کہ بابا آدم کے پہلے سے چلی آتی ہے۔ (یاسمین کے پاس بیٹھ جاتا ہے)

یاسمین: میں نہیں سمجھی۔ آپ کیسی پہیلیاں بجھوا رہے ہیں؟

پردیسی: میں کیسے سمجھاؤں۔ بات یہ ہے کہ مجھے ایک ساتھی کی تلاش ہے۔ جو اپنے نام کے ساتھ میرا نام بھی لکھے ایک ایسا ساتھی جو دن رات میرے ساتھ رہے جب تک میں تندرست رہوں میرا دل بہلائے مجھے اچھے

کھانے کھلائے۔ مزے مزے کے لطیفے سنائے جب تک گھر میں رہوں میرا منہ تکے۔ جب باہر چلا جاؤں تو میری راہ دیکھے۔ مجھے کسی کام سے نہ روکے اور میری کسی بات کو نہ ٹوکے۔ وہ بیمار پڑے تو میں اس کی تیمارداری کر سکوں۔ لیکن خدا نہ کرے میں بیمار پڑوں تو وہ دن کا چین اور رات کی نیند اچاٹ کرلے۔

یاسمین: یعنی ساری اچھائیاں اس کے اندر جمع ہو جائیں تاکہ برائیوں کا ٹھیکہ آپ کو مل سکے۔

پردیسی: ہرگز نہیں میں تو برائیوں کے نام سے کوسوں دور بھاگتا ہوں۔ بے حالی میں میں نے ہزاروں برے کام کئے مگر یقین مانئے کبھی بھولے سے بھی اپنے بارے میں کوئی برا خیال دل میں نہ لایا۔

یاسمین: بڑی اچھی عادت ہے جو لوگ اپنے کو برا سمجھتے ہیں وہ کبھی کوئی اچھا کام نہیں کر سکتے۔ گو اپنے کو اچھا سمجھنے والے ہزاروں برے کام کر جاتے ہیں۔

پردیسی: بس بس میں ایسا ہی ساتھی چاہتا ہوں جو میری اچھی نصیحتوں کو سنے اور بری عادتوں کو نہ دیکھے۔

یاسمین: اور جو آپ کی اس ساتھی سے طبیعت میل نہ کھائے یا آپ پرانے خیال کے اور وہ نئے فیشن کی دلدادہ ہو یا آپ چڑچڑے اور وہ ماتمی۔ آپ غریب اور وہ امیر۔ آپ کنجوس اور وہ فضول خرچ ہو تو؟

پردیسی: میں چاہتا ہوں کہ صبح شام لڑائی جھگڑوں کا مزہ ملے کبھی وہ روٹھے اور میں منا لوں کبھی میں خفا ہو جاؤں اور وہ پاؤں پڑے اور جب جھگڑے بڑھتے بڑھتے حد سے بڑھ جائیں تو وہ اپنے میکے کا راستہ لے اور میں اپنے گھر میں بیٹھ کر بنسی بجاؤں پھر وہ خود دوسرا بیاہ نہ کر سکے اور میں دو تین سہرے باندھ لوں .... مگر وہ زبان سے اف تک نہ کرے۔ مختصر یہ کہ وہ خوبصورت ہو نرم مزاج ہو۔ سمجھدار ہو۔ پڑھی لکھی ہو جیسے

جوان ہو۔ خوش مذاق ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر
اس کے ساتھ طبیعت میں صبر۔ دل میں ہمت
ہاتھ پاؤں میں طاقت۔ چہرے میں رنگ ۔ ۔ ۔ ۔

یاسمن پھر تو آپ اخلاق کی کوئی اچھی سی کتاب خرید لیجئے۔ یا کسی زمانہ رسالہ کا سالنامہ جس میں ترکیہ زندگی پر مضامین ہوں۔ ورنہ کہیں آپ کو ایسا ساتھی نہیں ملے گا۔ یا شاید ملے تو پھر کوہ قاف کی رہنے والی ملے گی۔

پردیسی کوہ قاف کی پری یا جنت کی حور اب کسی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی۔ ہاں وہ جو ایک کنگال ملک تھا جس کی سب بستیاں کھنڈر بن گئی ہیں۔ بس ہم تو اسی اجڑے دیس کی مٹی سے بنی ہوئی ایک موہنی مورت کو دل دے چکے ہیں۔

یاسمن آپ تو بڑے دل پھینک نکلے۔ تیس برس کے ساتھی کو تیس گھنٹوں کے اندر ایک اجنبی کے قدموں میں ڈال دیا۔ اگر یہ دل ایسی ہی بے کار چیز تھی تو اتنے برس تک اسے اپنے پہلو میں کیوں جگہ دی۔

پردیسی یہ نکتہ میرے دل سے نہیں اپنی آنکھوں سے دریافت کیجئے۔

یاسمن اس میں نہ آپ کے دل کا قصور ہے نہ میری آنکھوں کا۔ یہ شکایت نظر کی خرابی سے پیدا ہوتی ہے۔

پردیسی کیا آپ کو میری کسی بات کا یقین نہیں۔

یاسمن کیسے یقین کروں آپ ہی بتائیے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ آپ نے سیٹھ تروت بھائی سے وعدہ کیا تھا کہ دن دونی رات چوگنی محنت کر کے نمک کا حق ادا کریں گے۔ اب جب کہ مزدوروں نے کام روک دیا ہے اور دو دن سے کارخانہ بند ہے آپ اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر لطف باغ میں میرے ساتھ بحث لڑا رہے ہیں

پردیسی میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ سیٹھ صاحب کو کئی تجاویز

صلاح دی۔ انہوں نے میرا کہنا نہ مانا۔ مزدوروں کو سمجھاتا ہوں مگر وہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آتے۔ آخر تھک کر سب کے ساتھ میں نے بھی چھٹی منانے کی ٹھان لی۔

یاسمن یہ نہ سوچا کہ چند دن اور یوں ہی کارخانہ بند رہے تو میری اور آپ کی روزی کا سہارا جاتا رہے گا۔

پردیسی کہا سچ ہے۔ دنیا کارخانہ تو بند نہ ہوگا۔

یاسمن بس یہی ہے آپ کی وفاداری اپنے مالک کے ساتھ

(دور سے مزدوروں کے گانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پردیسی اور یاسمن غور سے سنتے ہیں)

"غیرت کی ہے جو رت ای
تو ہار بھی لیم ہے جیت ای
ہے سب سے اونچی ہماری جھنڈی ہماری جھنڈی ہماری جھنڈی
سوائے گلوں کے رہنے والو
ملک کے جھال سینے والو
ہے سب سے اونچی ہماری جھنڈی ہماری جھنڈی ہماری جھنڈی
اسی کا منے جو دم بھریں گے
اسی کی سوا میں کٹ مریں گے"

یاسمن ہمارے مزدوروں کا جلوس معلوم ہوتا ہے چلو چل کے دیکھیں گے

(دونوں چلے جاتے ہیں۔ نواب سرفراز اور خانساماں داخل ہوتے ہیں)

نواب خانساماں۔ ہم نے صاحبزادے کو گھر کا کام کاج کرنے سے روکا تھا اور دکان لگا کر بیٹھنے سے منع کیا تھا تو اس میں ماں باپ سے جھگڑنے کی کیا بات تھی۔ ہم ہی بتاؤ ایسے بڑے گھرانے کے سپوت معمولی لوگوں کی طرح کام دھندا کریں تو خاندان کی کتنی بدنامی ہے۔

خانساماں جی ہاں سرکار۔ کام کاج بیوپار دھندا نوکری چاکری یہ سب ہم غریبوں کے لئے ہیں۔ بھلا آپ جیسے امیر جہیں خدا گھر بیٹھے لاکھوں دیتا ہے سوچئے بس کے لئے نہیں محنت کر کے اپنی عزت کو بٹا لگاتے ہیں۔

نواب (خوش ہو کر) یہی تو میں بھی کہہ رہا تھا۔ مگر نعیم کی سمجھ

پر بھم پڑ گئے ہیں۔ نہ جانے کالجوں میں کیا کیا واہیات
کتابیں پڑھاتے ہیں جو نوجوانوں کی یوں مٹی خراب
ہو رہی۔ ارے ہمارے زمانہ میں بھی شرفا علم
سیکھتے تھے مگر بس اتنا کہ جیسے کھانے میں نمک۔ یہ نہیں
کہ دن رات دیمک کی طرح کتابیں چاٹ رہے ہیں
اور پھر ہم جو کچھ پڑھتے تھے اس سے نہ دماغ پر بار
پڑتا تھا نہ صحت پر برا اثر۔

خانساماں سرکار۔ اس زمانہ کے لوگ اب کہاں ہیں ہمارے
بچپن کا واقعہ ہے۔ بڑے سرکار خدا بخشے اس وقت
زندہ تھے ناشتہ میں ایک بکرے کی یخنی۔ دوپہر کے
کھانے میں اونٹ کا بچہ ملا ہوا۔ رات کو دو وقت مرغ
دم دئے ہوئے چار سیر ارنڈ بیل کے گھڑی بھر
میں چٹ کر جاتے تھے۔ آج کل کے بچوں کو دو تولہ
آٹا ہضم نہیں ہوتا۔

نواب تمہیں بتاؤں خانساماں۔ اب کیا کیا جائے۔
اخباروں میں اشتہار دیا دوست احباب کے پاس
آدمی بھجوائے۔ کلب میں دکھوایا۔ ہوٹل میں
دریافت کیا۔ کہیں شمیم کا پتہ نہیں۔

خانساماں حضور۔ چھوٹے سرکار کی اللہ عمر بڑی کرے۔ وہ
کوئی بچہ نہیں۔ اب کے رمضان میں بیس برس
پورے ہوں گے۔ دو چار دن باہر رہ کر خود ہی
واپس آجائیں گے۔ حضور کیوں اپنی جان ہلکان
کرتے ہیں۔

نواب خانساماں۔ سر اصل میں مضبوط ہے مگر بیگم صاحبہ کی
پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ ان کو کون سمجھائے
کہ لڑکا اب سیانا ہو چکا ہے۔ اپنی دیکھ بھال آپ
کر سکتا ہے۔ وہ تو ابھی تک اس کو دودھ پیتا بچہ
ہی سمجھی ہے

خانساماں سچ ہے ماں کی ممتا بری ہوتی ہے۔

نواب انہیں کے لاڈ پیار نے اس لڑکے کی یہ گت
بنائی ورنہ مجال نہ تھی کہ میرا حکم ٹالتا۔

خانساماں ایک اور جگہ تلاش کرتا ہوں میرا ملا ہی دیتا
ہے کہ چھوٹے سرکار وہیں گئے ہیں

نواب کون سی جگہ؟

خانساماں سیٹھ ثروت بھائی کا کارخانہ

نواب لیکن میں تو انہیں جانتا اور نہ شمیم نے کبھی ان کا نام
لیا۔ وہ کیوں انہیں کے پاس کیوں جانے چلا

خانساماں مالک۔ جان بخشی ہو تو عرض کروں۔

نواب کہو کہو۔

خانساماں کوئی آٹھ دس دن پہلے ایک دن شمیم میاں موٹر میں
ادھر سے گزر رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔
انھوں نے اس کارخانہ سے ایک حسین لڑکی کو نکلتے دیکھا
کیا عرض کروں سرکار۔ کیا حسن تھا اور پھر اس پر وہ
نیا فیشن کا لباس۔ دیکھتے ہی شمیم میاں بری طرح پیچھے
گئے اور موٹر ٹھہرا کر اس لڑکی کے حالات پوچھنے لگے

نواب آخر وہ کون لڑکی تھی جو کھلے بندوں یوں راستہ
پر چل رہی تھی۔ کوئی ایسی ویسی عورت ہو گی۔

خانساماں اس کے بارے میں بس اتنا پتہ چلا کہ وہ سیٹھ ثروت
بھائی کے کارخانہ میں ٹائپ کرتی ہے۔ اس سے
زیادہ اس کا حال کوئی نہ بتا سکا۔

نواب کیا کہا۔ لڑکی اور دفتر میں ٹائپ کرتی ہے۔

خانساماں اس دن سے شمیم میاں کے تیور ہی بدل گئے اور وہ
ہر گھڑی کسی خیال میں ڈوبے رہتے تھے میں تاڑ گیا
کہ اس لڑکی کا دھیان بندھا ہے۔ حکم ہو تو ابھی
جا کر انہیں ڈھونڈ نکالتا ہوں۔ میرا گمان ہے کہ
وہ وہیں ملازم ہو گئے ہیں

نواب (بھرائی ہوئی آواز میں) خانساماں میں یہ کیا سن رہا
ہوں۔ ارے اس بڑھاپے میں یہ داغ کیا کم
تھا کہ بیٹا کارخانہ میں ملازم ہو جائے۔ اب اس
پر اگر بہو بھی ایسی ملے جو اپنی روزی آپ کماتی ہو
تو میں موت سے پہلے مر جاؤں گا۔ میرے خدا میرے
خدا میں یہ ذلت سہنے کے لیے کیوں زندہ رہا ہوں

اس کا جنازہ بیچ کر مت آجائے یا پیں اس دنیا
سے اٹھ جاؤ

خانساماں مالک۔ موت آئے آپ کے دشمنوں کو۔ آپ کیوں رنجیدہ ہوتے ہیں۔ میں کھانا کر چھوٹے میاں کو وہاں سے واپس بلا لاؤں گا۔

نواب خانساماں۔ نہیں میں اس مردود کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ جس نے میرے باپ دادا کی عزت گنوائی۔ چودہ پیڑی سے ہمارے گھرانے میں کسی نے روٹی کمانے کی ذلت نہیں اٹھائی تھی میرے دادا مرحوم خدا بخشے اگر ان کے سامنے کوئی نوکری کا نام لیتا تو وہ اس مدحت کی زبان کٹوا دیتے۔

خانساماں حضور! اب تو زمانہ بدل گیا ہے۔ مرد تو مرد عورتیں تک محنت مزدوری کرنے لگی ہیں۔

نواب (غصہ سے) زمانہ بدل گیا ہے تو بدل جائے وہ میں نہیں بدلوں گا۔ اگر میرا بیٹا یا میری بہو محنت مزدوری کر کے معمولی آدمیوں کی طرح زندگی گزارنا چاہے تو یا تو میں اسے زہر دے دوں گا یا خود زہر کھا لوں گا۔

(نواب سرفراز اور خانساماں باغ سے چلے جاتے ہیں دوسری طرف سے یاسمن اور پردیسی واپس آتے ہیں۔)

پردیسی (یاسمن کے پیچھے چلتے ہوئے) اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو میں اس کارخانے کی خاطر اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس جھگڑے کو مٹانے کے لیے میں اپنی جان لڑا دوں گا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ آپ کو اس کاروبار سے اتنی دلچسپی ہے میں تو سمجھتا تھا کہ شاید سیٹھ صاحب کے ہنگامہ خیز خطابات کرنے کرتے آپ کا دل اکتا گیا ہوگا۔ اور آپ کچھ دن آرام لینا پسند کریں گی۔

یاسمن (بگڑ کر) سیٹھ صاحب کے خطاب ہرگز ہمل نہیں۔

پردیسی یا اپنا اپنا خیال ہے۔ میں تو اس سارے دھندے کو بیکار اور فضول سمجھتا ہوں جس سے دنیا کا فائدہ ہے نہ دین کا۔

یاسمن تو پھر آپ سیٹھ صاحب کی نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے

پردیسی میں کہہ چکا ہوں مجھے اپنی تنخواہ سے دلچسپی ہے اور تنخواہ سے زیادہ ایک ایسی سندر صورت سے دلچسپی ہے جس کی رنگا رنگی سے ہندوستان کا یہ کارخانہ جس کا نگار خانہ بن گیا ہے۔

یاسمن (جھینپ کر) اصل میں آپ کو اپنے سوا کسی سے دلچسپی نہیں۔

پردیسی اب یہ کیسے باور کراؤں کہ کس کے ساتھ دلچسپی ہے اور کس کے ساتھ نہیں۔ پرانے شاعروں کی طرح سینہ چاک کر کے اپنا دل دکھانے سے تو رہا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ اس ایک دل میں ہزاروں آرزوئیں ہیں۔

یاسمن ان آرزوؤں کو دل ہی میں رہنے دیجئے۔

پردیسی کیوں؟

یاسمن اس لیے کہ اگر یہ ساری آرزوئیں دل سے نکل جائیں تو پھر دل میں کوئی آرزو باقی نہیں رہے گی اور آپ جانتے ہیں جس دل میں آرزو نہ ہو وہ دل پتھر کے برابر ہے

پردیسی اس دلفریب منطق کی دل کھول کر داد دیتا مگر کیا کروں دل نہیں مانتا (محبت بھرے لہجے میں) یاسمن!

یاسمن درست۔ زندگی بھی عجیب نعمت ہے۔

پردیسی ہاں اگر دولت اور محبت دم کا ساتھ دے۔

یاسمن یہ ضروری نہیں کہ دولت ثروت۔ محبت اور کامیابی ہی کی زندگی ہو۔ بلکہ محض سانس لینا بھی اپنے اندر ایک کیفیت رکھتا ہے۔

پردیسی اس عمر میں بیشک۔ اس کے بعد پھر ساری دنیا کی لذتیں ہیچ ہیں (یاسمن اور پردیسی پھر بیٹھ جاتے ہیں)

یاسمن کیا اچھا ہوتا اگر وقت کا چکر اس وقت رک جاتا

اور ہم دونوں اسی حال میں بیٹھے ہیں۔ اسی حال میں ہمیشہ کے لیے بیٹھے رہ سکتے۔ اس باغ کی کلیاں یوں ہی مسکراتیں۔ پرندے اسی طرح چہچہاتے۔ حسن کی بہاریوں ہی تازہ رہتی۔ شباب کا دل اسی طرح زندہ رہتا۔

پردیسی اسی سدا بہار زندگی کے لیے میں نے تصویریں بنانا شروع کی تھیں مگر جب میں نے یہ محسوس کیا کہ تصویر کے پھول بھی اسی طرح مرجھانے لگتے ہیں جس طرح اصلی پھول تو یہ شغل بھی چھوڑ دیا۔ پھر ایک نیا خیال دل میں پیدا ہوا۔

یاسمن کیسا خیال؟

پردیسی خیال کہ جب یہاں کی ہر چیز آنی جانی ہے تو پھر اسی ایک آن میں ہزاروں برس کی بہار کا رنگ بھر کے تماشا دیکھنا چاہیے۔

(یاسمن کے لیے ڈالی سے ایک پھول توڑتا ہے)

یاسمن پھول توڑتے ہوئے آپ کا ہاتھ کیوں کانپ رہا ہے؟

پردیسی نہیں تو۔ یہ آپ کا وہم ہے۔

یاسمن دوست۔ سیٹھ صاحب سچ کہتے ہیں تعلیم پا کر بھی آپ کو عقل نہیں آئی۔

پردیسی ایسی عقل سے جو اپنے نفع کے لیے دوسروں کا نقصان کرائے۔ زندگی بگڑتی ہے سنورتی نہیں۔

یاسمن خیر۔ مگر علم تو زندگی کی بڑی سے بڑی گتھی کو سلجھا سکتا ہے۔

پردیسی علم سے الجھن اور بڑھتی ہے۔ جتنا زیادہ علم سیکھئے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کچھ بھی نہیں معلوم ہے۔

یاسمن بیسویں صدی میں آپ ایسے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ آج کل جسے دو حرف لکھنا آئے وہ اپنے آپ کو ارسطو اور افلاطون سمجھتا ہے اور اپنی الگ دوکان سجا کر بیٹھ جاتا ہے۔

پردیسی ان شخصوں کی سمجھ پر پتھر پڑ گئے ہیں جو زندگی کے گورکھ دھندے کو سمجھا ہوا سمجھتے ہیں۔

یاسمن پھر کھوٹے سکوں کو کون پرکھ سکتا ہے۔ سودا کرنے سے کام ہے اور آج کل تو ہر چیز کا سودا ہونے لگا ہے یہاں تک کہ دوستی اور محبت کا بھی۔ لیکن جب ساری دنیا اسی راہ پر جا رہی ہے تو آپ کیوں الگ راستے ڈھونڈ رہے ہیں۔؟

پردیسی میں خود بھی اس کی وجہ نہیں سمجھتا۔ شاید یہ میری بے وقوفی ہو۔

یاسمن یا ضرورت سے زیادہ چالاکی۔

پردیسی تو یہ ایک ہی ہے یعنی یار دوستوں میں اپنی ہنسی۔ چلئے اب شام ہو رہی ہے۔ گھر چلیں (کونج سے اٹھ کر) آپ سے مل کر اس قدر خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ حیرت ہے کہ آپ سے ملنے سے پہلے میں اتنے برس زندہ کیسے رہا۔

یاسمن دوست۔ میں ایک سوال کروں تو آپ برا تو نہیں مانیں گے۔؟

پردیسی کہئے کہئے۔ اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ اتنی دیر تک آپ گل فشانی کرتے رہے۔ مگر اپنے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ آخر مجھے اتنا معلوم کرنے کا تو حق ہے کہ جو شخص اس قدر دوستی جتا رہا ہو وہ کون ہے۔ کس قماش کا آدمی ہے۔ اس کی فطرت کیسی ہے اس کی عادتیں کس قسم کی ہیں؟

پردیسی میں آپ کو کیا بتاؤں۔ یہ بھید نہ کہنے کے لائق ہے نہ سننے کے قابل۔

یاسمن پھر تو میں ضرور سنوں گی۔ (یاسمن اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

پردیسی تو سنئے۔ میں ایک پراسرار شخص ہوں۔ اس شہر میں سب مجھے جانتے ہیں۔ لیکن کوئی مجھے نہیں پہچانتا میری زندگی میں اب تک ایک ہی اہم واقعہ ہوا یعنی آج سے تیس سال پہلے میں نے اس دنیا میں قدم رکھا۔ اس کے بعد سے پھر کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ اب دو اور کارنامے رہ گئے ہیں۔ ایک میرا بیاہ اور دوسرا میرا آخری سفر۔

یاسمن اس سفر کے لیے آپ نے کوئی توشہ بھی تیار کیا ہے۔ کوئی نیکی جس کی بدولت دنیا آپ کو یاد رکھے۔

پردیسی دنیا میں کوئی نیکی ایسی نہیں جس کا میں نے ارادہ نہیں کیا۔ اور شاید ہی کوئی ارادہ جس کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ شیطان ایسے ناپاک کرتوت کی سزا میں جنت سے نکالا گیا۔ میں ایسے پاک ارادوں کی مدد سے دوزخ کا راستہ صاف کر رہا ہوں۔

یاسمن لفظوں کے ساتھ کھیلنے کی خوب مشق کی ہے۔

پردیسی لفظ ہی نہیں۔ میں تو معنی اور مطلب کو بھی کھیل سمجھ کر دل لگی میں اڑا سکتا ہوں۔ آدھی عمر گزارنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ زندگی کے دردِ سر کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ آدمی ہر کام کو کھیل سمجھ کر کرے اور ہر کھیل کو کام سمجھ کر سکے۔

یاسمن جس شخص کو پیسے بنانے کے سوا کچھ نہیں آتا وہ ایسے مسخرے پن سے مسرور ہو سکتا ہے۔ لیکن اپنی قوم کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔

پردیسی ہماری قوم دو سو سال سے قسمت کو رو رہی ہے اور قوم سے زیادہ قوم کے لیڈر داویلا مچا رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی قسمت کو رونے کے بجائے اگر ہماری قوم کے بعض افراد ہماری بیوقوفی پر ہنسیں تو شاید اس بھول بھلیاں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی دے۔

یاسمن بے وقوف کبھی اپنی بے وقوفی پر نہیں ہنستا وہ تو ہمیشہ دوسروں کی غلطی کا مذاق اڑاتا ہے

پردیسی تو میں دوسروں کو ان کی بے وقوفی پر ہنساؤں گا

یاسمن دوسروں کی ہنسی اڑانے سے مسئلے حل نہ ہوں گے اس کے لیے کوئی اور ترکیب سوچیے۔

پردیسی ذرا صبر کرو۔ پھر دیکھو اس بساط پر کیسا نقشہ جمتا ہے۔

یاسمن کہیں ایسا نقشہ نہ جمائیے کہ ایک چال میں سیٹھ صاحب اور نثار احمد دونوں کو مات ہو جائے

پردیسی وہی تو نقشہ جما رہا ہوں۔

(دونوں چلے جاتے ہیں)

سین تیسرا

(وہی کمرہ جو پہلے ایکٹ کے پہلے سین میں دکھایا گیا پردیسی اور یاسمن ٹہلتے باتیں کر رہے ہیں۔ سیٹھ صاحب کی کرسی خالی ہے)

پردیسی اگر میں اس کارخانہ کا مالک ہوتا تو دماغ کی کسرت ہی کے ساتھ سارا کاروبار چلاتا۔

یاسمن کہنے کی باتیں ہیں۔ جب آن پڑتی ہے تو کسی کو کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتی۔

پردیسی کہنے کی باتیں نہیں۔ کر دکھانے کے کام ہیں۔ اور جو میں کہتا ہوں وہی کر دکھاتا ہوں۔

یاسمن آخر وہ کونسا منتر ہے جس سے سارے بگڑے ہوئے کام بن جائیں

پردیسی سب سے پہلے تو میں اپنی تنخواہ بڑھا لیتا۔ پھر تمہاری تنخواہ دوگنی کر دیتا۔ اس کے بعد مزدوروں کی مزدوری دگنی کر کے سب کام کرنے والوں کے منہ شکر سے بھر دیتا۔

یاسمن واہ بڑی آسان ترکیب ہے اس حساب سے تو آپ پیسہ ہم میں سولہ سو کے ہزار کیا کرے۔

پردیسی یہی نہیں بلکہ جو گاہک مال خریدنے آتے ہیں ان سے کہتا بھائی جو تمہارا جی چاہے اٹھا لے جاؤ۔ دام کی فکر نہیں۔ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔

یاسمن سچ ہے۔ سارا مول یار حرص سے چوپٹ ہو جاتا اور آپ گھر بیٹھے بین بجاتے۔ کارخانہ جہنم میں جائے آپ کی بلا سے۔

پردیسی یاسمن۔ اگر چند چھوٹے سے کارخانے جہنم میں جانے سے دنیا کا یہ بڑا کارخانہ جنت کا نمونہ بن سکتا ہے تو کیا زندگی کے ایسے کاروبار میں تمہیں کچھ بھی نفع نہیں نظر آتا۔ تم جانتے ہو یہ سب جھگڑے کیوں

ہیں اس واسطے کہ سب کو روپیہ کمانے کی دھن ہے ۔ دولت سمیٹنے کا خبط ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ یہ الٹا کھاتہ ہے ۔

تو بسم اللہ نیک کام میں دیر کیا ہے ۔ لٹا دیجئے ۔ سیٹھ تردب بھائی کا کارخانہ ۔ ان کی جائداد گھر کی پونجی ۔

مگر اس سے پہلے تو ایک بار سیٹھ صاحب ہی کیا ۔ ساری دنیا کے کارخانے اس بازی میں لگا دوں ۔

فقط ایک دھندلی سی آس میں کہ شاید اسی بہانے محبت کا پانسہ میرے حق میں پڑے ۔

اوہ ۔ یہ تو قیس و فرہاد کے افسانے سے بھی زیادہ رنگین خیال ہے ۔ اگلے دنوں کا کوئی شاعر اس وقت موجود ہوتا تو ضرور اس کی داد دیتا ۔

تم سمجھی نہیں ۔ میں کسی اور ہی محبت کی طرف اشارہ کر رہا تھا ۔ جس کو ظاہری حسن سے کوئی لگاؤ نہیں ۔ مجھے ڈر ہے کہ ایسے ساتھ آپ دوسروں کو بھی پاگل نہ بنا دیں ۔ اس لیے اب اس بے تکی گفتگو کو تھوڑی دیر کے لیے ختم کرنا چاہیے (گھڑی دیکھ کر) او ہو ۔ دس بجا چاہتے ہیں ۔ کوئی دم میں سیٹھ صاحب بھی آجائیں گے اور ہمیں سوچ بچار کر کے کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچنا ہی پڑے گا ۔

(سیٹھ تردب بھائی داخل ہوتے ہیں ۔ منیجر صاحب اور یاسمن ادب سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

(کرسی پر بیٹھ کر میز کے کاغذات دیکھتے ہوئے) تو آج تصفیہ کے لیے آخری تاریخ ہے ۔ پھر دیکھا جائے گا (منیجر سے) آپ نے بھی اس بارے میں کچھ سوچا ہے ۔

ایک نقشہ جاتا ہے اگر آپ مان لیں تو آج ہی میدان مار لیا ۔

میں بھی تو سنوں وہ کیا ترکیب ہے ۔

پہلے آپ یہ کہئے کہ مجھ پر آپ کو بھروسہ ہے کہ نہیں

سیٹھ بھروسہ نہ ہوتا تو آپ کو بغیر کسی سفارش کے اس کارخانہ کا منیجر کیسے بناتا ۔

منیجر آپ وعدہ کریں کہ میں جو کچھ صلاح دوں اسے آنکھ بند کر کے مان لیں گے ۔

سیٹھ ہاں ۔ اگر وہ میرے فائدہ کی بات ہو ۔ اور اس سے کارخانہ کو نقصان نہ پہنچے

منیجر میں ایسا سمجھوتہ کرا دوں گا کہ آپ کا اور مزدوروں کا اس میں بھلا ہو ۔

یاسمن تب بھی تو سنوں وہ ایسی کونسی انوکھی ترکیب ہے جس سے سب خوش رہیں ۔

منیجر بس ایسی تدبیر سوجھی ہے کہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے ۔ آپ مزدوروں کے لیڈر کو یہاں بلا لیجئے ۔ میں ابھی ان سے سمجھوتہ پر دستخط لے لیتا ہوں ۔

سیٹھ پہلے مجھے تو سنا دیجئے وہ مسودہ ۔ میری منظوری کے بعد پھر آپ کو اختیار ہے ۔ مزدوروں سے جس طرح چاہیں بات چیت کریں ۔

منیجر دیکھئے اس کی ضرورت نہیں ۔ آپ فرما چکے ہیں کہ مجھ پر پورا بھروسہ ہے اپنے قول کی پچ کیجئے اور میری زبان کی لاج رکھئے ۔

سیٹھ اگر آپ مجھے دھوکہ دیں تو پھر سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا ۔ آپ ابھی ہیں اور آپ ہی نے کہا تھا کہ کسی شہر میں ایک مہینے سے زیادہ نہیں ٹکتے اور اپنے دیس میں بھی پردیسی کہلاتے ہیں ۔ فرض کیجئے کہ آج جھانسا دیکر کل آپ یہاں سے چلتے بنے ۔

منیجر آپ کارخانہ کے مالک ہیں ۔ اور کوئی سمجھوتہ آپ کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا ۔ میری صرف اتنی عرض ہے کہ مزدوروں کے لیڈر کو آ جانے دیجئے ۔ پھر آپ کے سامنے ان سے بات چیت ہوگی ۔ اور جو کچھ شرطیں طے ہوں گی وہ آپ ہی کے حکم سے ہوں گی ۔

یاسمن بات معقول ہے اس میں کوئی چال نہیں ہو سکتی ہے

زیادہ دیر کرنے میں اندیشہ ہے۔ آپ مزدوروں کے لیڈر نثار احمد کو بلا لیجئے۔

سیٹھ (گھنٹی بجا کر نوکر کو بلاتے ہیں) دیکھو جو مزدوروں کے گرو گھنٹال بیٹھے ہیں۔ انہیں اندر بلا لو۔

نوکر بہت خوب (چلا جاتا ہے)

منیجر مس یاسمین۔ آپ کا میں شکر گزار ہوں۔ اگر آپ اس وقت میری حامی نہ بھرتیں تو سیٹھ صاحب کبھی حامی نہ ہوتے۔ آپ بھی کیا یاد کریں گی۔ نثار احمد صاحب پر ایسا جادو چلاتا ہوں کہ ان کی ساری رفو چکر ہو جائے۔ ہوں۔

(نثار احمد صاحب داخل ہوتے ہیں)

نثار آداب عرض ہے۔

سب آداب عرض ہے۔

نثار آپ نے مجھے بلایا تھا؟

سیٹھ جی ہاں۔ تشریف رکھیے۔

نثار آپ کو معلوم ہے سمجھوتہ کے لیے آج کا آخری دن ہے۔ آج اگر ہماری شرطیں منظور نہ کی گئیں تو کل سے سارے مزدور شہر چھوڑ کر اپنے گاؤں کو چلے جائیں گے۔ اور آپ کو اس شہر میں کوئی دوسرا مزدور نہ ملے گا اور کارخانہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔

منیجر ہم جانتے ہیں اسی لیے آپ کو تکلیف دی گئی ہے۔ آپ کی آخری شرطیں کیا ہیں۔

نثار فی مزدور مہینہ دس روپئے مزدوری بڑھا دیجئے

منیجر منظور۔ آگے چلیئے۔

سیٹھ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس طرح سے تو سارے کارخانہ پر انہیں کا قبضہ ہو جائے گا

منیجر معاف کیجئے۔ بات چیت ختم ہو جانے تک آپ ذرا اطمینان سے بیٹھ کر حقہ سے شغل فرماتے ہیں۔

سیٹھ واہ۔ کیا خوب۔ میری عمر بھر کی پونجی لٹ جائے اور میں اطمینان سے حقہ کے کش لگاتا تماشہ دیکھوں

منیجر سب کے آگے میں آپ ہی کا حکم چلے گا گھبرائیے نہیں۔

یاسمین ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ ذرا خاموش رہیں۔

منیجر اچھا اور بھی کوئی شرط ہے۔

نثار مستری کو برطرف کر دیا جائے۔

منیجر منظور۔ میں خود کام کی دیکھ بھال کیا کروں گا۔ بس ختم ہو چکیں آپ کی شکایتیں یا اور بھی کچھ باقی ہیں؟

نثار بس اور کوئی شکایت نہیں۔

منیجر اب تک ہم آپ کی سنتے رہے اور جو کچھ آپ نے کہا بغیر کسی تکرار کے مان لیا۔ اب ہماری بھی ایک عرض سن لیجئے۔

نثار فرمائیے اگر واجبی شکایات ہوئیں تو ان کو دور کیا جائے گا۔

منیجر کل سے مزدوری بڑھا دی جائے گی۔ کام کے گھنٹے کم کر دئے جائیں گے۔ چھٹیوں کی تنخواہ نہیں کاٹی جائے گی۔ مستری کا حساب چکا دیا جائے گا۔ اور میں خود کام کی دیکھ بھال کروں گا۔ مگر ایک شرط پر۔ اور وہ یہ ہے کہ جب تک مشین چلتی رہے مزدور کام کرتے رہیں گے۔ آہستہ کام کرو کی تحریک واپس لے لی جائے گی۔

سیٹھ (خوش ہو کر) یہ سمجھداری کی بات ہے۔ بخدا اب جو ہی بات گیا صاحب کچھ طے ہوگا اس میں سب کا فائدہ ہوگا مالک بھی خوش رہے گا اور نوکر بھی۔ کیوں صاحب آپ کو یہ شرطیں منظور ہیں۔ کہیے ہاں یا نہیں۔ آج آخری دن ہے نا۔

یاسمین دیکھئے منیجر صاحب بڑی واجبی چیز بتلا رہے ہیں جس پر کسی کو حرف رکھنے کا موقع نہیں ملے گا آپ سے امید ہے کہ آپ ضرور اس پر دھیان دیں گے۔

منیجر (نثار کو خوش کرنے کے لیے) آپ ہماری قوم کے لیڈر ہیں سارے ملک کی آنکھیں اس وقت آپ پر لگی ہوئی ہیں۔ آپ کی ایک ہاں سے ہی گیا ساری دنیا کا

کاروبار میں سکتا ہے

نثار (خوش ہو کر) منظور۔

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

سیٹھ کون ہے؟

خانساماں جی میں ہوں۔

سیٹھ میں کون؟ بھلے مانس اپنا نام کیوں نہیں بتاتے

خانساماں نواب سرفراز کا خانساماں۔ کیا میں حاضر ہو سکوں۔

(اندر داخل ہوتا ہے)

سیٹھ داخل تو ہو چکے ہو۔ پھر اب اجازت کاہے کی۔

(خانساماں کو دیکھ کر منیجر پریشان ہوتا ہے)

خانساماں شمیم میاں کو آداب عرض ہے۔

سیٹھ شمیم میاں! کیا پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔ یہ تو ہمارے نئے منیجر مسٹر پردیسی ہیں۔

خانساماں جی نہیں۔ بے ادبی معاف۔ یہ ہمارے نواب سرفراز کے صاحبزادے شمیم میاں عرف چھوٹے نواب ہیں۔

سیٹھ کیوں مسٹر پردیسی۔ کیا یہ سچ ہے؟

منیجر (کھسیانہ ہو کر) جی ہاں۔ کچھ کچھ صحیح ہے۔

سیٹھ جب آپ کا نام شمیم تھا تو یہ فرضی نام بتا کر مجھے دھوکا دینا کیا معنی رکھتا ہے

شمیم (جھینپ کر) میں کیا عرض کروں..... وجہ کچھ ایسی ہے کہ میں بتانا چاہتا ہوں تو بھی نہیں بتا سکتا۔ جب دل ہی اپنے قابو میں نہیں تو پھر عقل کا کیا ٹھکانا۔ واقعہ یہ ہے کہ... اصل بات یہ ہے کہ...... میری عقل ماری گئی تھی۔ میرے حواس گم ہو چکے تھے۔

خانساماں آپ کیا کہہ رہے ہیں میں تو ایک لفظ بھی نہیں سمجھا۔ اجازت ہو تو فدوی عرض کرے۔

سیٹھ ہاں ضرور کہو۔ مجھے کیا سب کچھ کہہ دو۔ میری تو عقل چکرا رہی ہے۔ نواب سرفراز کے صاحبزادے

خانساماں شمیم میاں عرف چھوٹے نواب تخلص پردیسی لقب منیجر ایک دن ہمارے چھوٹے نواب یعنی شمیم میاں موٹر میں آپ کے کارخانہ پر سے گزرے۔ ایسے میں آپ کی ٹائپسٹ ہیں نا (یاسمن کو بتا کر) بس ان سے آمنا سامنا ہو گیا۔ اس کے بعد سے پھر یہ کھو گئے

شمیم "کھو گئے ہم خود بھی دل کو بھی گنوا بیٹھے۔" سارا قصور آپ کی ٹائپسٹ مس یاسمن کا ہے۔ یہ راستہ پر نظر آتیں اور نہ میں کوئی فرضی نام رکھ کر آپ کے پاس نوکر ہوتا۔

سیٹھ میری ٹائپسٹ! آپ کس خیال میں ہیں۔ یاسمن میری بیٹی ہے۔

شمیم اور خانساماں۔ آپ کی صاحبزادی!

سیٹھ جی ہاں میری صاحبزادی آیا دماغ شریف میں۔

خانساماں خدا کا بڑا شکر ہے۔ اب بڑے نواب صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔

سیٹھ کیا بک رہے ہو کس پر غصہ اور کیسا غصہ؟

خانساماں حضور! جب بڑے نواب کو پتہ ہوا کہ ان کے صاحبزادے ایک معمولی گھرانے کی لڑکی سے بیاہ کرنا چاہتے ہیں اور اسی دھن میں گھر سے بغیر اطلاع کے غائب ہو گئے تو ان کے غصہ کی حد نہ تھی۔ اب جو انہیں معلوم ہوگا کہ وہ آپ کی صاحبزادی ہیں تو یقیناً مارے خوشی کے پھولے نہ سمائیں گے۔

سیٹھ (شمیم سے) صاحبزادے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میری اطلاع کے بغیر کوئی نیا نقشہ جمایا تھا۔

شمیم بے شک قصور ہو گیا معاف کیجئے۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ آپ کی صاحبزادی ہیں۔ ورنہ سب سے پہلے آپ سے اجازت لیتا۔

(یاسمن شرما کر میز کے کاغذات دیکھنے کا بہانہ کرتی ہے جیسا کہ اس نے کچھ سنا ہی نہیں)

نثار سیٹھ صاحب۔ مسٹر شمیم نے آج تک جس محنت اور قابلیت سے آپ کے کاروبار کی [illegible]

کو سنبھالا ہے اس کے صلہ میں یقیناً آپ انہیں نہ
صرف معاف کردیں گے بلکہ ان کی دلی تمنا کو پورا
کرکے ہم سب کو اس خوشی میں شریک ہونے کا موقع
عطا کریں گے۔

خانساماں اور بڑے نواب کی طرف سے میں وکیل بنتوں۔

سیٹھ۔ اس کی چنداں ضرورت نہیں سمجھیے ایسا معلوم ہوتا
کہ شمیم اور یاسمن نے پہلے ہی سے اس مقدمہ
کا فیصلہ کر دیا ہے۔ جب یہ دونوں راضی ہیں
تو میں کون انہیں اپنے ارادوں سے
روکنے والا۔

یوسف ناظم

۱۹۵۶ء کی پیشنگوئیاں

پیشین گوئیاں کرنے کا رواج انسانی زندگی کے آغاز سے چلا آ رہا ہے۔ یہ رواج اس زمانے میں بھی تھا جبکہ انسان میں سمجھ بوجھ نہیں تھی اور آج بھی جبکہ انسان سمجھ بوجھ کا پتلا بن چکا ہے۔ پیشین گوئیوں کا طریقہ جاری ہے۔ ہم ذاتی طور پر اس فن کو بُرا یا معیوب نہیں سمجھتے۔ آئندہ کے بارے میں قیاس آرائی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور بالخصوص دنیا کے عمومی حالات پر روشنی ڈالنے میں تو قطعاً کوئی بات قابل اعتراض نہیں۔ یوں بھی اب دنیا میں ہونے کے لیے کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے جس سے انسان خوف زدہ ہو جائے۔ سیلاب، ریل کے حادثے، وبائیں، قحط، لوٹ مار، قتل و غارت گری اب روزمرہ کے معمولی واقعات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ایسے واقعات سے متعلق پیشین گوئیاں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ ہاں اگر خدانخواستہ پیشین گوئی کر دی جائے کہ فلاں سال بیروزگاری ختم ہو جائے گی یا فلاں ملک میں بالکلیہ امن قائم ہو جائے گا تو البتہ تشویش کی بات ہے۔

فرصت کے اوقات میں ہم نے بھی علم نجوم کا مطالعہ کیا ہے۔ اور اپنے مطالعہ اور علم کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صحیح اور صد فیصد درست پیشین گوئی کرنا گو مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ ہم نے خود بھی اس فن کو فن کی خاطر حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ہمارا ذاتی خیال ہے کہ ہمیں اگر اس فن میں عبور نہیں تو کم از کم عبور کے آس پاس کا درجہ حاصل ہوگا ہے۔ ۱۹۵۴ء کے آخیر میں ہم نے ۱۹۵۵ء کے بارے میں ایک نوٹ بک میں پیشین گوئیاں لکھی تھیں اور ختم سال پر ہم نے ان کا تفصیلی جائزہ لیا تو ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہماری ۸۳ فی صد پیشین گوئیاں بالکل صحیح تھیں۔ ۱۷ فیصد پیشین گوئیاں جو غلط ثابت ہوئیں اس کی ذمہ داری بالکلیہ ان لوگوں پر ہے جو وفات نہیں پا سکے کیونکہ زیادہ تر یہ پیشین گوئیاں ان لوگوں کی وفات کے متعلق تھیں۔ چونکہ ۱۹۵۵ء کی حد تک ہمارا تجرباتی عمل بہت زیادہ کامیاب رہا ہے اس لیے ۱۹۵۶ء کے عالمی واقعات کے بارے میں ہم نے جو خاکہ تیار کیا ہے اسے صرف نوٹ بک کی زینت بنائے رکھنا شرافت سے بعید ہوگا۔ اس خیال کے پیش نظر ۱۹۵۶ء کی پیشین گوئیاں عوام و خواص کی دلچسپی اور فائدہ کے لیے پریس کے حوالہ کی جا رہی ہیں۔

جنوری ۱۹۵۶ء

یہ مہینہ ۳۱ دن کا ہوگا۔ اور آثار یہ بتا رہے ہیں کہ پہلی جنوری اتوار کو واقع ہوگی۔ اس دن عام طور پر دکانیں بند رہیں گی۔ البتہ شراب خانے کھلے رہیں گے۔ جنوری کے مہینے میں سردی خوب ہوگی۔ برف کے کارخانے بند ہو جائیں گے۔ سگریٹ، بیڑی اور گرم ادویات (جن میں گرم مسالے بھی شامل ہیں) کی تجارت کو فروغ ہوگا۔ قبل اس کے کہ دلی کی صنعتی نمائش ختم ہو، حیدرآباد میں اس کا آغاز ہو جائے گا۔ ڈاکٹروں کی امداد کے بغیر امراض کم ہو جائیں گے، لوگوں کی صحت اچھی رہے گی اور ان کا دل کام کرنے کو بھی چاہے گا۔ لیکن کام کاج کے مواقع نہیں ہوں گے۔ شادیاں البتہ زیادہ تعداد میں ہوں گی۔ ماہتاب، چاند کی چودھویں تاریخ کو مکمل ہو جائے گا۔ اور عوام کو ریڈیو کا لائسنس حاصل کرنا ہوگا۔

فروری

اس سال فروری کا ہفتہ، دوسرے کئی سالوں کے فروری سے مختلف ہوگا۔ اور اس کا اثر بالخصوص تاریخوں پر پڑے گا۔ فروری میں نظام شمسی بھی متاثر ہوگا۔ سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے اوقات میں

حسب

تبدیلی واقع ہوگی۔ اس مہینہ میں اندیشہ ہے کہ ریل گاڑیاں بھی وقت پر چلیں گی۔ فروری کے ختم ہونے ہی مارچ کا مہینہ شروع ہو جائے گا

مارچ

مارچ میں گرمیاں شروع ہو جائیں گی۔ پھلوں اور خربوزوں کی فصل اچھی ہوگی۔ لین دین میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوگا۔ اس مہینہ میں حکومتیں، اپنے اپنے مواز نے تیار کریں گی جس کے بارے میں لیڈر اظہار خیال کریں گے اور مدیران جرائد، اداریے لکھیں گے۔ مارچ میں ہولی کا تہوار بھی آئے گا اور اسٹیشن سے آنے والے مسافرین، اور دوا خانوں کو جانے والے مریضوں سے سڑکوں پر مساوی سلوک کیا جائے گا۔

اپریل

اپریل سے مالیاتی سال شروع ہوگا۔ جھوٹ کو ترقی ہوگی۔ مچھروں کی نسل میں اضافہ، اور مچھر مارحملہ میں کمی ہوگی بار برداری کے جانوروں کی صحت اچھی رہے گی۔ دال موٹھ، پکوڑی، بھجیے کثرت فروخت ہوں گے۔ اسکولوں اور کالجوں کے عام طور پر سالانہ امتحانات منعقد ہوں گے۔ امتحانات کا انعقاد صرف تکمیل ضابطہ کی خاطر ہوگا۔ تعلیم کا معیار طلباء کے کردار اور واقعات کی رفتار برقرار رہے گی۔ امتحانات ختم ہوتے ہی لڑکوں کو چھٹیاں دے دی جائیں گی نکیں لڑکے گھروں پر بیٹھیں رہیں گے بلکہ شب و روز محلہ کے گھروں کے چکر کاٹیں گے۔ عوامی لیڈروں اور بلدی مجالس کے ارکان کی مصروفیات بڑھ جائیں گی۔ اس ماہ میں عوام فلم دیکھنے کی طرف راغب ہوں گے۔ شہروں میں فٹ پاتھ پر سونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ اپریل کی چاندنی راتیں پر لطف ہوں گی

مئی

مئی کے مہینہ میں دن کے ۱۲ بجے آفتاب نصف النہار پر پہنچ جائے گا۔ خط استوا پر گرمی زیادہ ہوگی۔ مخلوق خداوندی (جس میں بے جان درخت بھی شامل ہیں) برہنگی پر مائل ہوگی۔ عورتوں کے لباس کا فیشن بدل جائے گا۔ سڑکوں پر دھول اڑے گی چیلیں انڈے دیں گی۔ عوام کو دن میں تارے نظر آئیں گے۔ لیمن سوڈے اور برف کی تجارت میں فائدہ ہوگا۔ دھوپ کی عینکوں کی قیمت بڑھ جائے گی۔ یہ مہینہ ان لوگوں کے لئے نحس ہوگا جن کے نام ع، ح، ط، ظ، ف، ق، س ش، اور بڑی ی (ے) سے شروع ہوتے ہیں۔ ڈ اور ٹ کے حروف سے شروع ہونے والے نام کے لوگ روپیہ پائیں گے۔

جون

مداری عروج پائیں گے۔ شاعروں اور ادیبوں کے افلاس میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ مشاعرے زیادہ ہوں گے۔ چندوں کی رفتار بھی بڑھ جائے گی۔ عشق و محبت کو فروغ ہوگا۔ اکثر و بیشتر مقامات پر کشتی کے مقابلے ہوں گے۔

جولائی

ملا کے ربر سول جوتے، برساتیاں اور چھتریاں زیادہ تعداد میں فروخت ہوں گی۔ سڑکیں، نہروں کا کام دیں گی۔ گلی کوچوں میں مفت لال، سوئمنگ پول قائم ہو جائیں گے۔ دھوبیوں کے دن پھر جائیں گے۔ تانگہ اور رکشہ چلانے والوں کو منافع ہوگا۔ بس کنڈکٹروں کی آمدنی متاثر ہوگی۔ عورتیں جھولا جھولیں گی اور مرد تھن کھائیں گے۔

اگست

اگست میں چھالیہ اور الائچی کی قیمت میں اضافہ ہوگا۔ سیاہ مرچ کا نرخ گر جائے گا۔ جہاز کے سفر کرنے والے بخیر و عافیت اس منزل پر پہنچ جائیں گے جو ہر انسان کا مقدر ہے۔ مال گاڑیوں کی رفتار حسب معمول رہے گی۔

ستمبر

ستمبر [illegible] کا نواں مہینہ ہوگا اور اس مہینہ میں کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔

اکتوبر منقے، بادام اور اخروٹ کی تجارت میں اضافہ ہوگا۔ بغیر قندیل کی سیکلوں کا چالان ہوگا۔ پاور ہاؤس سے برقی روشنی وقتاً فوقتاً سپلائی ہوتی رہے گی۔ پانی کے نل جاری رہیں گے۔

نومبر کرکٹ سے عوام کی دلچسپیاں بڑھ جائیں گی۔ دواخانوں میں نسخے لکھنے کا مشغلہ جاری رہے گا۔ کمیشن کی تجارت حسب معمول برقرار رہے گی۔ لال املی کے کمبل اور لدھیانہ کے اونی کپڑوں کی قیمت میں اضافہ ہوگا۔ کانفرنسوں، جلسوں اور جلوسوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔ ہر لیڈر دوسرے لیڈر کے ساتھ تلخ کلامی سے پیش آئے گا۔ سیاسی جماعتوں کے اختلافات بڑھ جائیں گے۔ پرانے لیڈروں کو نئے لیڈروں کے لیے راستہ چھوڑنا پڑے گا۔ عوام کی سادہ لوحی برقرار رہے گی۔

دسمبر یہ سال کا آخری مہینہ ہوگا اور مہینہ کے اختتام پر ۱۹۵۶ء ختم ہوجائے گا۔ اس مہینہ کی آخری تاریخوں میں کرسمس کا واقع ہونا ضروری ہے۔ شراب کی تجارت بڑھ جائے گی۔ ریلوں اور بسوں میں مسافروں کا ہجوم رہے گا۔ ریل کے ڈبوں کی تعداد میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ سال میں ایک آدھ مرتبہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے میں چونکہ کوئی حرج نہیں اس لیے بعض سرکاری محکمے اس مہینہ میں ہفتہ خوش اخلاقی منائیں گے۔ ممکن ہے کہ عوام بھی ہفتہ نہیں تو یوم خوش اخلاقی منانے کے بارے میں سوچ بچار کریں۔

سلیمان خطیب

کتاب پڑھنے کی تکنیک

جو کتاب خرید کر پڑھی جاتی ہے وہ اچھی نہیں ہوتی ۔ برائی ہوتی ہے اس لئے اگر آپ ہمارا تجربہ اور مشورہ چاہتے ہیں تو ہم آپ سے یہی عرض کریں گے کہ آپ مفت کی کتابیں پڑھئے ۔ مانگے تانگے کی کتابیں پڑھئے ۔ جب یار مار ۔ ڈالئے ۔ مفت کی کتابیں پڑھنے میں لطف زیادہ آتا ہے اور سہولت بھی کافی ہوتی ہے آپ ان کو اپنے ڈھنگ اور سلیقہ کے مطابق استعمال کر سکتے ہیں احتیاط کی ضرورت ہے نہ دردسری کی ۔ آپ ان کتابوں پر پان سپاری رکھ کر کسی مہمان کی خاطر و مدارات کر سکتے ہیں سگریٹ کی راکھ جھاڑ سکتے ہیں ۔ ٹرین کے انتظار میں پلیٹ فارم پر بچھا کر بیٹھ سکتے ہیں بلی دسترخوان پر آجائے تو رول بنا کر مار سکتے ہیں ۔ سفر میں سرہانے رکھ کر سو سکتے ہیں یا کم از کم حالت یہ تراش کر کسی چراغ یا قندیل سے سگریٹ ہی جلا سکتے ہیں ۔ اس سے زیادہ آپ کو اور کیا چاہئے ۔ یعنی مفت کی کتاب کی کوئی چیز بیکار نہیں جاتی ۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام ۔ گرد پوش پھٹ جائے تو چولہا سلگانے کے کام آتا ہے ۔ صفحے علیحدہ ہو جائیں تو آپ کے پیارے بچے اس پر مدرسہ کا نظام الاوقات چسپاں کر سکتے ہیں ۔ ردی ہو گئی تو دیکھئے "بیگم" سوئی ۔ اس کو کوٹ پیس کر میتھی ملا کر ٹوکریاں جماع لیپ لگی یا پھر کسی بنئے کی دوکان پر صبح کر بیچے جائے گی رہا کتاب کی واپسی کا سوال ابھی حضرت یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے جب کتاب والوں کو نہیں مل سکا تو پھر کتاب والے کو کیسے مل سکتی ہے ؟ رہا تقاضہ تو اس کو ٹالنے کے لئے اسی عام تکنیک کی ضرورت ہے ۔ کہہ دیجئے گھر پر رہ گئی ہے ۔ معاف کرنا بھجوا دوں گا ۔ گھر پر آدمی بھیجا جائے تو جواب دیجئے کہ ایک دوست پڑھ رہے ہیں دوست کا پتہ دریافت کریں تو کہہ دیجئے کہ ممبئی گئے ہیں کبھی سے واپسی تو کبھی جائے تو سادگی سے فرما دیجئے "مجھے نہیں معلوم" ۔۔۔ لیجئے چھٹی ہو گئی ۔

اگر آدمی ذرا "چیکٹ" قسم کا نکلے تو آپ کو بھی ذرا اسی تکنیک بدلنی پڑے گی بہت سنجیدہ ہو جانا پڑے گا ۔ گردن کو ۹۰ کے زاویہ پر لٹکا دیجئے ۔ ہونٹ ڈھیلے چھوڑ کر فرمائیے "معاف کرنا بھئی ۔ خوامخواہ آپ کو تکلیف ہوئی ۔ دیکھئے دنیا کا رنگ ہی بدل گیا ہے ۔ لوگوں کو شرم کیوں نہیں آتی ۔ ادھر سر پٹکے کہ صاحب کتاب میری نہیں ہے ۔ میرے دوست کی ہے ۔ صرف وقت گزر کے لئے مستعار لی ہے ۔ مگر وہ مانتے ہی نہیں ایک ہفتے کے وعدے سے اتر کر ایک دن پر آجاتے ہیں ۔ ابھی ہم کوئی جواب بھی نہیں دے پائے کہ وہ "ہوا ہو" سائیکل پر بیٹھ کر یہ جا وہ جا ۔۔ ارے بھئی معاف کرنا ۔ باتوں میں بھول گیا ۔ سگریٹ بھی پیش نہ کر سکا ۔ یہ دیکھئے سگریٹ کیس کھول کر دیجئے یا تھری کیسل پیش کیجئے ۔ یا یہ نہ ہو تو پھر آپ اپنا چار مینار ہی پیش کر دیجئے کیونکہ مفت کتاب پڑھنے کی تکنیک "چار مینار" سے خاص تعلق رکھتی ہے ۔ چار مینار کے محاورہ سے ۔۔ چار مینار کی علامت سے ۔۔ "چار مینار کی ریت سے ۔۔"

جہاں تک ہو سکے ۔ اس قسم کی لعاصاکی نگاہوں سے اپنے دامن کو بچا کر چلئے ۔ راہ میں نظر آجائے تو کسی قریبی پان کی دکان پر کھڑے ہو جائے ۔ منہ پھیر لیجئے ۔۔۔ آسمان کی طرف دیکھنے لگ جائیے ۔ یا گردن جھکا کر استغراق فرمائیے ۔ اس پر بھی اگر وہ "چنگا ڈھر" بن کر دامن پکڑ لے تو مصنوعی مسرت کا مظاہرہ کیجئے ۔۔۔ ہونٹوں کو گول دائرہ بنا کر فرمائیے ۔۔۔ "اوہو ۔۔۔ کدھر ۔۔۔ ؟ !"

اب تو آپ سے برسوں میں بھی ملاقات نہیں ہوتی — آخر کہاں رہتے ہو۔ بچے وغیرہ تو اچھے ہیں کہو وہ میری "منی گڑیا" — کیسی ہے۔ بھئی بڑی پیاری بچی ہے — یقین مانئے اس انداز اور تکنیک سے "مقامی" کا ذہن دوسری طرف منتقل ہو جائے گا۔ آپ اس کو کسی خوب صورت کیفے میں لے جائیے۔ اس پر بھی آدمی سنگ خارا قسم کا نکلے اور اپنی کتاب کا رونا روئے — تو ڈانٹ پلا دیجئے — ارے یار تم بھی عجیب آدمی ہو۔ تمہارے پاس تو آدمی کی کوئی قدر نہیں۔ میرے پاس اٹالس رک شلف میں ایسی سیکڑوں کتابیں پڑی ہیں — آؤ — لیجاؤ جتنی چاہئے — ایک معمولی کتاب کی خاطر رو رہے ہو۔ کہو کیا قیمت تھی تمہاری کتاب کی یہ لو روپے — اپنا خوب صورت منی پرس کھول کر — اپنی مفروضہ "دولت" کا مظاہرہ کیجئے جو آپ اپنے باس کی طرف سے بینک میں جمع کرانے جا رہے ہیں۔ ہو سکے تو دس روپیہ کا نوٹ جیب میں ٹھونس دیجئے۔ بخدا یہ لاجواب تکنیک ہے مقامی مرعوب ہو جائے گا۔ بغلیں جھانکنے لگے گا۔ معافی چاہے گا۔ بعض دفعہ تو پیروں پر گر جائے گا۔!

بہرحال۔ ع عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے۔ اور آج اسی ہنر کو ماڈرن سوسائٹی میں تکنیک کہا جاتا ہے لیکن آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ کتاب پڑھنے کی یہ تکنیک ہندوستان سے زیادہ ماڈرن ممالک میں استعمال نہیں کی جاتی۔ چنانچہ میرے ایک دوست جو ابھی امریکہ سے آئے ہیں کہہ رہے تھے وہ جس گھر میں "اجرتی مہمان" کی حیثیت سے رہتے تھے وہاں مانگنے کی تکنیک نظر نہیں آئی — جس کی وجہ سے انہیں بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ وہ جس گھر میں تھے پانچ اخبار آتے تھے۔ اس پر بھی انہیں اپنا اخبار خرید کر پڑھنا پڑتا تھا۔ یقیناً یہ ایک ہندوستانی پر ظلم ہے لیکن ع جور ہے جور کی فریاد نہیں ہے!!

تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ جو چیز حد کر پڑھی جاتی ہے وہ اچھی نہیں ہوتی۔ پرانی ہوتی ہے میری ہی مثال لیجئے میں نے سلمان اریب سے "صبا" بطور نمونہ مانگا تھا — نمونہ مانگنا تکنیک ہے انہوں نے آٹھ روپے جھاڑ لئے۔ روپے جھاڑنا ایسا بھی تکنیک ہے۔ ہاں تو پھر میں ناسیل کے سے رہا ہے ایک عدد روزنامہ سیاست نقوش کا منٹو نمبر۔ احتشام کی "ساحل اور سمندر" اور فلمی دلچسپی کے ثبوت کی خاطر فلم فیئر خرید کر ریلوے اسٹیشن میں اس وقت پہنچا جبکہ ٹرین ساحل کے قریب ایک موج کی طرح لہرا رہی تھی۔ فوراً ٹرین کے دریچے سے الم غلم پھینک ایک مشتاق غواص کی طرح غوطہ لگایا — اور عرش پہ سے اندر ہو گیا!! — تو بھی جانتے ہیں کہ گورنمنٹ مجھے سیکنڈ کلاس کا کرایہ دیتی ہے اور میں تھرڈ کلاس میں سفر کرتا ہوں فرق آپ پہ کیسی ہے۔ کہیئے یہ میری اپنی تکنیک ہے) لیکن تھرڈ کلاس کے سفر کی تکنیک بھی خوب ہوتی ہے۔ سامان سلیقہ سے ایک طرف رکھ کر سیٹ پر آتا ہوں تو — کتابیں غائب — ارے بھئی میری کتابیں کیا ہوئیں — برابر والے صاحب نے مسکرا کر کہا۔ وہ دیکھئے۔ وہ صاحب پڑھ رہے ہیں۔ اُن صاحب کی طرف دیکھتا ہوں تو وہ صاحب، تیسری سیٹ سے صرف ہاتھ کے اشارے سے تسلی دے کر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں

میں نے عرض کیا بھئی اور بھی تو کتابیں تھیں "ساحل اور سمندر" ایک ابابیل قسم کے مسافر صاحب جو اوپر دراز تھے جن کے مقدس پاؤں ہمارے چہرہ پر سہرہ کی لڑیوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ ایک طائرانہ نظر نیچے پھینک کر بولے "میں دیکھ رہا ہوں بھائی صاحب ابھی دیتا ہوں" — اور وہ "فلم فیئر" تو مجھ سے ملاحظہ فرما رہے تھے۔ کبھی کبھی تبصرہ بھی فرما دیتے — دیکھا سالے وحیدہ بالا کو — سکہ ہے ملک سالی — کیا ناچتی ہے آہا ہا۔ وہ کون سا فلم ہے یار — رتھوڑی دیر سوچ کر۔ انارکلی — نہیں نہیں۔ ہاں وہ گانا یار — یہ آتا

دنیا کی دلچسپ داستانیں توڑ کے ادبی ستاں توڑکے۔ "آبے ناگن ہے ناگن" دوسرے نے اپنی معلومات کی دھونس جمائی "کیوں ہے نا صاحب" ——— پھر میں نے مجھ سے تو تیق چاہی ——— اور میرے جل بھن کر منہ پھیر لیا "افکار" لے بیٹھا منٹو کی موت پڑھنے لگا ——— منٹو صرف اس لئے مر گیا کہ اس کے ملک نے اس کی کتابیں خرید کر نہیں پڑھیں۔ منٹو ضرور تھا خود دار تھا۔ کتابیں واپس نہ مانگ سکا۔ لوگ جس دنیا سے آیا تھا اسی دنیا کو واپس چلا گیا ——— سنا ہے کہ اس کی کتابیں مفت پڑھنے والے اب اس کی کتابیں چھاپ چھاپ کر بیچتے ہیں اور اس کے پسماندگان کو قرار داد تعزیت بھیج رہے ہیں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ میرے "افکار" ایک طرف رکھ دیا اور لونڈوں سے "قلم تیز" لیا جانا ——— مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ ان کے ہاتھ میں رسالہ نہیں تھا ——— وہ ادرک کا مربہ کھا رہے تھے۔

ارے میاں وہ پرچہ کیا ہوا ——— ؟

"وہ آپ کے دوست لے گئے نا صاحب"

میرے دوست لے گئے ——— ؟

جی صاحب۔ بارود کے ڈبے والے دوست ——— !

عجیب نامعقول ہو تم لوگ ——— تم نے پرچہ لا ہی کیوں تھا۔

تو کیا گھٹ گیا صاحب ——— ؟

جواب کیا دیتا ——— کیچڑ پر پتھر مارنا تھا ——— خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہا۔

آخر "قلم تیز" گیا کہاں ——— وہ کون سے دوست آسمان سے ٹپک پڑے جن کو مجھ سے زیادہ میرا "قلم تیز" پسند ہے اور جنہوں نے اخلاقاً علیک سلیک تک نہیں کی اور پرچہ لیکر چلتے بنے ——— تمام ڈبے پہ ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر آہستہ سے اٹھ کر متصل کمپارٹمنٹ میں جھانکا ایک مدراسی قسم کے مسافر جن کی مالست بھر کی "حشو" پرتی پنکھے کے ساتھ سی پوری طرح ناچ رہی تھی۔ پیشانی پر تین لکیریں سفید دھوتی، سفید قمیص۔ ایک شوخ جوان رنگ کی ٹائی جو ان کے سینہ پر تڑپ رہی تھی۔ اندر کرون چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتی تھی۔ ادرک کا مربہ کھانے والے لونڈوں نے چیخ کر کہا کہ وہ ہے صاحب آپ کی کتاب، میں نے مسٹر ٹائی کو بغور دیکھا وہ پرچہ کو بغور دیکھ رہے تھے۔ مسٹر ٹائی آٹھ گھنٹے پہلے میرے سعال کی سیٹ پر منکر تھے مجھ سے انگریزی میں HOW FOR YOU ARE GOING پوچھا تھا ——— بس یہی ایک جملہ تھا۔ جس کو دوستی کہا جا سکتا ہے تو یہ دوستی تھی۔ IS IT YOUR'S کہ یہ آپ کا ہے وہ اکتا کر پوچھ بیٹھے۔

YES IT IS MINE میں نے آنکھیں پھاڑ کر جواب دیا۔

JUST A MINUTE جب ان کا صرف ایک منٹ دس منٹ تک ختم نہیں ہوا تو میں نے رسالہ کھینچ لیا ——— سارے ڈبہ میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ لوگ سہمے لگے چلانے لگے۔ جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ " واہ کیا اخلاق ہیں کہ رسالہ غریب کھا جاتا!! ایسے ہی کی جسارتیں پڑھ رہا تھا!! عمر کا تو خیال کیا ہوتا ——— نعوذ باللہ ——— تصویریں رکھنا حرام ہے "ایک عالم نے فتویٰ صادر فرمایا۔ میں نے رسالہ گھبرا کر واپس کر دیا کیوں کہ میں نے اخلاق کسی تیرہی کمی تھی ——— اب اپنے ڈبے میں واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب ہنتائی انہماک سے "افکار" کی اوراق گردانی فرما رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی ایک دم گھبرا اٹھے رسالہ رکھ دیا ——— میں نے مسکرا کر کہا ——— جی نہیں۔ کوئی بات نہیں ——— آپ دیکھ سکتے ہیں۔ پھر وہ جواباً مسکرا کر رسالے سے محظوظ ہونے لگے۔ اچانک سرور پر ایک ہنسی کا بم پھٹا ——— سب لوگوں کی نظریں اوپر اٹھ گئیں۔ جہاں ابابیل کے پاؤں لٹک رہے تھے۔ "ساحل اور سمندر" کو سوٹ کیس خواہش مطالعہ فرمانے والے مسافر صاحب کروٹ بدلتے ہوئے

گوہر افشاں تھے۔ ماشاءاللہ ظالم نے ــــ واللہ کیا لکھا ہے واہ واہ ــ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب میرے پاس کتاب ہوتی ہے تو میں نہیں پڑھتا صاحب وہی کتاب دوسرا پڑھ رہا ہوتا ہے تو ہمارے سمندِ شوق پر تازیانے پڑنے لگتے ہیں۔ دکھی رساں میں پڑھنے کی ہُک اٹھتی ہے۔ اگر کوئی ظالم اس ذوق و شوق اور زور و شور سے پڑھے تو سمجھ جائیے کہ ذوقِ مطالعہ کی وجہ سے کتاب میں ایسا ہی انہماک ہے اور ادبی شہپارے فراخ دلی سے کتاب کی سطریں ایسے سنسنا رہی ہیں کہ ٹھہر و یار مزہ آ رہا ہے۔ ظالم نے کمال کر دیا۔ واہ وا کیا لکھا ہے ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ دوسرا قہقہہ گرجا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ بے اختیار اٹھ کر بولا دیکھئے صاحب کتاب دیجئے نوازش ہوگی۔ یہ "افکار" دیکھئے۔ یہ بھی بالکل تازہ ہے ــ اس میں منٹو کی موت ہے آپ کا تذکرہ ہے۔ انہوں نے ناک صاف کرتے ہوئے بولے۔ ٹھہرو یار ـــ! کیا بیچ راستے میں گردن مارتے ہو۔ میں خود گردن لٹکا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے ذہن کو۔ استادوں کو سلسلے سے یاد کیا جنہوں نے مجھے اخلاقِ محسنی پڑھائی تھی۔ مجھ میں اس قدر ادبی و اخلاقی کمزوری پیدا ہو چکی تھی کہ خود اپنی کتاب ایک سفید پوش سے چھین نہیں سکتا تھا۔ مجھے ایسی ہی حرکت یعنی رسالہ "قلمِ نو" کے چھین لینے کا خود افسوس تھا ـــ

ایک اسٹیشن پر گاڑی رک گئی۔ ایک صاحب اپنے بچے کے ساتھ گاڑی سے اتر رہے تھے۔ بچے کے ہاتھ میں میرا اخبار "سیاست" تھا میں نے اخبار بچے کے ہاتھ سے لینا چاہا۔ بچے نے چیخ کر احتجاج کیا۔ "آبا یہ صاحب اخبار چھینتے ہیں۔"

ادھر صاف کرنا چاہا ــ کھول گیا۔ بیٹے اخبار دیدو۔ یہ انہیں کا ہے۔ سلام کرو چچا کو۔ شکریہ۔ معاف کرنا جی کوئی بات نہیں۔ یوں تو ہوتا ہی ہے بھول چوک (وہ چلے گئے) اور میں نے اخبار کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اخبار پر کافی سالن کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ شاید بطور دسترخوان استعمال ہوا تھا درمیانی حصہ غائب تھا ممکن ہے پوری کچوری کھا کر دریچے سے باہر پھینک دیا ہو۔ میں اسی کونے میں "افکار" دیکھنے لگا۔ نہ معلوم کب آنکھ لگ گئی ــ۔ داڑھی جنکشن کی ہنگامہ آرائیوں سے آنکھ کھل گئی میرے سامنے کی سیٹ پر ایک سفید کمبل رکھا ہوا تھا۔ سفید ساری سفید بلاؤز بوجھل پپوٹے۔ نیلے سمندر کی سی آنکھیں۔ سمندر کے ساتھ ہی مجھے اسی کتاب "ساحل اور سمندر" کا خیال آیا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ اماں اٹھ گئی تھی۔ سیٹ صاف تھی۔ صرف کیلے کے دو چھلکے پڑے تھے۔ ایک محسن نے فرمایا "کسے دیکھ رہے ہیں آپ وہ تو دائیں جنکشن پہلے سے ہی اتر گئے ـــ" اجی اتر گئے۔ کتاب تک واپس نہیں کی ـــ ساڑھے چار روپیہ کی کتاب۔ لوگ پرخلوص مشورے دینے لگے۔ آپ نے دی کیوں تھی۔ پھر دی بھی تو لی کیوں نہیں۔ غلطی آپ کی ہے۔ جی ہاں غلطی میری ہے۔ میں بیچ راستے میں گردن مارتا ہوں۔ میں کتاب پڑھنے کی تکنیک سے واقف نہیں۔ میں کمزور ہوں۔ میرے والدین نے مجھے اخلاقِ محسنی پڑھائی ہے۔

پڑھنے پڑھانے کی ایک اور تکنیک یہ بھی ہے کہ اگر کوئی عجلت پسند "پے صبرے صاحب" کسی اسٹیشن پر آکر پیپر اخبار جھٹ کر دیں اپنے گھر کے سامنے تہہ یا صدر، میاں جی، اخبار پڑھ رہے ہوں تو آپ ایک گدھ کی طرح ان کے اطراف منڈلائیے ــ پھر کسی علیک سلیک کے بازو کھڑے ہو جائیے۔ اور اخبار کے نچلے حصے یعنی پہلے صفحہ کو جھک جھک کر دیکھتے جائیے۔ صاحبِ اخبار آپ کو اس حرکت سے منع نہیں فرمائیں گے۔ بلکہ صرف مسکرا دیں گے۔ آپ ان کی اس مسکراہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود بھی مسکرائیے قریب ہو جائیے۔ لیجئے ملاقات ہو گئی ـــ پیارا ہو گیا۔ اب آپ اخبار کا ایک گوشہ تھوڑا سا اٹھا کر پڑھنے لگ جائیے۔ ممکن ہے ایسا کرنے میں آپ کا مہربان صاحب کی کہنیاں دبوچ جائے۔ وہ یقیناً آپ کی سہولت کی خاطر اپنی کہنیاں بغلوں تک اٹھا دیں گے۔ اس سے آپ کو اخبار کے اندرونی صفحات کی سرخیاں دیکھنے کا شوق چرائے گا۔ آپ ان کی بغل میں سے گردن ڈال دیجئے۔ وہ دیکھیں گے کہ ایک بار ان کے سینے پر آنکھ کا ہے تو وہ بے تکلف ہو کر ... آپ کے ...

حتیٰ کہ صاحب اخبار اکتا کر جمائیاں لینے لگیں گے۔ پھر چہل قدمی فرمائیں گے۔ لیکن آپ کو تو ابھی اشتہارات پڑھنے ہیں۔ اور پھر یہ بھی تو معلوم کرنا ہے کہ اخبار کس مطبع میں شائع ہوتا ہے۔ پبلشر و پرنٹر کون ہے سینما کے پروگرام کیا ہیں۔ عدالتوں کے اعلان دیکھنے ہیں۔ ممکن ہے کہیں آپ کے نام بھی کوئی نوٹس یا وارنٹ ہو — مجبوراً صاحب اخبار آپ کو لے دیوان خانے میں لے جا کر اطمینان سے اخبار پڑھنے کی دعوت دیں گے۔ آپ فوراً ساتھ ہو جائیے اور ساتھ ہی ایک گلاس پانی کی فرمائش کر دیجئے۔ حیدرآبادی لوگ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں ممکن ہے پانی کے ساتھ چائے اور پان بھی لگ کر آ جائے۔ اگر اس اخبار کے کسی کونے میں آپ کے کسی دوست کی غزل چھپی ہے تو آپ اس حصے کو گھر والوں کی نظر سے بچا کر جیب میں اتار لیجئے اور نگاہوں سے گم ہو جائیے۔

کتاب پڑھنے کی چلتی پھرتی تکنیک یہ بھی ہے کہ آپ کسی بک اسٹال پر کھڑے ہو جائیں۔ پہلے "السٹریٹڈ ویکلی" کو تفصیل طور پر دیکھ ڈالئے شادی کے جوڑوں کو غور سے ملاحظہ فرمائیے۔ اچھے بُرے کا حکم لگائیے جواب صورت پر خوبصورت بلا کر مسکرائیے مسکرانا حرام نہیں۔ "لائف" دیکھئے۔ آتشیں جسموں کی دھیمی دھیمی آنچ سے پھریری لیجئے۔ گرما گرم اٹھا کر ہیں دبی سانس سے TOP MOST SECRETS پڑھئے "فلم فیئر" دیکھئے۔ علمی ذوق کو تسکین دیجئے۔ اس مرحلہ میں بک اسٹال کا مالک آپ کو گھورنے لگے گا۔ لیکن آپ اس کی جھریوں دار مفلس آنکھوں سے گھبرائیے نہیں۔ ڈٹے رہیئے۔ وہ آپ کی خوش لباسی سے مرعوب ہے۔ آپ کھڑے کھڑے تھک چکے ہیں۔ اس لئے ایک پاؤں اٹھا کر کھڑے ہو جائیے۔

"شمع" دہلی دیکھئے پھر دوسرا پاؤں اٹھا کر "شنکرز ویکلی" ملاحظہ فرمائیے۔ اس اثناء میں بک اسٹال والا اپنی جگہ سے اٹھ کر آپ کے پاس آ جائے گا۔ اس کی صورت اس وقت "شنکرز ویکلی" کے کسی ایک مضحکہ خیز کارٹون سے کم نہ ہوگی۔ غصے کا پتا ہوا۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئی۔ بال بکھرے ہوئے۔ گال دھنسے ہوئے۔ ہونٹ بھنچے ہوئے۔ سانس تیز تیز چلتی ہوئی آپ گھبرائیے نہیں۔ وہ صرف کاپی ہاؤس آوازیں پوچھے گا۔ "کیا مانگتا آپ" DREAM LAND مانگئے۔ وہ لاجواب ہو جائے گا۔ پھر جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ایک آنے کا DAILY NEWS مانگئے وہ معافی صاحب کہہ کر دکان بند کرنے لگے گا۔ آپ چلتے چلتے کم از کم ٹائمس آف انڈیا کی سرخیاں پڑھتے جائیے۔ دکان بند ہونے کا غم نہ فرمائیے۔ آپ تو ایسی کئی دکانیں بند کرا چکے ہیں۔

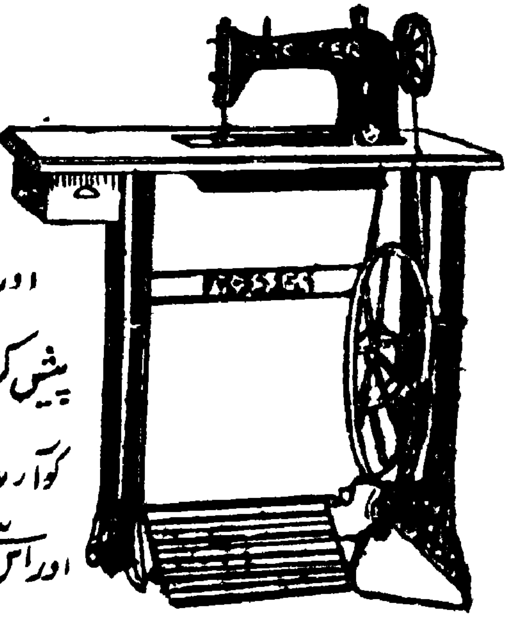
آپ کبھی کوئی خوب صورت کتاب لیکر گھر سے باہر نہ نکلئے۔ لیکن آپ اپنی طبیعت سے مجبور ہیں۔ لہٰذا ایک قدیم کرم فرما جو سیکل پر طوفان کی طرح گذر رہے ہوں گے۔ آپ کے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر فوراً سیکل سے اتر پڑیں گے۔ کیا کوئی نئی کتاب ہے مطلب صاف — جی ہاں — ذرا دیکھ تو لوں — اور پھر وہ آپ کو سڑک پر آدھے گھنٹے تک دھوپ میں بیٹھا رکھے — اگر یہ صاحب نہیں ملے تو دوسرے دوست دوکان سے اٹھ کر آئیں گے زبانگے طواف نذار رسالہ معلوم ہو رہا ہے ذرا لکھنے والے تو دیکھ لوں کون ہیں — بس ایک نظر کافی ہوگی۔ ان کی تکلیف کا سلسلہ پندرہ دس منٹ سے کم نہیں ہوگا۔ خواہ آپ دواخانہ جاتے ہوں۔ مارچوئری یا آفس وہ آپ کو نہیں چھوڑیں گے اتنے میں دوسرے بے تکلف قسم کے دوست کہیں سے نکل پڑیں گے۔ پیچھے سے ایک زور کا گھونسہ کمر میں رسید کریں گے پھر فرمائیں گے سڑک پر کیا کر رہے ہو۔ — دوست بھی وہی عمل دہرائیں گے کتاب کا نمبر تو سنا لو۔ اگر آپ تکلف کریں تو کہہ دیں گے۔ ہاں میں جانتا ہوں تم بڑے کام والے ہو — شام کو لے جانا۔ کتاب محفوظ رہے گی۔ اگر آپ نے ان سے کسی طرح اپنی کتاب بچائی تو فوراً آپ کے سامنے ایک خوبصورت


رعنا پروڈکٹس کی اشیاء خاص الخاص بہترین اجزاء سے
بنائی جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ رعنا پروڈکٹس کی تمام
مصنوعات بیحد مقبول و مشہور ہیں۔
گل رعنا
Rana
TOILET
رعنا پروڈکٹس دہلی
رعنا ٹائیلٹ سوپ
رعنا ٹائیلٹ سوپ کے اور صاف و شفاف جھاگ
کی چادر پر ملئے پھر جلد کو دھو دیجئے۔ پھر دیکھئے آپ کی جلد کتنی
صاف کتنی نرم اور کتنی ملائم ہو گئی ہے۔ جس سے آپ کا حسن نکھر
جائے گا

صب

کوثر سیونگ مشین کمپنی

کوثر دنیا کی بہترین سلائی مشین



کوثر سلائی مشین اپنی
پر اپنا اطمینان جما کر لوگوں
بنا رہی ہے اپنی خوبصورتی
ثبوت میں اپنی ایجنسیاں۔
لوگوں نے ابھی کوثر مشین
آزمانے کی کوشش کریں

مضبوطی سے تمام دنیا
کو اپنا گرویدہ
اور پائیداری کے
پیش کر رہی ہے جن
کو آزمایا نہیں وہ جلد
اور اس سے فائدہ حاصل کریں

یقین کامل ہے کہ کوثر ہی ایسی مشین ہے جو دوسری تمام مشینوں کو بھلا دیتی ہے۔

صرف تجربہ شرط ہے

الہ آباد۔ سری نگر (کشمیر)، غازی آباد۔ کوٹہ (راجستھان) اودے پور۔ بھوپال۔
سوائی مادھو پور۔ بیجاپور۔ سورت

کوثر سیونگ مشین مینوفیکچرنگ کمپنی (رجسٹرڈ) لال کنواں دہلی

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کا ایک خط

(ڈاکٹر لوہیا نے یہ خط سبط محمد نقوی کے نام لکھا ہے)

۱۹ مارچ ۱۹۵۶ء

پیارے سبطے!

تم نے قومی آواز کے مضمون کو ہندی میں لکھ کر بھیجا اس کے لیے شکریہ۔ بلاشک اردو کو اتر پردیش علاقے کی یا چھیتریہ بھاشا کا مرتبہ ملنا چاہیے۔ جس کے صاف معنی ہوں گے کہ:

(۱) جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے ان کی ابتدائی تعلیم (پراتھمک شکشا) اردو میں دی جاوے اور مادری زبان جو بچوں کا سرپرست بتائے وہی مانی جائے۔

(۲) جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے سکنڈری اسٹیج اور کالج میں ان کے لیے اردو بھی پڑھنے کی سہولت دی جائے۔

(۳) راجیہ کے سرکاری محکموں اور کچہریوں میں اردو لپی کے استعمال کی بھی اجازت دی جائے۔

اس کے علاوہ میں تمہیں ایک اپنی آکانشا بھی بتانا چاہوں گا۔ کوئی زمانہ جلد ہی ایسا آنا چاہیے جب ہندی اور اردو میں کوئی فرق نہ رہے۔ جیسا کہ میری اور تمہاری زبان میں آج بھی ہے اور دونوں کے لکھنے کی لپی بھی ایک ہو جائے۔ لیکن یہ تو آگے کی اور امید کی باتیں ہیں۔ اور تبھی ہو سکتی ہیں جب ہندی اور اردو والے مل کر اور ابتدا ہی سے اس کام کو کریں۔ تب تک کے لیے تو جو میں نے اردو کے بارے میں لکھا ہے وہ سوشلسٹ پارٹی کی رائے سمجھنا چاہیے۔

میں اس خط کی نقل قومی آواز کو بھی بھیج رہا ہوں اگر وہ چاہیں تو شائع کر سکتے ہیں۔

تمہارا

رام منوہر لوہیا

لطیف ساجد کے خطوط سلیمان اریب کے نام!

۱۹ر جنوری ۱۹۵۶ء کو ساجد نے جو خط مجھے لکھا تھا اس میں "صدا" کا تذکرہ بھی ہے مجھے کیا خبر تھی کہ یہ خط ساجد کا آخری خط ہوگا اور جس رسالے کی اجرائی کے خیال کو ساجد نے پسند کیا تھا اسی رسالے میں یہ خط اس کے مرنے کے بعد شائع ہوگا

یہ خطوط ۱۰ر جنوری ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹ر جنوری ۱۹۵۶ء تک کی ایک تاریخی دستاویز ہیں جن میں بہت سی باتیں حیدرآباد کی ادبی زندگی کے متعلق سے آگئی ہیں۔ ان خطوط کے ذریعہ اگر ایک طرف ساجد کی زندگی کے بعض چھپے ہوئے گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں تو دوسری طرف ان میں متوسط طبقے کے ایک نوجوان شاعر کی جیتی جاگتی تصویر بھی ملتی ہے۔ ساجد کا حلقۂ احباب کافی وسیع تھا اور وہ اپنے بہت سے دوستوں کو بڑے شوق اور اہتمام سے خطوط لکھا کرتا تھا لیکن غالباً اس نے مجھ کو سب سے زیادہ خطوط لکھے اور آج بڑے دکھ کے ساتھ مجھے ان کو محفوظ رکھنے کی صحیح قیمت کا اندازہ ہو رہا ہے

ستر اسی خطوط میں سے صرف ایسے ہی خطوط کا انتخاب کیا گیا ہے جو کسی حد تک ادبی کہلائے جا سکتے ہیں ان میں بھی کہیں کہیں ایسے جملے حذف کر دیئے گئے ہیں جو یا تو پرسنل تھے یا جن میں کوئی خاص بات نظر آئی

اریب

منچریال ۱۶ر جنوری ۱۹۵۲ء

ڈیئر اریب! تمہارا یہ مکتوب ملا۔ ظاہر ہے کہ مجھے اس سے صد فیصد اتفاق ہے ہمارے مخالف گروپ نے جو بیان شائع کیا تھا اس کو دیکھا ہے اور تعجب ہے کہ اس میں میرا نام بھی شریک ہے حالانکہ قبل اشاعت میں نے پڑھا تھا اور نہ اس سلسلے میں اس پر دستخط کرنے والوں نے مجھے واقف کر دیا تھا۔ میں نے اختر صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ میری جانب سے تردید کر دیں آج ہی ان کے خط سے معلوم ہوا ہے کہ وہ ایک مشترکہ تردید شائع کرنے والے ہیں

انتخابات کے سلسلے میں فرقہ پرستوں کے مذموم پروپگنڈے کا حال بھی معلوم ہوا لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ بازی بھی ہمارے ہاتھ رہے گی [illegible] کے ناموں سے میں متفق ہوں۔ مگر چاہتا ہوں کہ اس حال میں مجھے شریک نہ کیا جائے کیونکہ میں مستقلاً حیدرآباد میں نہیں رہ سکتا اس لیے عملی دلچسپی نہیں لے سکوں گا میری بجائے حسینی شاہد کی شرکت زیادہ سود مند اور مناسب ہوگی

[illegible] ساز کے ناشنیدہ نغمے [illegible] کا ترجمہ [illegible] راغب کر سکے۔ امید تو ہے کہ کم از کم اس پرچے کی حد تک

[illegible]

تم مستقل مزاجی کا ثبوت دو گے۔ مجھے اس کی تفصیلات کا انتظار رہے گا کہ اس عالم آشوب زمانے میں تم اپنی ادارت کے دیرینہ خیال کو کس طرح عملی جامہ پہنا سکے ——— تحسین[1] کیا کر رہا ہے؟ کہیں وہی عالم تو نہیں ہے جس کو اقبال نے اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس

ملے تو سلام کہہ دینا

کوئی تازہ نظم نہیں ہوئی۔ آنے والی کل کے اس بازار میں جس شعر کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ دماغ معطل ہے جذبات مسدود ہیں اور بات تو کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ یہی لیل و نہار رہے تو ہو چکی شاعری۔

جمہور کا انتظار رہے گا۔ پیام دیکھتا ہوں اگر کوئی پرانی غیر مطبوعہ نظم نکل جائے تو روانہ کر دوں گا۔ والسلام فقط

تمھارا لطیف احمد

بھوپال ——— ۲۰ مارچ [illegible]

بھائی اریب! بڑے انتظار کے بعد "جمہور" کا کا مجی نمبر ملا ہے۔ اس کی بلند معیاری کے لیے جتنی کوشش اور محنت سے کام لیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔

وحشت اور بربریت کے موجودہ گھناؤنے ماحول میں جب کہ زندگی اپنی بیچارگی اور شکست کا کھلے طور پر اعتراف کر رہی ہے ضرورت ہے کہ ہم ——— انسانیت کے اس دوست صاحب نے شاعر اور ادیب ——— اپنی شمع کو مساعی کو اور زیادہ تیز کر دیں۔

کوئی تازہ نظم نہیں ہوئی۔ کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ زندگی جس سے آج کل گزر رہا ہوں میری شعری توانائیوں کو معطل کر دے گی۔ دعا کرو کہ اس سے جلد از جلد چھٹکارا پا جاؤں ——— پھر شاید "جمہور" کی خدمت میں تخلیقات پیش کر دینے کے قابل رہ سکوں گا۔

تمھاری یہ پیشگی مبارکباد قبل از مرگ واویلا کے مترادف ہے۔ بہرحال شکرگزار ہوں

تمھارا لطیف احمد

یادگیر ——— ۱۴ دسمبر

ڈیر اریب! کارڈ ملا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کس خط کا جواب ہو گا جو چند روز قبل میں نے تحسین علی سرور کے توسط سے تمھارے نام روانہ کیا تھا ——— مگر تم کیوں اتنی عجلت سے بے زاری کرتے۔

"چراغ" کے ماسبق شمارے کا پرچہ بھی ملا۔ مجھے انتہائی مسرت ہے کہ اب یہ پرچہ تمھارے ہاتھ آ گیا ہے۔ لیکن مجھے شک ہے کہ چندوں کی اقساط کی بنیاد پر تم اس کو کب تک چلا سکو گے۔ ہمارے ایسے کتنے ساتھی ہیں جو مسلسل چھ ماہ تک پابندی کے ساتھ اقساط کی شکل میں اس کی امداد کر سکیں گے۔

حیدرآباد کے دو دو ہیں ترقی پسند رسالے جن کی معاشی بنیاد مستحکم تھی ان کے حشر سے تم واقف نہیں ہو؟ "نیا باب" "سویرا" "جمہور" کے بارے میں کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مالی موقف کی کمزوری کی بنا پر ختم ہو جائیں گے۔ ان کو اچھے لکھنے والوں کا تعاون بھی حاصل تھا اور مقصد کے اعتبار سے بھی وہ گھٹیا نہیں تھے لیکن ان کے کارکنوں میں ایک بات کی کمی یا خامی تھی کہ وہ اپنے مقصد کی اشاعت کے ساتھ کاروبار کے استحکام کے پہلو کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ ہمارے موجودہ سماج کا ایک بدنما پہلو یہ بھی ہے کہ ادب کی اشاعت کو کاروبار کے سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے ورنہ نتیجہ معلوم!

"شاہراہ" اور "نقوش" کی بات اور ہے۔ یہ پرچے ایسے اداروں کی جانب سے نکلتے ہیں جو پبلشنگ کے کاروبار بھی کرتے ہیں اس لیے ان کے نفع و نقصان میں ایک توازن اور مناسبت برقرار رہتا ہے ——— "چراغ" کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے [illegible]

---

[1] تحسین سروری

زندہ رکھنے کے لیے خود اس کے کارکنوں کو چندوں اور عطیوں کا دست نگر رہنا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں مجھے تو شبہ ہے کہ تمھاری کوششیں بارآور اور سود مند ثابت ہوں گی — بہرحال میں ابھی صرف تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ تمھارے حکم کی تعمیل میں پس و پیش نہیں کروں گا۔ پہلی قسط ۱۵ روپے کی منی آرڈر کے ذریعہ روانہ کر رہا ہوں وصولی سے مطلع کرو

جانِ من سردار کو پیار — لاہوتوف اور شاہد کو سلام

تمھارا لطیف ساجد

یادگیر ——— ۲ جنوری ۱۹۵۱ء

جانِ اسلام یہاں آکر اس رات کی گستاخ نوابیوں کا خیال رہ رہ کر ستا رہا ہے دوسرے دن تجھ سے مل کر چاہتا تھا کہ اپنے روٹھے ہوئے کو منا لوں مگر موقع نہ ملا اور میں یادگیر چلا آیا —— معلوم نہیں جوشِ مستی میں کیا کیا بک گیا اتنا یاد ہے کہ پیش دستی بھی کر بیٹھا تھا کس قدر طبیعت چاہتی ہے کہ تو بھی میری طرح سب کچھ بھلا چکا ہو اگر ایسا ہوا تو سمجھ لے کہ بزرگوں کے اس مقولے پر ایمان لا بیٹھوں گا کہ کشتہ حرام ہے۔ اظہار ہے کہ تو کبھی بھی اس غلط اندیشی کو روا نہ رکھے گا ع

امید تو نہیں ہے مگر ہاں خدا کرے

تنخواہ ابھی نہیں ملی دو ایک دن میں مل جائے گی "چراغ" کی دو قسطیں روانہ کر دوں گا

پرچہ چھپ گیا ہے تو براہِ کرم فوراً بھیج دے ساجد

یادگیر ——— ۹ جنوری ۱۹۵۱ء

پیارے ادیب آج صبح "چراغ" ملا جیسے شام اریکیاں لکایک چھٹ گئیں بیاں نہیں کر سکتا کہ کس قدر مسرور ہوں۔ اس کی ترتیب اور مضامین کے انتخاب میں تم نے جس قدر بلند مذاقی کا ثبوت دیا ہے وہ توقع کے مطابق تو ہے۔ پھر بھی طبیعت چاہتی ہے کہ تمھیں مبارک باد دوں

حیدرآباد سے یادگیر جب آیا ہوں تو گھر کا سامان ہو چکا تھا سوائے چند ایک برتنوں اور لکڑی کے ٹوکرے کے ایک چیز بھی نہیں چھوڑی گئی اب عالم یہ ہے کہ اوڑھنے کے لیے کچھ ہے۔ بچھا کر سونے کے لیے کوئی چیز۔ کپڑے جو ساتھ لے گیا تھا انھیں سے کام لے رہا ہوں اور خوش ہوں کہ ع رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

متصل بر امتداد ہوتا تو کہتا ع

اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

"چراغ" کی دوسری قسط آئندہ مہینے میں یکمشت روانہ کر دوں گا امید کہ تم برا نہ مانو گے۔ علوی سے کہنا کہ ان کے روپیوں کی بات آئندہ مہینے پر ٹل گئی —— لاہوتوف وغیرہ کو سلام

تمھارا لطیف ساجد

ہاں تمھارے یادگیر آنے کے پروگرام کا کیا ہوا؟ کب آ رہے ہو۔ ابھی آسکو گے میں تو چشم براہ ہوں ساجد

حیدرآباد دکن ——— ۲۲ فروری ۱۹۵۱ء

جانِ من! خدا را خواہ مخواہ ایسی باتیں کیوں لکھتے ہو جو تمھارے چاہنے والوں کو کسی حال میں بھی گوارا نہ ہو سکیں خود کشی کا تجزیہ کرنے چلے ہو جیسے پابند نظموں میں ابہام ہی ہو تو ہو چکے۔ اگر تمھارا مقصود ہماری محبت تسلیم و رضا کا امتحان ہو تو

"چشم ما روشن دل ما شاد"

لیکن اگر تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ "ما مقیمانِ کوچۂ دلدار" "جو کچھ کہو بجا کہیے" "کہ خوگر ہیں" تو میں بہ بانگِ دہل اعلان کرتا ہوں کہ "میرا دل پھیر دو صاحب یہ جھگڑا ہو نہیں سکتا"

ایسی طلبیوں سے بچے آپ کو تجربے کا نام دیکر خود کو کیوں دھوکا دیتے ہو۔ بہت سوں نے یہ حماقت کی ہے تم کو اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے نہ کہ اس کا اعادہ۔ ایسے پیارے غور تو کر ــــــ اب جانے بھی دے۔ تو تو غور و فکر کی منزلوں سے گذر چکا ہے! جیسے سراب گوارا کر ہی لیا گیا ہے تو اس طلسم کو بھی دے تیرے تعلق سے آنکھوں سے لگا لوں گا دل میں کیا بیٹھے گی!!

اس میں تیرا خط سنایا تھا غالب کا مصرعہ پڑھکر کہنے لگیں کہ یہ یوں نہیں ہے۔ میں نے کہا ادیب نے ٹھیک ہی لکھا ہے۔ اگر ادیب بری کا مصرعہ ہے تیرے ہی کہا ہے ـــ

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے!

بے چاری حبیب گی، بڑی پیار عورت ہے۔ تمہیں دعا دیتی ہے لیکن اس انداز سے کہ سادگی "مشکوک نہ ہو جائے!" اور اب دو ایک دنوں سے تو کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ

دل ازیں بیش بروں آساں نیست!

یوسف ناظم کو ایک زمانہ سے خط نہیں لکھا حالانکہ جیسے پہلے کوئی ہفتہ ایسا نہیں جاتا تھا کہ اس کے دو تین خط نہ آتے ہوں۔ معلوم نہیں کیا بات ہے کہ وہ آج کل بہت زیادہ RESERVED ہو گیا ہے ـــ اسے آج ہی خط لکھا ہے اور چراغ کے بارے میں تیرا پیام و شکوہ بھیج چکا ہوں۔ جواب آئے تو تجھے مطلع کر دوں گا

میں تو وہ مار شعر انسان نہیں کہ غزل بن کر چھپیں۔ اس مہینہ تو چراغ میں میری کوئی چیز نہیں آ رہی ہے۔ آئندہ ماہ تک اگر کچھ لکھوں تو بھجوا دوں گا

اور کیا لکھوں۔ اسعد کو تو مع الخیر ہوگا۔ لاہوٹوف کہاں ہے؟ علوی اگر حیدرآباد آگئے ہوں تو انہیں سلام کہنا۔

تیرا مخلص ساجد

اودگیر ــــــــــــــــ ۲۰ / اپریل ۵۸ء

ڈیر ادیب! کئی دنوں کے بعد تمہارے خط کا جواب لکھ رہا ہوں۔ پرسوں "شاہراہ"، "اردو" "چینی ثقافت" وغیرہ کے پیکٹ وصول ہوئے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کتابوں کے انتخاب کا حق تم نے ایجنٹ صاحب کو دے رکھا تھا میں نے جس موضوع پر تم سے کتابوں کے انتخاب اور ان کی روانگی کا وعدہ لیا تھا اس کو شاید تم نے بھلا دیا۔ ۶½ روپیہ کا وی پی آیا۔ اور مستقبل کا بہ پڑھنے کو ملی میں کچھ ٹھوس ساہتیہ کی مدد کتابیں پڑھنا چاہتا ہوں اسلوبی لٹریچر نشر و طبع گمائش منگوا لیا کروں گا۔ براہ کرم آئندہ انتخابِ کتب میں اس بات کو پیشِ نظر رکھو

چنگیز[1] کا خط آیا تھا اس لئے تمہارے خط کا ذکر کیا ہے آج اس کو بھی خط لکھ رہا ہوں بات یہ ہے کہ وہ مستقبل ہمیں مارکیٹ ہے اسی لیے چراغ کے خریدار سانے کی مہم میں وہ مجھ سے سبقت لے جا سکا بے چارا شاعر بھی ہوتا تو تم دیکھتے کہ کام کا آدمی کون ہے؟

مار کر اے یار اپنی دلبری پر مار کر
جوش ساحر و رہ تیرا غلام کر بھی

یہاں گرمیاں اس حد تک شدید ہیں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ صبح میں ۹ بجے نہیں ہوتا ہوں کہ دھوپ تیز ہو جاتی ہے

---

[1] چنگیز علی خاں نادر

جگمگا رہی ہیں رات آئی ہے تو وہ بھی ڈھلتی ہے ـــــ بس یونہی۔
رسمِ اسیری اوقات چلی جاتی ہے!

تم کبھی میرے گھر آئے بغیر کیوں مجبور رہے ہو کہ مسز ایگم تم سے پردہ کریں گی؟ وہ پردہ وغیرہ قسم کی باتوں کی کچھ زیادہ قائل نہیں ہیں خصوصاً تم سے۔ عمر آدمیوں کے سامنے وہ بیٹھاں بھی کیوں بیٹھیں گی؟

امن والی نظم ادھوری ہی رہ گئی ایک غزل کے تین شعر ہوئے ہیں چند ایک روز میں مکمل کر کے چراغ کے لیے بھیجوں گا۔ اس کی قسط کے لیے بھی کوئی کوں مل رہے ہیں مطلع کرو چراغ آئندہ مہینے تو نکل سکے گا؟

تمہارا لطیف ساجد

یادگیر ـــــ ۱۲ دسمبر ۵۱ء

مائی ڈیر ادیب! حیدر آباد سے یادگیر آیا ہوں اور عالم یہ ہے کہ۔

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

پرسوں سحر[1] میں تم سے مختصر سی گفتگو میں ایک یاد۔ ایک نئی امنگ پیدا ہوئی تھی سوچا تھا کہ بر وقت میں کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ گزشتہ (۲۲) گھنٹوں میں کم از کم اٹھارہ گھنٹے کام وقت کرتے تھے لیکن ایک شعر بھی لکھ نہ سکا طبیعت راغب ہی نہیں ہوتی ـ مگر بہرحال زندہ رہنا ہے اور زندگی کا ثبوت دینا ہے لکھوں گا اور ضرور لکھوں گا۔ مدانی ردعمل کی باتیں نہیں شعوری اصرار ہے ـــ مجھے یقین ہے کہ تم بھی سکوت سے کام نہ لوگے

تمام ساتھیوں کو سلام۔ تمہارے جواب کا منتظر۔

تمہارا لطیف ساجد

یادگیر ـــــ ۴ جنوری ۵۲ء

ڈیر ادیب! خط ملا نظم آزادی یا یا وہ تمہاری ہے اس لیے اچھی ہی ہوگی۔ اس کے علاوہ چونکہ ایک طویل سکوت کے بعد کہی گئی ہے اس لیے اس میں بھرپور طوفان آرائیاں ہوں گی لکھ بھیجتے تو اچھا تھا میرے[2] حیدرآباد آنے کا امکان ہے وجہ یہ ہے کہ ابھی تک ان موقعوں کی فراہمی کا انتظام ممکن نہیں ہو سکا جس کا اشارہ تم نے کیا ہے اور جس کے لیے میں عموماً حیدرآباد آیا تھا۔ آج قریشی[3] صاحب بیدر سے یادگیر آئے ہوئے ہیں انھوں نے سرسری طور پر اسی مٹی کو لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا میں نے فوراً ہی رضامندی ظاہر کر دی ہے کچھ دن بیوی بچے وہاں رہیں تو کچھ روپیہ بچا سکوں گا ورنہ کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔ اس اندوہ زندگی نے جسے عرف عام میں گرہستی کہتے ہیں، جس کہ مات ہے ناطقہ بند کر دیا ہے آج تنخواہ ملے کر دو دن ہوئے اور تم کو یقین نہیں آئے گا کہ میرے صرف سترہ (۱۷) روپے پڑے ہوئے ہیں اور اسی مہینے کے پورے (۲۷) دن سامنے اپنا بھوکا چہرہ لیے کھڑے ہیں۔ تنگ آگیا ہوں۔ کل رات اس قسم کی جھنجھلاہٹ میں بالکل پہلی مرتبہ تین رباعیاں کہہ ڈالی ہیں تمہارے لیے بھیج رہا ہوں۔ ان کو پڑھو اور اندازہ کرو کہ تمہارا ایک دوست کتنا حساس ہی کس بری طرح بے روزگاری کے عالم میں بسر کر رہا ہے عرض کیا ہے۔

وہ درد کہ دل شکستگی میں بھی نہ تھا
وہ سوز کہ روح کے تڑپنے میں بھی نہ تھا
سانسوں میں یہ تلخی کہاں سے آیا
وہ کرب کہ میری شاعری میں بھی نہ تھا

---

[1] [illegible] کا بیٹی تھی۔ [2] حیدرآباد۔ [3] ساجد مرحوم کے خسر

احساس کو نغمے کا بہانہ نہ ملا
اک وقفۂ غم بھی شاعرانہ نہ ملا
کیا کہیے کہ بس یہ زندگی کی روداد
ہے کاوشِ غم بھی سہانا نہ ملا

دل دادۂ لطف سوزِ تنہائی ہیں
بیزار ز حروشِ بزمِ دنیا بھی ہیں
ہوتا ہے ابھی مجھے یہ جانے کیا کیا
گمنام ہیں ہوں اور رسوا بھی ہیں

بہر حال یہ دکھڑا تم کو اس لیے سنایا کہ تم لوگوں سے ملنے کے لیے کس قدر مجبور ہوں اور مجھے حیدرآباد آنے کے لیے کتنی "غیر ارادی" حرکتیں کرنی پڑتی ہیں۔ تم میری زندگی کے اس ایک چھپے ہوئے پہلو سے بھی واقف ہو جاؤ!!

چراغ کی ادارت سے اوا حرالی اور اس کی سرگرمیوں کی محدودگی کی اطلاع سے خوشی ہوئی۔ میری ایک نظم "چراغ" میں چھپ ہی جائے گی۔ ایک اور تیار ہے جو چند روز قبل لکھی تھی جس کا عنوان ہے ——— "پرچم امن و عافیت کے تلے" یہ یا تو "چراغ" کے آئندہ کسی شمارے کے لیے بھیجوں گا یا پھر کسی اور پرچے کو دیدوں گا۔ تم اگر مناسب سمجھو تو "شاہراہ" کے لیے ٹھیک رہے گی لیکن اس کے لیے تمہارا توسط ضروری ہے تم اس سے ہولئے جا چکے ہو!!

لاہوتی کے بچے نے معلوم نہیں کیا کیا لکھ دیا ہے کہتے ہیں اس کو پیار نہیں کرتا۔ اب محسوس ہو رہا ہے کہ ہم لوگوں نے اس کو اپنے حلقے میں شریک کر کے کس قدر حماقت کا ثبوت دیا ہے بات کر لیتے ہیں یا رہا ہے زیادہ اس کو ہم اپنی صحبتوں میں دخیل ہونے کا موقع دے دیتے ہیں تو اب اس کو یہ پیار وی کی بھی سوجھ رہی ہے۔ "الو کہیں کا"!

اُسے بے شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے!

شاہد، سردار و لاہوتی کو سلام

تمہارا۔ لطیف ساجد

یادگیر ——— ۲۹ اپریل ۵۲ء

ادیب صاحب! بے کیفگی کے الزام کو آپ سے منسوب کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ کے تعلق سے کوئی اور بہتر تصور ممکن نہیں ہے ——— کلکتے سے آٹھ دس خطوط تک ہیں وہی کہ حیدرآباد آ کر کیا کرتے رہے وہاں کیا تیر مارا۔ اور یہاں کیا جھک مارتے رہے۔ لاہوتی کے بچے کو بھی خط لکھا تھا کہ تمہارے بارے میں کچھ تو لکھے۔ وہاں سے جواب ندارد۔ عاتق شاہ کو لکھا تو آٹھ دن کے بعد آج اس نے جواب لکھا ہے کہ ادیب اور مخدوم کو آکر ایک زمانہ بیت گیا ممکن ہے کہ ان کا کوئی تفصیلی خط آپ لوگوں کے تعلق سے تم کو ملا ہو ——— اب میں اس کو کس طرح لکھوں کہ مخدوم سے پہلے تم وہاں سے لوٹے تو ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ اب تو ان کے لیے بھی ادیب ہو گئے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے بصورت دیگر تردید کر سکتے ہو؟

وہاں تم لوگ کیا کر رہے ہو۔ تفصیلی طور پر لکھو میں خیریت سے ہوں۔ تمہاری خیریت کا متمنی۔

تمہارا لطیف ساجد

یادگیر ———————— ۲۰ مئی ۵۲ء

اے غایب از نظر کہ شدی ہم نشین دل!

خط نہ ملا تمہارے شدید قسم کے احساس پہ مروتی پر تشویش تو ہم سے بیاز سے لوگ کرتے ہیں۔ خدا جانے ان کی [illegible] بازار مصر میں کیا کمی ہے۔ تم کلکتہ گئے اور آئے اس کا علم اخباروں سے بھی ہوا تھا۔ تم سے پوچھنے کی ضرورت یوں ہوئی ہم کو [illegible] ایک خط لکھنا تھا اور کچھ۔ کچھ جواب منگوانا تھا —— اور بس! اس قسم کے رسم مراسلت کی داغ بیل ہمارے تمہارے [illegible] غالب نے بہت پہلے ہی ڈالی تھی — کہا ہے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

غالب کا ہر مقام پر قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بظاہر سیدھے سادے اور سپاٹ قسم کے اشعار میں بھی عام تحریروں اور روداد کی ایک دنیا ہوتی ہے

تو آج کل بیرپیٹ ہو۔ اس میں کچھ لڑکیوں نہیں لیتے؟ ورنہ بھی رہو گے اور دامن پاک رہی بھی۔ جھوٹ کا بھی! ہم تو اس کے قائل ہیں۔ یا تو بیٹھے ہی رہیں گے اور وہ بھی شعر! یا پھر ساتھ بھی نہ لگائیں گے (اور اس کا شکل بھی ہے) تم کو تو معلوم ہیں کہ شعر کہتے ہیں۔

... بیر تو بیوی کی مثال ہے کہ ہر طرح چھیڑنے کو کوئی بھی تار نغمہ زاں ہوتی نہیں سکتا —— انتظار کرو میں عنقریب آرہا ہوں میں بھی اپنا ہوا سلسلے کی کوشش کروں گا

تو قبلہ مرزا[1] بھی حیدرآباد آگئے۔ ایک بار کی ملاقات تاؤں موصوف ہی نے سب سے پہلے خاں[2] میں ہم کو ترقی پسند بنایا۔ تفصیلات بڑی دلچسپ ہیں لاہوتی سے پوچھو —— براہ کرم ان تک میرے مدارات تشکر پہنچا دینا کہ ان کا اولیں شاگرد رشید ہمانہ خوانی کی اس بلندی پر ہے جہاں سے شاید وہ بھی گرد راہ معلوم ہوں گے

نیگور ڈے کی کامیابی کا متمنی ہوں اور ایسے شرکت نہ کر سکنے پر ملول!

تمہارا لطیف ساجد

یادگیر ———————— ۱۶ جولائی ۵۲ء

ڈیر اریب! کافی تاخیر کے بعد آج تمہارے نام ۱/۲ ۲ کلدار کا منی آرڈر روانہ کیا ہے۔ لاہوتی کو دے دینا مرزا حیدر سے اخلاق کی راہنمائیاں دیکھ رہی، پی حاصل کرنے کی تاکید کی تھی۔ وہ بھی کل چھوڑ دی ہے۔ اب میرے پاس کتابوں بن ماہ کا اشاک ہے۔ ان مہینوں میں تشویل راتیں شامل نہیں ہیں

میں نے وہ غزل مکمل کرلی ہے جس کی خواہش تم نے کی تھی کہ اس پر لکھی جانے والی غزلوں کا پورے خاص اس میں موجود [illegible] چیز بھی غالب کے طرفدار ہو۔ اس لیے پسند کرو گے ہی! غزل بھیج رہا ہوں۔ اپنی غزل کے ساتھ کسی بھی پرچہ میں چھپنے کے لیے [illegible] بہار کے لیے نہیں البتہ نظم پر چم امن۔ معلوم ہوا ہے پرکاش پنڈت نے لکھا ہے کہ اگست کے پرچہ میں چھپ جائے گی اس لیے اب زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہماری دونوں غزلیں حیدرآباد کے کسی رسالے میں شائع ہوں —— یا تو ایوان میں [illegible] میں۔ بہرحال جو تم مناسب سمجھو۔

[illegible] میں کیا کرتا ہے وہ سیدار راتوں میں گھر کب ملتا ہے اور تم اپنے بارے میں بالتفصیل لکھو۔

[illegible] شہ حیدرآباد کا ایک بار گہ نیاز حیدر

کراتیں کس طرح کٹتی ہیں دن کیونکر گذرتے ہیں

یادگیر آنے کے بارے میں تم لوگوں نے کیا سوچا ہے؟ کب تک آسکوگے؟ حسینی شاہد نے بھی یہاں آنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اس سے بھی پوچھا

میں آج کل یہاں تنہا ہی ہوں اور سہ پہر دوسرے تیسرے روز پی لیا کرتا ہوں

تمہارا لطیف ساجد

یادگیر ———— ۱۳ اگست ۵۲ء

اریب! چند روز قبل کمرہ نمبر ۳۵ کے پتہ پر خط لکھا تھا اس کا جواب نہیں آیا۔ یہ کمرہ نمبر ۱۰ کے پتہ پر بھیج رہا ہوں۔

نجم الثاقب[1] صاحب طالب علم تھرڈ ایئر لیو کور ملنے کی توقع پر تم متعارف ہو چکے ہو ان کے چھوٹے بھائی نجم الہدیٰ صاحب جو یہاں کے بلدیہ کے رکن بھی ہیں مخدوم کے مجموعہ کلام "سرخ سویرا" کو دوبارہ اپنے اخراجات پر چھپوانا چاہتے ہیں وہ اس پر راضی ہیں کہ شاعر کو مناسب معاوضہ بھی دیا جائے سکنڈ ایڈیشن میں شاعر کی جدید نظمیں بھی شامل کی جائیں گی مجموعہ کی اشاعت تک وہ جلد ہی انتظام کریں گے وہ اس خصوص میں تم سے مشورہ چاہتے ہیں کہ کتاب کی طباعت میں کوئی سوالات تو نہیں ہیں اور یہ کہ شاعر کو کس قدر معاوضہ دیا جانا چاہیئے۔ اور دیگر شرائط کیا ہو سکتے ہیں پہلا ایڈیشن غوث[2] نے چھپوایا تھا اب اس کی ایک کاپی بھی بازار میں مل نہیں سکتی دوسرے ایڈیشن کے لیے میرا خیال ہے کہ غوث سے اجازت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس خصوص میں تمہارا تفصیلی خط آنا چاہیئے

تمہارے جواب کا منتظر — تمہارا لطیف ساجد

یادگیر ———— ۲۰ اگست ۵۲ء

اریب! تاباں[3] کا خط آیا تھا لکھا ہے کہ میری نظم "تعارف" کا انتخاب ہوا ہے جس کی کتابت بھی ہو چکی ہے انتخاب کرنے والے صاحب[4] کے ذوق پر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح اعتبار کیا جائے بہت بڑے نقاد ہیں۔ اس کے باوجود ذوق انتخاب کا یہ عالم ہے! تاباں نے لکھا ہے کہ اب کسی طرح بھی وہ نظم تبدیل نہیں ہو سکتی

براہ کرم مطلع کرو کہ تمہاری کونسی نظم کا انتخاب ہوا ہے تاباں کا خط تمہارے نام بھی آیا ہوگا

سردار اور سلیمی کو سلام — تمہارا ساجد

یادگیر ———— ۲ نومبر ۵۲ء

آداب! خط لکھا آج تین دن ہوتے تمہاری رہائی کی اطلاع اخباروں میں پڑھی تھی اور اسی دن ڈاکخانہ سے لفافہ منگوا کر محفوظ رکھا تھا۔ مگر ابھی تک سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا لکھوں تمہاری گرفتاری پر کوئی خاص افسوس نہیں ہوا تھا تو رہائی پر غیر معمولی خوشی کیوں ہوتی؟

مجھے معلوم تھا کہ —

قید کیا رہائی کیا ہے ہمیں تو ہر عالم
چل پڑے تو صحرا ہے رک گئے تو زنداں ہے

تم لوگوں کا "آنا جانا" اب کوئی تعجب انگیز خبر نہیں رہی۔ تمہیں مبارکباد کس چیز کی دوں؟ تم صعوبت کی سعادت کا سامنا ہو، یوں بھی ہر وقت حاصل ہی ہے۔ چاہے تم جیل جانے کی پوزیشن میں رہو یا نہ رہو

سردار کو تمہارا قائم مقام سمجھ کر یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ یعنی جب تم جانتے ہو کہ بلا لیا گیا تھا مگر یہ بات ابھی سے کہنا

۱۔ ملی شیشہ گجر ۲۔ غوث محی الدین ۳۔ غلام ربانی تاباں ۴۔ پروفیسر احتشام حسین

"... یوں بھی ہے اور یوں بھی"

[illegible] ———

تم لوگ واقعی آ رہے ہو؟ مذاق تو نہیں کر رہے؟ میری بیوی ابھی یادگیر میں ہی ہے۔ میں اس وقت بھی یہی سمجھتا کہ اس کے دن پورے [illegible] یہ معلوم کر کے بہت کوفت ہوئی کہ اس مہینے کے ختم تک ہی وہ یہاں رہ سکتی ہے ——— یا اولی الابصار! حیرا اس کی موجودگی سے کوئی خاص فرق نہیں پڑنے کا۔ لکھ میرا تو یہ خیال ہے کہ TALBE کے انتظامات میں کچھ آسانی ہی آ جائے گی۔ یہ اور بات ہے کہ تم لوگوں کو بدانتظامی و مسلط کا ثبوت دینا ہوگا تو پھر قطعی طور پر سنجیدگی سے لکھو کس تاریخ کو وہاں سے نکل سکو گے اگر اسی مہینے کی کسی تاریخ کو آ سکتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ دسمبر کی دوسری تیسری کو میں بیوی کو چھوڑنے کے لیے علی گڑھ آ رہا ہوں واپسی میں تم لوگوں کو ساتھ لیتا آؤں گا۔

تم نے میری جس غزل کے مطلع کو پسند کیا ہے اگر وہ یہ ہے تو وہ غزل ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے

ساحل کا سکوں بقدر ہمی طوفاں کے اشارے اور بھی ہیں

انسان اگر مایوس نہ ہو جینے کے سہارے اور بھی ہیں

ایک دوسری تازہ ترین غزل بالکل مکمل اور چھپنے کے لیے تیار ہے کوئی لینے والا؟ تمہاری ایک پسندیدہ غزل "عوام" میں پڑھی تھی "آتے ہیں جاتے ہیں" جس کے قافیے اور ردیف تھے وہ بالکل تمہارے حسب حال تھی کیا اچھا ہو اگر تم اپنی تازہ غزلوں میں سے کسی ایک کو روانہ کرتے غزل بھیج کر۔ تعریفی خط حاصل کر ناسا کر داد حاصل کرنے سے زیادہ اچھا ہے کہ سند رہی اور وقت ضرورت کام آتی ہے پھر تمہاری مرضی میں تو اپنی غزل بھیج رہا ہوں "حاضر الوقت" تو کیسی ہوں ان کو سلام اور خاص طور پر سردار، بدو بہشتہ اور ابا ہوں کو

تم سے ملنے کا متمنی۔ ساجد

یادگیر ——— ۱۵ نومبر ۵۲ء

ڈیئر رب! پرسوں تمہیں ایک خط لکھ چکا ہوں تمہاری آمد کے سلسلے میں یہاں کے چند لوگوں ساتھیوں نے ایک محفل شعر کے انعقاد کا بھی انتظام کیا ہے۔ میں تمہیں لکھ چکا ہوں کہ شاید صدیقی بھی آ جائیں تو سانسہ رہے گا۔ براہ کرم کسی طرح شاہد کو راضی کر لو دو دن کی فرصت اس کے لیے کوئی خاص بات نہ ہوگی

تمہارا ساجد

یادگیر ——— ۲۰ نومبر ۵۲ء

ڈیئر رب! دو تین دن ہوئے تمہارا خط ملا اور اس کا بھی علم ہوا کہ تم نے خورشید الزماں، گوپال اور سرور صاحب نیز گورکھپور کانفرنس کے تعلق سے خطوط لکھے ہیں۔

تمہیں یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ تمہارے یادگیر آنے کے تیسرے دن بعد ہی خفیہ کے آدمی نے پوچھ گچھ شروع کر دی تم کیوں آئے تھے، میرا تم سے کیا تعلق ہے وغیرہ وغیرہ ——— وہ تو ٹھیک ہوا کہ سب انسپکٹر پولیس نے ایمانداری سے رپورٹ کر دی کہ تم [illegible] یادگیر آئے تھے اور میرے یہاں ٹھہرے تھے اور یہ کہ تمہارا یہاں آنا پریم چند سوسائٹی کے قیام کے لیے نہیں تھا ——— اس کے بعد [illegible] کے خلاف کچھ مزید تحقیقات ہوں گی ——— دریا دھرمی جنہوں نے اس جلسہ کی صدارت کی تھی ان کا بھی بیان لیا گیا ——— بہرحال دیکھیے کیا ہوتا

یہاں دسمبر کے پہلے ہفتے میں جلسہ نہیں ہو سکوں گا آخری ہفتہ تو آنا ہی ہے ——— پریم چند سوسائٹی کے مقاصد اور مقاصد ابھی واضح نہیں ہوئے۔ منور بیگم تم کو سلام کہہ رہی ہیں اور خاطر خواہ تمہاری تواضع نہ کر سکنے پر متاسف ہیں۔

[illegible]

اور کیا لکھوں سب کچھ خیریت ہے! سردار وغیرہ کو سلام
تمہارا لطیف ساجد

یادگیر ———————— ۱۲؍ دسمبر ۵۰ء

ڈیر ادیب! اکانڈولا ڈورسے اور بہم جانے کی بات ہی کیا ہے ایک امروانی کی اطلاع تم کو دی تھی تحقیقات اگر کچھ ہو سکی ہیں تو ہوسے دو میں تمہارے خط کا انتظار کر رہا تھا اس لیے دوسرا خط نہیں لکھا

میں ۲۰؍ دسمبر کی صبح حیدرآباد جا رہا ہوں کانفرنس ۲۶ سے شروع ہو رہی ہے لیکن رخصت مجھے اس تاریخ سے نہیں مل سکی یوں بھی میرا خیال ہے کہ ۲۰ سے ۲۹ تک کے اجلاس زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ دعوت نامہ ابھی مجھے نہیں ملا کوئی غزل یا نظم ابھی تک نہیں ہوئی تم مجھے "شہرت" کے آسمان پر بھی پہنچانا چاہتے ہو لیکن یہاں دل و دماغ کے سوتے جیسے سوکھ گئے ہیں سب سے بڑا PROBLEM یہ ہے کہ مشاعرہ میں کیا سناؤں، لے دے کے ایک غزل ہے جس کو تم سن چکے ہو

چند روز قبل پنڈت دستی دعوت دالنکار کی صدارت میں یہاں ایک عام کوی سمیلن ہوا جس میں ودربھ بھارت کے ایک کوی اگنیش اور ایک شریمتی نے (جن کا نام مجھے یاد نہیں لیکن آواز ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہے) اپنی کویتائیں پڑھیں۔ اگنیش کافی ترقی پسند خیالات کے حامل ہیں لوگوں نے ان کو بہت پسند کیا میں نے بھی اپنی ایک کویتا پڑھی "غنڈوں کی چالوں میں نہ آؤ"

وحید[1] سے ملاقات ہوئی تھی ایک رات اچھی گزری تم بہت یاد آئے۔

دعوت نامہ ملا تھا؟ ادیب گی کرایہ آمد و رفت بھی؟ تم نے سردار کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا اس کا ذکر یا کم از کم اس کا سلام تمہارے ہر خط میں ہونا چاہیے

اور کیا لکھوں تمام دوستوں کو سلام خاص طور پر سردار، شاہد اور لاہوتی کو
تمہارا ساجد

یادگیر ———————— ۲۴؍ فروری ۵۳ء

بھائی صاحب! اکارڈولا کمی۔ یوں سے میں آپ کے خط کا منتظر تھا خود لکھنا چاہتا تھا مگر —
آج کل آپ سے ناراض ہوں سلام

کچھ کانفرنس کے بعد یہ گر آیا ہوں تو یقین تھا کہ جن سے وعدے کیے تھے ان کو پورا کر سکوں گا۔ آج بھی نادم ہوں مشکل دو ایک وعدوں کا ایفا بھی ہو سکا عالم یہ ہے کہ بیوی، والد، بھائی، اخبار (نرائن آنچل والے) اور آپ سب ہی معترض ہیں — بیوی کی رنجش ہو کر پندرہ دن ہو چکے ہیں آتے ہوئے اس سے وعدہ کر آیا تھا کہ ہر حال تحفہ ... پر مریدی اخراجات کے لیے اس کی توقع سے کچھ زیادہ روپیہ ادا کروں گا جو ممکن نہ ہو سکا۔ ایک بھائی جو بی ایس سی فائنل میں پڑھتا ہے اس کی امتحان کی فیس بھی پوری نہ ہو سکی۔ اس کا اگلا ... کو اس سے کچھ زیادہ روپوں کی ضرورت تھی لیکن ان کو ان کے نام معمول سے کم ہی روپیہ ملے۔ اخبار کا دعویٰ ... والد نے اپنے ایک ... سوالی تھی اس کی ایک پائی بھی ادا نہ کر سکا۔ اور تم تو کل گذار ہو! تم پوچھو گے کہ تنخواہ کے روپے کیا ہوئے۔ ان سارے ہی میاں گئے۔ تجھے تفصیلات لکھ کر تمہیں کیوں بور کروں! بہرحال معاف کر دو کہ تم سے کئے ہوئے وعدے کی تکمیل کے موقف میں نہیں ہوں۔

میں فروری کے پہلے ہفتے میں بلدہ آرہا ہوں — یہ لوٹ ہرا وہ سالنامہ آگیا ہے۔ اس میں تمہاری غزل سب سے پہلے پڑی اچھا لگا بس! سردار کو سلام لاہوتی کو پیار

تمہارا ساجد

---

[1] محمد عبدالمجید

صحبت

۲۶ فروری ۱۹۵۳ء ———— پیاد گیر

ڈیئر ادیب۔ اقبال ادیب جو خط لکھا تھا اس کا جواب نہیں آیا۔ میری رخصت کی منظوری کے بارے میں تم نے سردار کو جو بارے
صدر دفتر بھجوایا تھا یا نہیں؟ تین چار دن ہی باقی رہ گئے ہیں اور ابھی تک رخصت کی منظوری کے سلسلے میں مطلع نہ ہو سکا
تلی کون کوشش چل سکے گی موقف میں ہے؟ عبدالغنی نے خط لکھا تھا اور مایوسی کا اظہار کیا تھا تمہاری شکایت کی ہے کہ تم نے کانفرنس
میں شرکت کے لیے فنڈ کی فراہمی کا کام شروع ہی نہیں کیا

کیا اقبال تین چل رہا ہے؟ اس کا ارادہ تو قطعی تھا میں اسے آج ہی خط لکھ رہا ہوں
سردار کے باپ سے تم نے اس کی سفارش کی ہے یا نہیں؟ تم اس کے باپ کے دوست ہو نا؟ عجیب بات ہے کہ ایک
دوست کا باپ تمہارا دوست ہے اور دوسرے دوست کا باپ صمد۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ صمد باپ کا کام تم نکال سکتے ہو
یا دوست کا دوست باپ؟ میں تو کہتا ہوں کرامت کا رکھے جس لطف اس وقت دوست باپ سے اسے دوست کا کام نکالو
تم نے مجھ سے دو شعر لیں حاصل کی تھیں۔ ایک "عوام" کے لیے دیدی۔ کیا تم میری عظمت اور شہرت کو معافی ہی رکھنا چاہتے ہو

خط کا جواب فوراً دو　　　تمہارا ساحر

پڈاپلی (طبارشاہ لائن) ———— ۱۴ مئی ۱۹۵۳ء

ادیب! ۱۲ مئی کو یہاں پہنچ چکا ہوں دوست کے ہاں ایک مکان میں اڈہ جمالیا ہے ہوٹل میں کھانے کا انتظام کر لیا
ہے۔ پینے کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا اور نہ اس کا امکان نظر آتا ہے آج جو کبھی رات بھی یونہی گذر جائے گی پھر آٹھویں پھر سولہویں
اور پھر سلسلہ روزانہ دست کا تانتا بندھ جائے گا تاآنکہ تم سن لو گے کہ بعض حادثات میں گزر گیا ہوں

دشمن کو بھی دکھائے نہ یارب شام میں
وہ بے بسی کہ عالم SOBER کہیں جسے

پڈاپلی انتہائی گرم مقام ہے لوگ بھی کم آمیز معلوم ہوتے ہیں ایک حامی آکسفورڈ سے متعلق ہو جاتا تھا کہ اس نے کہا
"ماہ الترام" سے اچھا کوئی اعتبار نہیں

سردار وسعت لاہوٹی کو سلام　　　تمہارا ساحر

پڈاپلی (طبارشاہ لائن) ———— ۲۰ مئی ۱۹۵۳ء

ڈیئر ادیب۔ انگارڈ اور تسبیح کا سیکولر لٹریچر دونوں ملے۔ تم براہ کرم چند اور سیکولر لٹریچر روانہ کرو تاکہ
میں یہاں کے چند آدمیوں کی سب اسپکٹروں کو خریدار بنانے کی کوشش کروں۔ اتفاق سے یہاں دو سب انسپکٹر ایسے ہیں جو مجھے ہستی کالج
کے زمانے سے جانتے ہیں میری شاعرانہ عظمت سے مرعوب ہیں ان کو پھانس لوں گا

عزیز قیسی نے "نئے سوامیں ہوں تماشا سر بازار" کی زمین میں غزل کی خواہش کی تھی ایک مطلع کے بعد خیال
آیا کہ اس زمین میں غزل کے شعر مشکل سے نکلیں گے کیونکہ میں اسے عرصہ قبل اس بحر میں۔ بدلی قافیہ۔ بیگانۂ آلام۔ وابستۂ آلام۔
والی غزل کہی تھی جس میں کافی غزل کا انداز تھا اب جو عزیز قیسی کی مجوزہ زمین میں غزل کا ارادہ کیا تو بار بار پچھلی غزل یاد آتی
اور مطلع کے علاوہ ایک شعر بھی۔ ہو سکا وہ مطلع سن لو۔

وارفتۂ اظہار۔ آزردۂ اظہار
وہ حسرت تمنا کہ ہے زخم دلی خود دار

یہاں آ کر سوالات پیدا ہوتے ہیں قسم لے لو اگر ایک رات بھی تنہا گزاری ہو۔ البتہ تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہمیں کسی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ زندگی اس قدر یکساں اور بے اصولی ہو گئی ہے کہ مقررہ اوقات میں کسی مخصوص کام کا ہونا ضروری ہے لیکن معلوم نہیں کر کے تھکے۔ زیادہ افسوس ہوگا کہ مضمون اور مقالے کی تنظیم میں ہمیشہ دیر لگے گی، گنجائش کل ہی نکلی۔

حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

امر صارقی سے ملاقات ہوئی تھی بے چارہ چند کتابیں دی ہیں بس یہی ایک دلچسپی کا مشغلہ ہے

یہاں گرمی کی بلا کی ہے ابھی کہ یہاں سے قریب ایک مقام رام گنڈم میں دو آدمی سن اسٹروک سے ہلاک ہو چکے ہیں ہم نے لاہوتی کے روپوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے مجھے اس کا احساس ہے دراصل یہ کہ ممکن ہے وہ اس کی تکمیل کر دوں گا مجھے افسوس تو زیادہ کہ درمیان میں حائل کیے ہوئے دس روپوں کا ہے۔ تم نے جس روپے بھی کھولے تھے دس روپوں کے لیے واقعی میں نے بڑا سے وعدہ کیا تھا کہ سب روپے ملتے ہی ادا کر دوں گا مگر جو کچھ ہوا اس سے تم واقف ہو سکے پہلے چند روز بعد میں ان کی ادائیگی کر دوں گا — زیادہ ملے تو براہ کرم میری غلطی کے لیے معافی چاہ لینا (میری جانب سے)

میرا پیار الماس اور لاہوتی وغیرہ کو سلام

تمہارا ساجد

یدالیؔ (طہارت شاہ لامس) ———————— ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء

اریب! آج کی رات میری اٹھارہ دن کی بے بسی کا تو تغیر مایوسی میں بدل گئی تھی۔ کم ٹوٹنے والا ہے اب دو دن کے ہیں اور کچھ دیر بعد سلیمانیاں کرنے کی طاقت کا مالک بن جاؤں گا — وہ رات جس سے انتظار کر رہا ہوں ایک ایک لمحہ ایک ایک گھڑی گن گن کر کٹ رہا ہے — ابھی ایک نئے آدمی نے آ کر کہا ہے کل وعدہ کیا تھا کہ اول وقت ملا دوں گا — دفتر کے چوکیدار کو آج رات چھٹی دے دی ہے لیکن ایک علالت ابھی سے دل میں اکھر رہی ہے کہ رات بالکل نہ رہے گی۔ محمد لعل بادہ پیا، یہاں کہاں سے آئیں گے انگور، حبیب۔ یہی نہیں کہ اس کی تم نے سبھی سب کچھ بھلا دیے —

رندوں بہرے کو گھٹ پڑا ہے

تمہارا ساجد

یدالیؔ (طہارت شاہ لامس) ———————— ۱۸ جون ۱۹۵۳ء

ڈیئر! تمہارا خط ملا۔ سب ٹھیک، عدم وصول بے جس کا بے حد افسوس ہے — اگر وہ پوسٹ کیا جا چکا ہے تو شاید مجھے مل جائے گا اور میں اس کے بارے میں اپنی رائے دے سکوں گا۔ زمانے بالکل بے لاگ اور جانبدار ہوگی اس لیے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر، ورکی یا تمہاری جو بھی... لاہوتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یوں اگر ورما صاحب کی خواہشوں کے احترام میں تمہارا کوئی معاوضہ ہے (اور مجھے یقین نہیں کہ ایسا ہوگا) تو میں پرو نیکچے لیسر کی نثر میں ایک قصیدہ لکھ کر راست ان کے پاس روانہ کر دوں گا۔ اور تم اس سے واقف ہو کہ تمہارے تعلق سے۔

"میری تو جو ہے کہ جو کچھ کہو سچ کہیے"

امر صارقی آج کل بہت مصروف ہے الہ آباد کرتا ہے کہ مصروف ہے مقامی مدرسے کے امتحانات ہیں، جولائی کو ہی الکشن لڑنے والی جماعتیں دست و گریباں ہونے والی ہیں۔ اور صارقی اپنی صلاحیت و استطاعت COMPAIGN چلا رہا ہے کل فرصت ہوئی تھی تب مجلّہ کے لیے مضمون مانگا تھا ان کے پاس نکلو کے حساب کو دیا پر ایک طویل ترین مضمون تیار ہے۔ صاف نویسی کے بعد وقت نکال کر تمہارے پاس روانہ کرنے کا انھوں نے وعدہ کیا ہے

ـــــــــــــــــــــــــــــــ

سلہ سہ ماہی ننا عہ اقبال شاہین

صبا

میں ۲۲ جون ۱۹۵۳ء کی رات ٹرین سے جدہ کے لیے روانہ ہوں گا یہاں کے مستقل ہیڈ ماسٹر نے صرف آٹھ دن کے لیے رخصت بڑھا لی ہے۔ ان کو ۲۶ کو آنا چاہیے۔ ایک ایک لمحہ شاق گزر رہا ہے ایک مہینہ سے زائد کی طویل اور تھکا دینے والی مدت یہاں صرف کر دی ہے وہ بھی جیسے تیسے چپکے چپکے کر

تنہا تنہا اداس حیراں

سوچا ہے کہ جا کر جلدی گلابی آ رہا ہے دو راتوں کے "بال" اپنی گھاس ہے لندن راتوں کی سیل۔ ہاں آ کر نکال ہی لوں گا

میں بھی ہوں اے دل گلابی کی قسم کھائے ہوئے

یہاں پچھلے دنوں سے موسم قابل ہو گیا ہے آسمان کو دیکھتا ہوں تو جیب کا خیال آتا ہے

کیا کروں اے ہمت یارگی دردِ دست اے

اور کسی لکھوں انتظار کر دو آ رہا ہوں یہیں گا پلاؤں گا

تمہارا — حمد

ہنگولی ضلع پربھنی ——————— ۲۳ جولائی ۱۹۵۳ء

"ڈیر اریب" اتنے دن گزر گئے اور تمہارا ایک خط بھی نہیں آیا بات چونکہ توقع کے خلاف ہے اس لیے تشویش ہے میری یہاں بھی اسی طرح گزر رہی ہے جس طرح جدائی کے ابتدائی دنوں میں گزر رہی تھی صرف اتنا فرق ہے کہ وہاں کھانے پینے دونوں کا رونا تھا یہاں کھانے کی فکر نہیں ہے ابھی یہاں کسی سے کھلا نہیں اس لیے نہ نہیں سکتا کہ میرا اس کے سوا کون ہو سکتا ہے بقول شاعر کے

کس کی ہمت ہے کہ شوق کو امانے کی

مقام آب و ہوا کے لحاظ سے واقعی خوبصورت ہے مکان اور دوست دونوں ایک ہی ہیں۔ لیکن رہائشی حصہ سب بالائی ہے چھت پر دو کمرے ہیں نیچے بڑا سا صحن ہے جس میں باورچی خانہ اور حمام ہے۔ اور بس

یہ تمہید ابھی نہیں آیا تم ایک خط اور سہیل صاحب کو لکھ دو اس۔ ... کے لیے ... کوئی ... دے سکو گا دو غزلوں کے چار مکمل شعروں کا آخری موجود ہے یہ تمہاری مرضی

تمہارا — حامد

ہنگولی ——————— ۳ جولائی ۱۹۵۳ء

"ڈیر اریب" اپنا خط "بہر تمہاری مرضی" والی بات کا مجھے جو مفہوم نکالا ہے وہ میرے لیے کافی حسرتناک ہے تم سے زیادہ اس حقیقت سے اور کون واقف ہو سکتا ہے کہ میں اپنی دس بارہ سالہ ادبی زندگی پہلے سارا گداز رہنے کا قائل رہا ہوں شہرت اور نام آوری کے لیے کبھی بھی وہ ہتھکنڈے استعمال نہیں کیے جن کی دلچسپ تفصیلات ... دارے اپنے مضمون میں ظاہر کی ہیں میں کسی احساس کمتری کا بھی شکار نہیں رہا ہوں مجھے اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا بھی علم ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ آج کے بیشتر نام شہرت پر پہنچے ہوئے شاعروں کے مقابلے میں میرا اس اور شاعری کس قابل لحاظ اہمیت کی حامل ہے

تعجب ہے کہ تم نے یہ کیوں سوچا کہ میں نے تمہارے مذاق کو SERIOUS لیا ہے اگر تم واقعی سنجیدگی سے بھی کہتے کہ میرے کوئی اشعار معیاری نہیں ہیں اس لیے ناقابل اشاعت ہیں تو مجھے تمہارے ذوق پر بھروسہ کرنا ہی پڑتا اور اگر میں بھولتا نہیں ہوں تو تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے اپنی کئی نظمیں اور غزلیں بیاض سے اس وجہ سے خارج کر دی ہیں کہ وہ تمہیں پسند نہیں تھیں میری بیاض مہینوں تمہارے پاس رہی ہے اور تم نے اپنی مرضی سے اس میں رد و بدل کر کے نظموں اور غزلوں کی فہرست مرتب کی ہے

بہر حال یہ سب کچھ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ تمہارے خط کے لب و لہجے سے ایک رسمی نگارش کی بو آتی ہے کہ جیسے کوئی خاص بات

کہ ایک مشہور قسم کے شاعر یا ادیب سے خواہش کرے کہ محترم آئندہ شمارے میں آپ کی کسی بھی قسم کی کوئی چیز شامل ہونی ضروری ہے۔ کچھ تو روانہ کیجیے!

مجھے واقعی افسوس ہے کہ اب تک اس کے لیے کوئی مکمل غزل یا نظم روانہ کرنے کے موقف میں نہیں ہوں۔ تین نامکمل غزلوں کے چیدہ چیدہ سات شعر بھیج رہا ہوں ان کو چھاپ دو ۔۔۔ اور جہاں جہاں بھی لکھو ملنے والوں کو ملے اور وہاں پر تیلی ڈالو

آج موسم خوشگوار ہے لیکن بارش کا ڈر ہے ابھی وقت بھی کافی ہے ٹال رہا ہوں مگر کوئی سبیل دکھائی نہیں دیتی۔ جمع میں جو بات وقت ہی کی تو ٹل جاتی

تمہارا ساجد

ہنگولی ۔۔۔۔۔۔ ۹ اگست ۵۳ء

ڈیئر ادیب! انتخاب دیکھ لیا۔ اب کے اس کا حصہ نظم کافی متنوع اور مبسوط ہے خصوصاً شاذ تمکنت کی نظم۔ اس لڑکے میں مجھے شعور کی کمی کے باوجود شاعری کی کافی صلاحیتیں نظر آتی ہیں لمحہ ہے کہ اس قدر بر خود غلط نظریات رکھنے والا اتنی اچھی شاعری کرے!

صفی اورنگ آبادی کی غزل کے یہ شعر واقعی خوب ہیں خصوصاً جمہور کے مسئلے سے دو چار کا جھگڑا طے کرنے کی بات ظاہر کرتی ہے کہ آج کوئی شاعر بھی وقت کے رجحان کو نظر انداز نہیں کر سکتا

تمکنت سے کہو کہ تم غزلیں حاصل کیوں نہیں کرتے یہ شاعر تو تمہیں پسند بھی ہے نا!

تمہارا ساجد

ہنگولی ۔۔۔۔۔۔ ۱۱ ستمبر ۵۳ء

ڈیئر ادیب! اطلاعاً عرض ہے کہ تمہارا پچھلا خط مجھے کیوں نہیں ملا جس کے ساتھ تم نے اپنی تازہ غزل بھجوائی تھی اور جس پر سردار کے بارے میں بھی کچھ لکھا تھا

ستمبر کے پرچے کے بارے میں بالاستیعاب میں نے اپنی رائے نہیں لکھی تھی اس لیے کہ یہ اپنی پچھلی چند اشاعتوں کے مقابل میں معیار سے کچھ گرا ہوا سا ہے۔ اگر اس میں اقبال متین کا افسانہ اور یوسف ناظم کا مضمون ہوتا تو اس کو آسانی سے اوسط قسم کا پرچہ کہا جا سکتا تھا۔ تحسین سروری صاحب کسے محقق بن گئے ان کی اصابت رائے کا۔ غالباً پچھلے کسی پرچہ میں تمہاری ایک خوبصورت غزل چھپی تھی اس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ تمہارے انحطاط کی دلیل ہے اور اس کا شکار ایک تم ہی نہیں حیدرآباد کا ہر شاعر

بہرحال تبصرہ کا سرے کوئی معیار نہیں ہے اور یہ کوئی ضروری بھی نہیں کہ ہر شمارہ خاص ہی ہو

مستیں کی بات یہاں تین اس کی چند خاص رویوں پر بھی تو کچھ لکھا جا سکتا ہے مثلاً ہیولی رنگی، قمیص رنگی، وغیرہ وغیرہ اس کے علاوہ اور کتنی ہی باتیں ہیں اگر مجھے بہتر لکھنا آتی تو چند اشاعتیں کے بارے میں میرا مضمون تمہارا ادبی مرکز رکھنے کے لیے کافی ہوتا۔

ہاں، "فنکار" کا ذری بی حضرت الیاس ہے یہ پرچہ واقعی خوب ہے مگر یہ بیان تک کیوں کہا کہ آج ہندوستان کے اردو پرچوں میں منتہا ہے۔ ایک ہلکی پھلکی غزل جا رہی ہے کچھ تو صحیح دو!

تم لوگوں کو نومبر میں ہنگولی لانے کا ارادہ ہے دیکھنا یہ ہے کہ اس وقت تک میں یہاں رہ بھی سکوں گا؟

سردار کیا کرتا ہے؟

دوستو اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام

تمہارا ساجد

ادیب پیارے! تمہارے خط کے ساتھ تین غزلیں بھی ملیں اور میں نے ان کو بڑی مسرت اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا چونکہ تم نے ان کے بارے میں میری رائے بھی پوچھی ہے اس لیے ان کو بار بار غور کر کے پڑھا (خصوصاً رات میں جب کہ [illegible] تھی) ترتیب کے لحاظ سے پہلی غزل [illegible] ہے ان ساتھیوں کی اس رائے سے میں بالکل متفق نہیں ہوں کہ ادھار والا شعر غزل کی سنجیدہ فضا کو متاثر کرتا ہے اس کا مطلع بس اس حد تک سنجیدگی لیے ہوئے ہے اور [illegible] یہ کون سی بات ہے کہ الفاظ میں اتنی گھمبیرتا والا پن اور بے ساختگی ہے کہ دوسرے مصرعہ میں لفظ ادھار کی غیر سنجیدگی ذرا بھی نہیں کھٹکتی اور میں تو یہ کہتا ہوں ادھار کا لفظ غیر سنجیدہ ہے ہی نہیں اور [illegible] کے ثبوت میں غالب کا ایک شعر یاد دلاتا ہوں

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ ادھار کھانے اور [illegible] سمجھیں لیکن [illegible]
[illegible]

انھیں کیا معلوم کہ حیاتِ زندگی [illegible] ادھار [illegible]
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

مجھے تعجب ہے کہ تمہارے اس شعر کو [illegible] بحث [illegible] غزل کا آخری شعر [illegible]
[illegible] یہ کہ میری رائے میں [illegible] لحاظ سے [illegible] غزل میں [illegible]

الٰہی یہ کلی کی ہوجیسے [illegible] ہیں
ہوائی ہاتھ [illegible] یار کہ [illegible]!

پہلے مصرعہ کو تم کر پڑھو تمہیں محسوس ہوگا اس میں "ی" کی صوتی تکرار (الٰہی یہ کلی کی ہو) کانوں کو کس قدر گراں گزرتی ہے اور دوسرا مصرعہ [illegible] کی بعض ایسی غزلوں کی طرف منتقل ہوتا ہے جن میں [illegible] شہر یار وغیرہ کے الفاظ اپنی مثال مدت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں اور جن میں آمد کی شان بھی پائی جاتی ہے [illegible] اس لحاظ سے بھی اچھا نہیں ہے پھر اس غزل میں تم نے مٹی کو مل، ٹھنڈی، نرم اور گھمبیرتا کی فضا کو برقرار رکھا ہے وہ اس شعر کے الفاظ "الٰہی" "ہوائی ہاتھ" [illegible] سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں

تمہاری دوسری غزل [illegible] ہوئے تو تم نے پڑھی تھی اور اس وقت مجھے خیال ہوا تھا کہ تمہیں مطلع کروں کہ بعض ایسے نوجوان جیالے غزل گو شعرا کی بس کا سہارا [illegible] سوار ہو گیا جن کی غزل کے ہر شعر [illegible] قافیہ اور ردیف کی نظر ہو جاتا ہے [illegible] تک پہنچنے کے لیے نرم الفاظ سے کام لیتے ہیں جیسے غزل لکھتے وقت میر کی روح شعرا کے دماغ میں گھس گئی ہو۔ تمہاری اس غزل پر بھی (اگر کوئی غور سے دیکھے) ایسا ہی دھوکا ہوتا ہے لیکن تم شاعر ہو اس لیے قافیے ایسے [illegible] ردیف سے چپک کر رہ گئے ہیں اس لیے [illegible] ردیف کی طوالت کھٹکتی نہیں، غزل [illegible]

تیسری غزل تینوں میں [illegible] سیدھی سادی [illegible] الفاظ کے ساتھ نرم [illegible]
اگر شاعر کے [illegible] پیش کرنا مقصود ہو تو یہ غزل [illegible] حیثیت رکھتی ہے [illegible] کی طرف تمہیں متوجہ کرتا ہوں
اس غزل کے دوسرے شعر کے آخری مصرعہ میں [illegible] معلوم ہوتا ہے اس کے مصرعے [illegible] تھا لیکن تم کیا کرتے ردیف [illegible] تھا۔

چوتھے شعر کو اگر نثر میں پھیلا دیا جائے تو یہ ایک مفہوم بھی نکل آتا ہے جو غلط ہے کہ تمہارا نہیں ہوگا۔ (چونکہ میخانہ میں بہت
سے جام ہیں) اس لیے ہماری قسمت میں تشنہ لبی تو نہیں۔ —
دوسرا خیال بہت خوب ہے۔ آزادی کے دام بہت ہیں۔ اس میں لفظ آزادی بہت VAGUE ہو گیا ہے اور خواہ مخواہ
دل میں اس شبہ کو جگہ دیتا ہے کہ کیا ہر آزادی کے بھی دام ہیں؟

آخری شعر کو تحسین نہیں رہا۔ پہلے لکھا جا چکا ہے ہم دونوں اس واقعہ سے ہوں کہ اکثر اسکا یہ موڈ میں ہم ملتی کرتے رہے ہو
کیا حرم نہیں ہے — خیر اس شعر کے پہلے مصرع میں دو لفظوں کی تقدیم و تاخیر مل دو میرے خیال میں پورا شعر برجستہ ہو جائے گا
مانا کہ لیے حرم نہیں ہے لیکن ہم مدام مست ہیں

تمہارا کیا خیال ہے؟ —

حکا رہی آتا ہے ... یہ تمہاری ادبی ریاست زیادہ بہتر ہے ... آزادی کے شعراء کی چار کلاسیکی شاعروں کی غزلیں ہیں
تمہاری غزل بھی ہے

میرا اور سب کو سلام کہنا   تمہارا ساجد

ہیگلی ———————— ۲۲ جنوری ۱۹۵۴ء رات کے ۱۲ بجے

ادیب ایک بار پھر عرض ہے ... تمہاری نظم شکست اور شکست مکمل ہوتی ہے ... کے سالنامہ
کے لیے اگر پسند آئے تو رکھ لو ورنہ غزل واپس کر دو۔ اگر میں کسی اور پرچہ کے لیے بھیج دوں
گلاس میں اس وقت بہت گرما گرمی ہے اور ہم لوگ سب اس خط سے زیادہ تر پریشان ہوا ہے اس لیے خدا حافظ۔

تمہارا ساجد

اور دیکھو اس لفافہ کو تو ٹکٹ سے بھی سستا ہے سو تم کرتا ہوں

ہیگلی ———————— ۲۹ جنوری ۱۹۵۴ء

ادیب امید ہے کہ ایک خط کا جواب تم پر ادھار ہے جس کے ساتھ میں نے اپنی ایک نظم بھیجی تھی تم تفصیلی طور پر
اپنی اور احباب کی رائے اس کے بارے میں لکھو تم میں نے ایک عشق پر مبنی نظم لکھی ہے یہ نہیں کیسی ہے ایمانداری طور پر اس بات
سے مطلع کرو کہ اس کا طرز یہ سلوک کرتا ہے یا نہیں عنوان کیسا ہے وغیرہ

تم نے اپنی صحت، علاج اور پرہیز کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ واقعی حیران کن ہے اور اگر تم حقیقتاً پرہیز میں اتنی
سخت گیری سے کام لے رہے ہو اور یہ بات تمہارے اکثر ... سے مجھے سردار سے معلوم ہوا ہے کہ تم نے توبہ کر لی ہے تو میں نے سوچا کہ اس
رات والی بے پناہ ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے تم نے حلفاً اس کا ارادہ کر لیا ہوگا۔ اور اسی لیے میں نے اپنے پچھلے خط میں لکھا تھا
کہ ادیب صاحب!   این خیال است و محال است و جنوں

لیکن آج معلوم ہوا کہ بات سب دور چلی گئی ہے اور یہ کہ واقعی عشق کا مقام ہے۔ وقتاً فوقتاً اپنی
صحت کے بارے میں لکھتے رہو

تمہارا ساجد

منگولی ——— ۲۴ مارچ ۵۵ء

ڈیئر ادیب تمہارا خط ملا مجھے شکایت ہے کہ میرا وہ خط جارحانہ تھا اور مجھے یہ گلہ ہے کہ اب تمہارے کسی خط میں بھی وہ وہ کھلاپن نہیں پاتا جو حال حال تک محسوس ہوتا تھا آج کل تمہارے خط میں ایک آدھ جملہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر ذرا سی دماغ پر بار ڈال کر سوچوں تو اس کا مفہوم ہی نہیں نکلتا ہم ایسے دوست تو نہیں کہ ہمارے تعلقات مستر پیشہ کی وجہ سے مستحکم ہوئے ہیں جیسے میں کیفی اعظمی سے مراسلت شروع کر دوں یا نہیں فکر تونسوی سے ۔۔۔ ہماری دوستی کی بنیادیں اور بھی ہیں جن کا استحکام اس بات کا متقاضی ہے کہ بے تکلفی ایہام گریز اور راحت وغیرہ کو ختم ہو جانا چاہیے مثلاً کوئی تمہارے اس قسم کے جملوں کا کیا مفہوم نکالے کہ ——— میں نے بھی ایک غزل شروع کی تھی جو ابھی نامکمل ہے اور جس کو مکمل کرتے ہوئے ڈر رہا ہوں ——— کاش میرا کوئی خدا ہوتا اور وہ میری سنتا ۔ میں کئی اور چیزوں سے ڈرا جاتا ہوں وغیرہ اگر میں ان کا جواب لکھتے ہوئے یہ کہہ دوں کہ تم نے جو غزل شروع کی تھی اگر وہ نامکمل رہ گئی تو کیا حرج ہے کچھ برا نہ ہوا اگر کوئی خدا تمہاری نہیں سنتا تو ۔۔۔ اگر ہے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تم کو ڈرنا نہیں چاہیے اس لیے کہ زندگی اس قدر بھی گئی گزری نہیں ہے ——— تو معلوم نہیں کہ تم کیا کیا سوچنے لگو!!

پیارے بھائی زندگی میں کیا کچھ نہیں ہو جاتا لیکن ہونے کی خواہش کیوں کی جائے اپنے گریبان سے اپنے ہاتھ کو الجھانا باشعور انسانوں کا کام نہیں ہے مجھے علم ہے کہ تم بات بات پر ایک غزل یا کسی معمول نظم کو محض جذبات کی تسکین کے لئے بر ہیر توڑ دیا ہے لیکن یہ تو سوچو اس طرح موت کو زندگی سے کبھی کوئی بات بن سکی ہے؟ زندگی ہر قدم پر آزار ہے جذبات کے جال سے نکلو اور غور کرو ‏CORRECT‏ کرنے کی کوشش کرو ہو سکتا ہے کہ زندگی کا یہ موڑ تم کو ایک قابل رشک انسان بنا دے یہ میں وعظ نہیں کر رہا ہوں میرا مشورہ ہے کہ تم زندہ رہو اور صحت مند طریقے سے زندہ رہو بس تمہاری صحت کا متمنی

تمہارا ساجد

منگولی ——— ۱۴ جون ۵۵ء

ادیب کئی دنوں سے تمہارا خط نہیں آیا کیا بات ہے؟ کالج بھی بند ہو گیا اور تم کو بھی کافی دیر ہو گئی ہے کیا ابھی وہ پریشانی ہی میں ہے

سرتاج کیسا ہے مسز کی طبیعت کیسی ہے اور خود تمہاری صحت اور بہیر کا کیا عالم ہے

مولائی حضرت اقبال سہیل صاحب قبلہ کے ‏PLEASURE‏ کا کیا عالم ہے ——— تمہیں کئی باتوں سے مجھے مطلع کرنا ہے!!

میرا وہی عالم ہے جو تھا ملازمت تو ایک اور ملی کا اضافہ ہو گیا ہے گھر گھر ہو گئی کئی مہینے سے بھی محروم ہو گیا ہوں زندہ تو ہوں ہی لیکن افسوس کیا معلوم کہ زندگی کے لیے کوئی دوسرا بہانہ باقی نہیں رہی ——— بظاہر یہ صورت حال ختم ہوتی نظر نہیں آتی

مردے از غیب برون آید و کارے بکند

کا قائل نہیں ہوں اور " تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش "

کی ہمت مدت ہوئی شل ہو گئی خط لکھ کر پرسہ دو

تمہارا ساجد

منگولی ——— ۲۰ جولائی ۵۵ء

ادیب اکیا بہت زیادہ مصروف ہو کہ ایک زمانے سے خط نہیں لکھا سہیل کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ تمہاری اور سرتاج کی بے نوشی اور زیادہ بڑھ گئی ہے ہیا ہسر دار کے بارے میں تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے اور قابل اعتراض بھی نہیں ہے کہ اس کو اس ابتدا

پر پہنچا ہے جہاں سے مجھ پر خود اُداسی کی عادت ڈالی گئی ہے لیکن تمہارا اس کا ساتھ دینا مجھ میں نہیں آتا ابھی ابھی تو شاید تمہارا
علاج اور پرہیز ختم ہوئے معدہ اور اعصاب کے آرام کی مدت تو ختم نہیں ہوئی
ناخوش ملتوی کب تک کیا جا سکتا ہے۔ کہاں ٹھہرا ہے کتنی مدت کے لیے آنا ہے بہت ہی تفصیل سے اس کے بارے میں لکھو اور اس لیے
کیونکہ مجھے خط لکھے

میری تکلیف ابھی دور نہیں ہوئی گردہ کا درد ایک آدھ دن کم رہتا ہے اور پھر بڑھ جاتا ہے مقامی علاج سے فائدہ نہیں
ہو رہا ہے طویل رخصت لے کر علیگڑھ آنے اور باضابطہ علاج کرانے کی استطاعت ہے نہیں
شراب چھوٹ رہی ہے ۔ مجھے ایک ساتھ ساتھ ہو گیا ہے میں اور سردار کو پیار

تمہارا ساجد

مہگولی ———— ۲۰ اگست ۵۴ء

اریب! اتنے طویل وقفے کے بعد تمہارا خط پا کر جتنی مسرت ہوئی ہے اتنی مسرت اپنی بیوی کو حیدرآباد روانہ کر کے
نہیں ہوئی مجھے جیسے تمہارے خطوں کی عادت ہو گئی ہے تمہارا خط نہیں آتا تو خلاف توقع پر سے آتا ہے تو میری الجھنوں اور بیزاریوں
میں اضافہ ہو جاتا ہے اور میں خود کو بہت ہی قابلِ رحم محسوس کرنے لگتا ہوں

کالج میگزین بھی مل گیا سروری صاحب کا مضمون اور احتشام صاحب کی تقریر کے اقتباسات بہت ہی اچھے ہیں
شاعروں کی نظمیں اور غزلیں بھی ٹھیک ہی ہیں صرف ایک کو چھوڑ کر۔ اور کیا لکھوں حیرت سے ہوں

تمہارا ساجد

مہگولی ———— ۱ جنوری ۵۵ء

اریب! خط ملا میں تمہارے ہاں نہیں گیا میں کا خط آیا تھا اصرار کے ساتھ بلایا تھا کہ سب چھوڑ کے اور جسم کے آبلے
کیسے آنے جانے کی مہلت کر سکتے ہیں ابھی تک وہی حالت ہے علاج جاری ہے افاقہ نہیں ہوا
میں سب علیگڑھ آ رہا ہوں چند دنوں کے لیے نہیں بلکہ سال کے لیے مفصل تمہارا تفصیلی خط آنے کے بعد لکھوں گا جس کا
وعدہ تم ہر خط میں کرتے ہو

سردار کہاں ہے ؟ تم نے اس کے بارے میں بھولے سے بھی ایک لفظ نہیں لکھا حالانکہ وہ بھلانے والی شئے
سے بھولنے کی شے نہیں

مئی تک یہاں سے علیگڑھ واپس ہوا یا نہیں؟ فوراً خط لکھو اور اپنی خیریت سے مطلع کرو

تمہارا ساجد

مہگولی ———— ۱۹ جنوری ۵۵ء

اریب! تمہارا رنگین خط ملا ۔ سیاست میں تم دونوں کی پارٹی سے اخراج کی خبر پڑھ کر تعجب تو نہیں، افسوس ہوا
کہ آخر ہم لوگ کس سطح پر پہنچ کر مر جانے والے ———— شراب کی برائیاں مجھے آج بھی تسلیم نہیں ہیں لیکن سوچتا ہوں کہ اس کی
اچھائیوں کو کم از کم ہم باشعور آدمی کونسی منزل میں لوا رہیں گے ہم جو اپنے ادب و شاعری میں تو بڑے ترقی پسند نظر آتے ہیں
حقیقی زندگی میں رجعت پسندوں سے کوسوں پیچھے ہیں ڈوبتے چڑھتے ہیں وہ بے ہودے کم سے کم شراب کو حرام تو کہتے ہیں۔ اور اپنا پاک
اس کی برائیوں کا پرچار تو کرتے ہیں ہم شراب کو کسی حد تک جائز کہتے ہوئے اس کی اچھائیوں کا جو نمونہ پیش کرتے ان کے سامنے نہیں

سکتے — آخر ہم مرنا نہیں چاہتے تو کیا چاہتے ہیں تم ہی سوچو کیا ہم دونوں کو یہی کرنا چاہئے تھا سرمایہ داری اور سامراج [illegible] تھیں تھی اور ہم دونوں [illegible] سکتی تھی۔ [illegible] اور کسی حال کا ہی کے بعد [illegible] سے عام طریقہ سے چھپ لیا گیا۔

[illegible]

طبقاتی گروہوں کو [illegible] کھیلنے کا موقع [illegible] اور اس کی ساتھ [illegible]

[illegible] کا سلسلہ [illegible] جاری رکھے جانے کا مصلحتاً نہیں کہ ہم کسی بھی [illegible] کی عادت میں ڈال سکتے

اسی طرح مجھے بھی دیکھو [illegible] سرمایہ دارانہ [illegible] استعمال والے [illegible] ہوں گا
میں چند دن پابندی بھی [illegible] سال آئے [illegible] اور آج تم میرا
دیکھو گے [illegible] کوئی دوا [illegible] کسی کا [illegible] خوشی سے [illegible]
کی مدد سے [illegible] آ [illegible] ہوگا ہے [illegible] ہوں [illegible] سکتا ہوں [illegible] کا
یقین دلانے جارہا ہوں اس [illegible] کا جواب [illegible] لیکن اس کے باوجود [illegible]
تم لوگوں کا [illegible] اپنی [illegible] اور [illegible]

مجھے خوشی ہے کہ [illegible] ہے کہ تم نے غلطی [illegible] سال لوگوں کا
شریفانہ [illegible] سب زیادہ [illegible] ہوں سے سال سے [illegible] CORRECT کرنا ہے
[illegible] ہے [illegible] نہیں ہوا ہے —

میرا علاج یہاں [illegible] ہوگیا ہے [illegible] چاہتا ہوں لیکن [illegible] —
[illegible] "

صفحہ [illegible] کہ [illegible] ہے اور [illegible] کا [illegible] لیکن [illegible]
ہوگا کون [illegible] پر ہوا ہے
[illegible]
اب علاج بھی کروالوں گا۔ [illegible]
چاہتا ہوں امید کہ تم خیریت سے ہو گے [illegible]

تمہارا [illegible]

FIRE. ACCIDENT. MARINE.

THE HYDERABAD UNITED INSURANCE Co., Ltd.,

[illegible]